حدیث
کے
اصلاحی مضامین

جلد ہفتم

افادات

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل

ناشر

ادارۃ الصدیق ڈابھیل، گجرات

تفصیلات

کتاب کا نام:.......................... حدیث کے اصلاحی مضامین (جلد ہفتم)

افادات:.......................... حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

بہ اہتمام:.......................... خدّام حضرت اقدس دامت برکاتہم

صفحات:.. ۴۶۴

طباعت:.......................... رجب المرجب ۱۴۳۳ھ جون ۲۰۱۲ء

ناشر:.......................... ادارۃ الصدیق ڈابھیل، گجرات

99133,19190

ملنے کے پتے

- شعبۂ فیض محمود، سورت 99988,31838
- مکتبۂ انور (مفتی عبد القیوم صاحب راجکوٹی) جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل
- حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب مدظلہ (دار العلوم رحیمیہ بانڈی پورہ کشمیر)
- مدینہ ایجنسی جھانپا بازار سورت
- قاضی، نزد مرکز مسجد رانی تالاب سورت
- اسلامی کتب خانہ چوک بازار سورت
- رلابیل شوپ رانی تالاب سورت

مفتی سلیمان شاہوی (دار العلوم فلاح دارین ترکیسر)

اجمالی فہرست مضامین ...... جلد ہفتم

تفصیلی فہرست مضامین ...... جلد ہفتم

بَابُ الْخَوْفِ

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا بیان

بَابُ الرَّجَآءِ {۱}

اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کا بیان

بَابُ الرَّجَآءِ {۲}

اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کا بیان

بَابُ الرَّجَآءِ {۳}

اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کا بیان

بَابُ الرَّجَآءِ {۴}

اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کا بیان

بَابُ الرَّجَآءِ {۵}

اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کا بیان

بَابُ الرَّجَآءِ {۶}

اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کا بیان

فَضْلُ الرَّجَآءِ

اللہ تعالیٰ سے امید رکھنے کی فضیلت

اَلْجَمْعُ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَآءِ

خوف اور امید کو جمع کرنا

فضل البكاء من خشية الله تعالىٰ وشوقاً اليه

اللہ تعالیٰ کی خشیت اور اس کی محبت میں رونے کی فضیلت

فَضْلُ الزُّهْدِ فِي الدُّنْيَا وَالْحَثُّ عَلَى التَّقَلُّلِ مِنْهَا وَفَضْلُ الْفَقْرِ {۱}

دنیا کے معاملہ میں زہد اختیار کرنے کی فضیلت

اور ساز وسامان میں کمی رکھنے کی ترغیب اور فقر کی فضیلت

فَضْلُ الزُّهْدِ فِي الدُّنْيَا وَالْحَثُّ عَلَى التَّقَلُّلِ مِنْهَا وَفَضْلُ الْفَقْرِ {۲}

دنیا کے معاملہ میں زہد اختیار کرنے کی فضیلت

اور ساز وسامان میں کمی رکھنے کی ترغیب اور فقر کی فضیلت

فَضْلُ الزُّهْدِ فِي الدُّنْيَا وَالْحَثُّ عَلَى التَّقَلُّلِ مِنْهَا وَفَضْلُ الْفَقْرِ {۳}

دنیا کے معاملہ میں زہد اختیار کرنے کی فضیلت

اور ساز وسامان میں کمی رکھنے کی ترغیب اور فقر کی فضیلت

فَضْلُ الزُّهْدِ فِي الدُّنْيَا وَالْحَثُّ عَلَى التَّقَلُّلِ مِنْهَا وَفَضْلُ الْفَقْرِ {۴}

دنیا کے معاملہ میں زہد اختیار کرنے کی فضیلت

اور ساز و سامان میں کمی رکھنے کی ترغیب اور فقر کی فضیلت

فَضْلُ الزُّهْدِ فِي الدُّنْيَا وَالْحَثُّ عَلَى التَّقَلُّلِ مِنْهَا وَفَضْلُ الْفَقْرِ {۵}

دنیا کے معاملہ میں زہد اختیار کرنے کی فضیلت

اور سازوسامان میں کمی رکھنے کی ترغیب اور فقر کی فضیلت

فَضْلُ الْجُوْعِ وَخُشُوْنَةِ الْعَيْشِ {۱}

بھوک وفاقہ برداشت کرنے اور سادہ زندگی بسر کرنے کی فضیلت

فَضْلُ الْجُوْعِ وَخُشُوْنَةِ الْعَيْشِ {۲}

بھوک وفاقہ برداشت کرنے اور سادہ زندگی بسر کرنے کی فضیلت

فَضْلُ الْجُوْعِ وَخُشُوْنَةِ الْعَيْشِ {۳}

بھوک وفاقہ برداشت کرنے اور سادہ زندگی بسر کرنے کی فضیلت

فَضْلُ الْجُوْعِ وَخُشُوْنَةِ الْعَيْشِ {۴}

بھوک وفاقہ برداشت کرنے اور سادہ زندگی بسر کرنے کی فضیلت

باسمہ تعالیٰ

اداریہ

حضرت نبیٔ کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ نے مجھے جو علم وہدایت لے کر بھیجا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ موسلا دھار بارش کسی جگہ ہوئی، زمین کا ایک بہترین حصہ تھا جس نے اس پانی کو قبول کر کے بہت کچھ گھاس وسبزہ اُگایا۔ بعض زمینیں سخت تھیں، انہوں نے پانی جمع کرلیا پھر ان سے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو نفع پہنچایا، انہوں نے خود پانی پیا، جانوروں کو پلایا، کھیتوں کی سینچائی کی۔ یہی بارش بعض ایسی زمینوں پر برسا جو سپاٹ تھیں، نہ پانی جمع کیا، نہ گھاس پودے اُگائے۔ یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے علم دین حاصل کیا اس سے اللہ تعالیٰ نے اسے نفع بخشا خود علم سیکھا، دوسروں سکھایا، اور اس شخص کی جس نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور اللہ تعالیٰ کی جو ہدایت لے کر مَیں بھیجا گیا ہوں اس کو اس نے قبول نہ کی۔

محترم قارئین! یہ وہ دور ہے جس میں دھن دولت کے ساتھ ساتھ علوم کی بھی ریل پیل ہے، نہ معلوم صبح سے شام تک کتنی کتنی اور کیسی کیسی تحقیقات جنم لیتی ہیں، ان علوم کے حاصل کرنے کے لیے لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں، ان علوم کے حاملین کروڑوں روپے کماتے ہیں، ان علوم کو پڑھنے اور پڑھانے کے مراکز دنیا بھر میں موجود ہیں، طلبہ اور اسکالرز کی بھی کوئی کمی نہیں، نہ جانے لوگ کیسی کیسی ڈگریوں کے سپنے سجاتے ہیں، محنتیں کرتے ہیں، قربانیاں بھی دیتے ہیں؛ تب کہیں جا کر وہ ڈگریاں حاصل کر پاتے ہیں۔ پھر ان حضرات کو اعزازت، تمغوں اور ایوارڈز سے بھی نوازا جاتا ہے، دوسرے لوگ بڑی حسرت ورشک سے دیکھتے اور کفِ افسوس مل کر رہ جاتے ہیں۔ ان علوم نے دنیا کو کچھ بھی دیا ہو، مال ودولت، کوٹھی وبنگلے، عیش وعشرت، عزت وثروت لیکن یہ علوم

انسانیت کو جو چیز دینے سے عاجز ہیں، وہ ہے **"روحانیت"**۔ یہ علوم ان کے حاملین اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے والے - جبکہ علومِ الٰہیہ کو نظر انداز کرتے ہوں - روحانیت اور نورانیت سے عاری ہیں۔ بقول شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ:-

علمے کہ رہ بحق نہ نماید جہالت است

شاید یہ قدیم سے فطرتِ انسانی رہی ہے کہ جو چیز سہولت سے مل جاتی ہے اس کی قدر اسے نہیں ہوتی؛ چاہے وہ کتنی ہی قیمتی اور ضروری ہو۔ اور جو چیز بمشکل ہاتھ آتی ہے اس کو وہ بہت اہم مانتا ہے؛ چاہے وہ کتنی ہی مہمل و بے کار کیوں نہ ہو، لیکن خدا تعالیٰ تو بے نیاز ذات ہے، اس کی سنت ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ ضروری اور اہم چیز کو عام رکھتا ہے جو ہر کسی کو بسہولت میسر ہو جائے، چاہے وہ اس کی کتنی ہی نا قدری کرے۔ اور غیر ضروری و مہمل اشیاء کی وہ فراوانی اور بہتات نہیں کرتا، چاہے کوئی اس کے لیے کتنا ہی مرے۔

یہی معاملہ علوم کے معاملہ میں بھی رہا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ علومِ دنیویہ کو انسانی باطن سے کوئی سروکار نہیں، یہ علوم تعمیر باطن تو کیا کرتے تخریبِ باطن ضرور کر رہے ہیں۔ اور جن علوم وفنون کا محور عقلِ انسانی ہو، وہ کیا کچھ جنون کا مظاہرہ کریں گے! لیکن ذوق مطالعہ رکھنے والوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے ایسی ہی بے روح، کھوکھلی کتابوں کا سہارا لیتے ہیں۔ بقول ہمارے حضرت دام مجدہم: یومیہ اخبار کو بار بار پڑھیں گے اور سنبھال کر رکھیں گے، میگزین وغیرہ خرید کر پڑھیں گے، ناول، ڈرامے، لطائف پڑھیں گے، اس کے لیے پیسے بھی خرچ کریں گے، لیکن اگر کوئی بندۂ خدا مسجد کے دروازہ پر للہ فی اللہ کوئی دینی کتاب یا پمفلٹ مفت میں تقسیم کرے گا تو بادلِ ناخواستہ قبول تو کر لیں گے، لیکن گھر آ کر جو ایک کونہ میں رکھیں گے تو کبھی اس کی صورت دیکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی...... کسی کا کیا نقصان ہے، اپنا ہی کھو رہے ہیں۔

قرآنِ پاک اوراس کی تفسیر، حدیثِ مبارکہ اوراس کی تشریح؛ یہی ہیں وہ حقیقی علوم جوروحِ انسانی کوتروتازہ رکھتے ہیں۔ بھلاعلوم اِنسانیہ علومِ الٰہیہ کی برابری کب کرسکتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اصلی ضرورت اورغذا یہی علومِ الٰہیہ ہیں، اوران کے تنوع وتفنن کے بارے میں کیا کہا جائے کہ جس موضوع پر چاہیے بے نظیر مواد موجود ہے۔

''ریاض الصالحین'' ساتویں صدی ہجری میں لکھی گئی حدیثِ مبارکہ کی کتاب ہے جس کے عمومی درس کو کتابی شکل میں یہ ادارہ کئی سالوں سے جلد درجلد **''حدیث کے اصلاحی مضامین''** کے نام سے آپ حضرات کی خدمت میں نذرکرنے کی سعادت حاصل کررہا ہے، اب تک ہم نے یکے بعد دیگرے مختلف مضامین پڑھے جن میں سے ہرایک اپنے اندربیش بہا نصائح وحکم لیے ہوئے تھے، اورجلد درکفِ قارئین کے مضامین کی بھی اپنی ہی اہمیت ہے، جس کا صحیح اندازہ تواس کے مطالعہ کے بعد ہی ہوسکتا ہے، تاہم معمول پورا کرنے کے لیے آیئے ہم اس جلد کے مضامین پرایک نظرڈالیں، مجموعی طور پر ہم اس کو **''خوف ورجاءاورزہدوقناعت''** سے معنون کرسکتے ہیں۔

۱:	بَابُ الْخَوْفِ	یعنی	اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا بیان
۲:	بَابُ الرَّجَآءِ	یعنی	اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کا بیان
۳:	بَابُ فَضْلِ الرَّجَآءِ	یعنی	اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کی فضیلت
۴:	بَابُ الْجَمْعِ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَآءِ	یعنی	خوف اورامید کو جمع کرنا
۵:	بَابُ فَضْلِ الْبُكَآءِ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ	یعنی	اللہ تعالیٰ کی خشیت اوراس کی محبت میں رونے کی فضیلت
۶:	بَابُ فَضْلِ الزُّهْدِ	یعنی	دنیا سے بے رغبتی کی فضیلت
۷:	بَابُ فَضْلِ الْجُوْعِ وَخُشُوْنَةِ الْعَيْشِ	یعنی	بھوک وفاقہ برداشت کرنااورسادہ زندگی بسر کرنا

(۱) **اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا بیان:**- اس بیان میں امام نوویؒ نے دس (۱۰) آیات اور پندرہ (۱۵) روایات پیش فرمائی ہیں۔ تشریح آیات وروایات کے ضمن میں لاتعداد افادات سے محظوظ ہوجیے، جنھیں بزرگوں کے ملفوظات اور اکابر کے حالات و واقعات نے چار چاند لگادیئے ہیں۔ ضمنی افادات میں وقت کی قدر وقیمت کے تعلق سے بیش قیمت مضمون آپ سے اپنا قیمتی وقت اور خصوصی توجہ مانگتا ہے۔

(۲) **اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کا بیان:**- اس بیان میں آیات چار (۴) جب کہ روایات اٹھائیس (۲۸) ہیں، اس عنوان میں تفسیر آیات سے قبل ہی حضرت اقدس ادام اللہ ظلہٗ نے مختلف ذیلی عنوانات پر مشتمل ایک مفصل تمہید بیان فرمائی ہے جس کا مطالعہ ان شاء اللہ روح افزا ثابت ہوگا، الحمد للہ عنوان کے ہر گوشہ پر سیر حاصل بحث ہوئی ہے، احادیثِ مبارکہ کی علمی مباحث کو بھی بحسن وخوبی ''Cover'' کیا گیا ہے، راہِ سلوک کے مسافرین کی عام اُلجھنوں اور ان کے جواباتِ شافیہ سے بھی پہلوتہی نہیں کی گئی ہے۔

(۳) **اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کی فضیلت:**- اس باب میں ایک (۱) آیت اور تین (۳) روایات ہیں۔

(۴) **خوف اور امید کو جمع کرنا:**- اس باب میں سات (۷) آیات اور تین (۳) روایات ہیں۔

(۵) **اللہ تعالیٰ کی خشیت اور اس کی محبت میں رونے کی فضیلت:**- دو (۲) آیات اور دس (۱۰) روایات مع ترجمہ تشریح اور افادات پر مشتمل ہے۔

(۶) **دنیا سے بے رغبتی کی فضیلت:**- زہد وفقر کے فضائل میں امام نوویؒ نے آٹھ (۸) آیات اور بتّیس (۳۲) روایات جمع فرمائی ہیں۔ یہ بہت غور اور یکسوئی سے پڑھنے کا عنوان ہے۔ امام نوویؒ نے بھی اس کا خاص اہتمام فرمایا ہے جیسا کہ آپ دیکھ

رہے ہیں کہ آٹھ (۸) آیتیں اور بتّیس (۳۲) روایات منتخب فرمائی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اس مضمون پر قرآن وحدیث میں مواد بھی خوب ہے جواس کی اہمیت وضرورت کی جانب مشیر ہے۔واقعہ یہ ہے کہ ''حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ'' ہر گناہ کی جڑ دنیا کی محبت ہے، یہ نکل جائے تو بیڑا پار ہے، لیکن یہ اتنی آسانی سے نکلتی بھی نہیں۔اس عنوان کے تحت عجیب وغریب افادات ہیں جو پڑھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔جب ہم خالی الذہن ہوکر اس مضمون کا مطالعہ کریں گے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ آج دشمنانِ انسانیت لوگوں کو اُلٹا ہی سبق پڑھا رہے ہیں۔جس چیز کو بے حقیقت بتایا گیا ہے اسی کے فضائل بتائے جارہے ہیں۔ایسا ماحول بنادیا گیا ہے کہ لوگ دنیا کو ضرورت سے زیادہ ہی اہمیت دینے لگے ہیں، لیکن ایک مؤمن کے لیے تو اللہ ورسول سے بڑھ کر کسی کی بات ہو ہی نہیں سکتی۔اور خالق سے بہتر سبق کون پڑھا سکتا ہے؟ ''أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ''۔

(۷) **بھوک وفاقہ برداشت کرنا اور سادہ زندگی بسر کرنا:-** یہ باب کل چار (۴) آیات اور اکتّیس (۳۱) احادیث کا انتخاب ہے۔پڑھتے ہیں تو دل پر اثر ہوتا ہے، اپنی حالت پر نظر ثانی کرنے کی فکر پیدا ہوتی ہے۔

اس طرح سترہ (۱۷) مجالس کا یہ گلدستہ چھتّیس (۳۶) آیات اور ایک سو بائیس (۱۲۲) روایات کی تشریح وتفسیر کا خوبصورت مرقعہ ہے۔اللہ پاک ہم سب کو پڑھ کر ان صفات کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔حضرت اقدس دام مجدہم کو جزائے خیر دے، آپ کا سایۂ عاطفت بصحت وعافیت اور بسلامتیٔ اعضاء وقویٰ تادیر قائم ودائم رکھے، اور ہمیں حقیقی استفادہ واضافہ کی توفیق بخشے۔ {آمین}

کتاب کی تیاری میں اہم اور مشکل ترین مرحلہ مضمون کو سی ڈی (CD) سے کاغذ پر منتقل کرنے کا ہوا کرتا ہے، ہمارے بہت سے محسنین ہیں جنہوں نے آج تک

بڑے ذوق وشوق سے یہ خدمت انجام دی ہے، اوران کی اسی محنت نے اصلاحی مضامین کی مختلف جلدوں کا روپ دھارا۔خصوصاً اس جلد ہفتم کے مواد کی فراہمی مسیں مرکزی کردار مولانا مفتی محمد رفیق صاحب کوکنی زید لطفہٗ (استاذِ حدیث وصدر مفتی جامعہ حسینیہ، شری وردھن) اور مولانا مفتی عارف صاحب کنجری دام مجدہٗ (استاذِ حدیث وتفسیر جامعہ قاسمیہ، کھروڈ) نے انجام دیا ہے کہ ان حضرات نے اپنی نگرانی میں یہ کام کروا کر ہمارے لیے باقی مراحل کی تکمیل ممکن بنائی، ہم ان دونوں بزرگوں اوران کے رضا کاران کے ممنون وشکرگزار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو بہترین بدلہ نصیب فرمائے، اوران کی علمی اور دینی وملی خدمات کو قبول فرمائے اورمزید کی توفیق عطا فرمائے۔ {آمین}

ابوزاہر

۱۹/صفر المظفر ۱۴۳۳ھ

۲۰۱۲/۱/۱۴

بَابُ الْخَوْفِ

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا بیان

﴿مجلس ۱﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَن لَّا اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أما بعد:-

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ. (البقرة:۴۰)

وقال تعالیٰ: إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ. (البروج:۱۲)

وقال تعالیٰ: وَكَذٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَى وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخْذَهٗ أَلِيْمٌ شَدِيْدٌ. إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الآخِرَةِ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ. وَمَا نُؤَخِّرُهٗ إِلاَّ لِأَجَلٍ مَّعْدُودٍ. يَوْمَ يَأْتِ لاَ تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلاَّ بِإِذْنِهٖ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيْدٌ. فَأَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَشَهِيْقٌ. (هود:۱۰۲تا۱۰۶)

وقال تعالیٰ: وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ. (آل عمران:۲۸)

وقال تعالیٰ: يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيْهِ. وَأُمِّهٖ وَأَبِيْهِ. وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ. لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيْهِ. (عبس:۳۴تا۳۶)

وقال تعالیٰ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ. يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَارَى وَمَا هُم بِسُكَارَى وَلَكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ. (الحج:۱،۲)

وقال تعالیٰ: وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ. (الرحمن:۴۶)

وقال تعالیٰ: وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ. قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ. فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُومِ. إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلُ نَدْعُوهُ إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ. (الطور: ۲۵ تا ۲۸)

باری تعالیٰ کی ذات بے نیاز ہے

یہ باب خوف کا قائم کیا ہے کہ آدمی کو اللہ تبارک وتعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے اللہ تبارک وتعالیٰ بے نیاز ہے، وہ بندوں کی عبادت، تسبیحات اور ذکر واذکار کا محتاج نہیں، بندے جو کچھ بھی کرتے ہیں درحقیقت اس کے ذریعہ سے اپنا ہی فائدہ حاصل کرتے ہیں، بندوں کی عبادتوں، ذکر اذکار، تسبیحات اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے دوسرے طریقوں سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت اور کبریائی اور اس کی بڑائی وشان میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہوتا۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

مَن نہ گردم پاک از تسبیح شاں ‎ ‎ پاک ہم ایشاں شوند و دُر فشاں

بندے جو سبحان اللہ، سبحان اللہ کہتے ہیں، میری تسبیح پڑھتے ہیں، مجھے یاد کرتے ہیں، میری عبادت کرتے ہیں، تو ان کے سبحان اللہ کہنے کی وجہ سے میں پاک نہیں ہوتا۔ سبحان اللہ کا ترجمہ ہے: اللہ کی ذات بڑی پاک ہے۔ ہم اگر کہیں کہ اللہ کی ذات بڑی پاک ہے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ذات میں پاکی نہیں آتی، اللہ تعالیٰ تو پاک ہی ہے۔ پھر آگے فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ کہنے کی وجہ سے بندے خود پاک ہوتے ہیں اور بندوں کے اندر خوبی پیدا ہوتی ہے۔ یعنی ہم سبحان اللہ کہیں گے تو ہماری گندی زبان پاک ہو جائے گی۔ نعوذ باللہ! ہمارے سبحان اللہ کی وجہ سے اللہ کی ذات میں کوئی پاکی نہیں آئے گی۔ یہ تو اس کا احسان وکرم ہے کہ اس نے اپنا نام لینے کی اجازت دی، ورنہ ہماری یہ زبان جن

چیزوں میں ہر وقت ملوث رہتی ہے، اور جن گندگیوں کے ہم مرتکب رہتے ہیں، اس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ کا نام لینے کی بھی اجازت نہ دی جاتی، یہ تو اسی کا کرم ہے کہ اجازت ہی نہیں، بلکہ حکم دیا۔ فارسی کا ایک شعر ہے:-

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب
ہنوز نام تو گفتن کمالِ بے ادبی ست

میں ہزار مرتبہ اپنا منہ گلاب ومشک سے دھوؤں، اس کے بعد بھی ہماری زبان اس قابل نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا نام لے سکے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا نام لینا بے ادبی ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے بڑا کرم کیا کہ اس نے اپنا نام لینے کی اجازت ہی نہیں، بلکہ حکم دیا، اور اس طرح ہماری پاکی کا سامان پیدا کیا۔ بندے جب اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں تو اس کی وجہ سے خود بندے کی ذات پاک ہوتی ہے اور اس کے گناہ جھڑتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا قرب ونزدیکی حاصل ہوتی ہے۔

عبادت کے وقت ڈر کی کیفیت ہو

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی عبادتوں کا محتاج نہیں ہے، وہ تو بے نیاز ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ بے نیازی کا آدمی کو ہر وقت استحضار رہنا چاہیے، اور جب بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور اس کی اطاعت اور فرمانبرداری بجالائے تو ڈرتے رہنا چاہیے، یعنی گناہ کرتے ہوئے تو آدمی کو ڈرنا ہی ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت کرتے وقت بھی ڈرتے رہنا چاہیے۔ قرآنِ پاک میں ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ اس آیت کے اندر جو بتلایا گیا ہے کہ وہ لوگ جو بھی عمل کرتے ہیں اس حالت میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں، تو اس آیت میں کیا یہ مراد ہے کہ کوئی آدمی کسی گناہ کا ارتکاب کرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے؟ اس لئے کہ اس آیت میں صرف اتنا ہی ہے کہ وہ جو کچھ بھی

عمل کرتے ہیں اس حالت میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ نہیں! بلکہ عبادت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے کہ معلوم نہیں میری یہ عبادت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے قابل ہے بھی یا نہیں۔ (ترمذی شریف، ۳۱۷۵)

ہماری عبادتوں کی حقیقت

ایک آدمی حضرت تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اس نے اس طرح سے پنکھا جھلنا شروع کیا کہ حضرت کو لگ رہا تھا۔ حضرت نے تھوڑی دیر تو تحمل سے کام لیا، پھر فرمایا: بھائی! تم تو اپنے خیال میں یوں سمجھتے ہو کہ میری خدمت کر رہے ہو اور مجھے راحت پہنچا رہے ہو، لیکن درحقیقت مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ تو ہماری عبادتیں بھی ایسی ہیں کہ ہم جو عبادتیں انجام دیتے ہیں ان کا حق تو ہم سے ادا ہوتا ہی نہیں، اور ان عبادتوں کے ذریعہ ہم یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے خوش ہو جائیں گے، حالاں کہ ہمیں تو اس سے ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں ہماری عبادت سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔

بارگاہِ قدس کا ادب سکھا دیا

حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلویؒ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کے مرید تھے، اپنے وقت کے بہت بڑے شیخ تھے، ان کی خدمت میں دور دور سے لوگ حاضر ہوتے تھے، عراق، شام، سرحد، بخارا و سمرقند کے علاقہ کے لوگ بھی رمضان المبارک اور دوسرے دنوں میں حضرت کی خدمت میں سلوک طے کرنے کے لئے حاضری دیا کرتے تھے، سلسلۂ نقشبندیہ کے بڑے بزرگ گزرے ہیں، اور ان کا حلقہ بڑا وسیع تھا میں جو سنانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ جس زمانہ میں حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کی خدمت میں رہتے تھے، ایک مرتبہ حضرت کے گھر میں سے ان سے کہا: بھائی غلام علی! ایک سوئی لا کر

دو۔ وہ سوئی لے آئے، پیرانی صاحبہ نے کہا: غلام علی! تمہیں سوئی بھی خریدنا نہیں آتا؟ ایسی موٹی سوئی لے کر آ گئے؟ انہوں نے جب یہ سنا تو رونے لگے اور کہا: انہوں نے تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کا ادب سکھا دیا، جب ہم ایک انسان کی پسندیدگی کے معیار پر پورے نہیں اتر سکتے، یعنی ایک عورت نے ہم سے مطالبہ کیا کہ ہمارے لئے سوئی خرید کر لاؤ اور جب ہم نے لا کر پیش کی تو جس قسم کی سوئی چاہتی تھی وہ ہم خرید کر نہیں لا سکے؛ تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے لائق جو عبادت ہے وہ ہم کہاں پیش کر سکتے ہیں۔ بہت دیر تک اسی چیز کو سوچ کر روتے رہے۔

اس بارگاہ کا حق کہاں ادا ہو سکتا ہے؟

ان کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ وہ حضرت مرزا صاحبؒ کو پنکھا جھلا کرتے تھے، ایک مرتبہ ذرا آہستہ جھل رہے تھے، تو حضرت مرزا صاحب نے فرمایا: میاں غلام علی! کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں؟ اس طرح آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہے ہو کہ مجھے تو ہوا بھی نہیں آرہی ہے۔ تو ذرا زور سے جھلنے لگے، تو حضرت نے کہا: تم تو مجھے اُڑا ہی دو گے۔ جب یہ دونوں باتیں ہوئیں تو ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ حضرت! نہ یوں بنے، نہ توں بنے۔ تو حضرت نے کہا: لاؤ! میرا پنکھا مجھے دیدو، مجھے نہیں جھلوانا۔ تو وہ رونے لگے اور معافی مانگی۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ کے جو حقوق ہیں، اور اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کا جو حق ہے وہ تو ہم سے کہاں ادا ہو سکتا ہے؟ اس لیے آدمی کو ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خشیت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقرب اور کون ہوگا؟ بخاری

شریف میں روایت ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب ہوا ذرا تیز چلنے لگتی تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسجد کی طرف لپکتے اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے اور گڑگڑاتے تھے جب بادل آتے ہوئے دیکھ لیتے تو آپ کے چہرۂ انور پر پریشانی کے آثار ظاہر ہوجاتے۔ ایک مرتبہ آپ سے عرض کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول! لوگ بادل کو دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں کہ اب بارش آئے گی، اور ہم آپ کو دیکھتے ہیں کہ آپ جب کسی بادل کو آتا ہوا دیکھتے ہیں تو آپ کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں؟ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: بھائی! کیا گارنٹی (Guarantee) کہ وہ بادل پانی ہی لے کر آرہا ہے۔ بادل وہ بھی تھا جو قومِ عاد کے اوپر آیا تھا اور جب انہوں نے بادل کو آتے ہوئے دیکھا تو یوں کہا تھا: ﴿هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا﴾ یہ بادل آرہا ہے، ہم پر بارش برسائے گا۔ عاد ایک قوم گزری ہے ان کے گناہوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جب ان کے لئے عذاب طے فرمادیا، تو آٹھ دن تک اتنی سخت گرمی پڑی کہ سارے تالاب، دریا ندی نالے وغیرہ میں جو کچھ بھی پانی کے ذخیرے تھے؛ سب خشک ہوگئے، لوگ گرمی کی وجہ سے سخت پریشانی میں مبتلا تھے، اس کے بعد ایک بادل کو آتا ہوا دیکھا تو سب اس بادل کے نیچے آگئے کہ اب بارش برسے گی تو ہم کو سکون حاصل ہوگا جب وہ سب اس بادل کے نیچے آگئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر آگ برسائی اور سب ختم ہوگئے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ کیا گارنٹی ہے کہ جو بادل آرہا ہے وہ بارش ہی برسائے گا۔ (بخاری شریف، ۴۸۲۹)

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بے نیاز ہے، آدمی جتنا اللہ تعالیٰ سے قریب ہوتا ہے اتنا ہی اس سے ڈرتا رہتا ہے۔ تو یہاں خوف کا باب قائم کیا ہے کہ آدمی کو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ اسی سلسلہ میں کچھ آیتیں اور حدیثیں پیش کرتے ہیں۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ﴾ مجھ ہی سے ڈرتے رہو، یعنی

اصل ڈر تو اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، کسی اور سے آدمی خوف نہ کرے۔

اور پھر یہ بھی فرمایا ﴿إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ کی پکڑ اور اس کی گرفت بہت سخت ہے۔ آدمی کو اس بات کا تصور کرتے رہنا چاہیے۔ میں پہلے ہی بتلا چکا ہوں کہ کس بات پر گرفت ہو جائے اس کی گارنٹی نہیں دی جا سکتی، کبھی چھوٹی سی بات پر بھی گرفت ہو جاتی ہے۔ اس لئے آدمی ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے۔

ان میں بڑی عبرت ہے

اور سورۂ ھود کی کچھ آیتیں پیش کی ہیں۔ اگلی قوموں کے قصے بیان کئے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نافرمانیوں پر پکڑا گیا اور ان کی گرفت ہوئی، وہ سب بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۚ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ﴾ تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے، جب وہ کسی بستی کی پکڑ کرتا ہے جب کہ وہ بستی والے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہوں۔ بیشک اللہ تعالیٰ کی پکڑ بڑی دردناک اور سخت ہوا کرتی ہے ﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ﴾ یہ جتنے بھی قصے بیان کئے گئے، ان میں بڑی عبرت ہے اس آدمی کے لیے جو آخرت کے عذاب سے ڈرے ﴿ذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ﴾ اور آخرت کا جو دن ہے اس میں تمام لوگوں کو جمع کیا جائے گا اور جسے سب کے سب کھلی آنکھوں دیکھیں گے۔ اور یہ مت سمجھئے کہ وہ آنے والا نہیں ہے ﴿وَمَا نُؤَخِّرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ مَّعْدُودٍ﴾ ہم نے اس کو ایک مقررہ وقت تک کے لیے ٹلا رکھا ہے۔ ہم نے جو وقت طے کیا ہے اس وقت وہ دن آئے گا۔ جس دن وہ آجائے گا، اللہ تعالیٰ کے حضور میں کوئی - مومن ہو یا کافر - بات کرنے کی بھی جرأت نہیں کرے گا۔ ہاں! اگر اللہ تعالیٰ کی اجازت ہوگی تو بات کرے گا

﴿فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ﴾ اور قیامت کے دن میدانِ حشر میں دونوں قسم کے لوگ ہوں گے، نیک بخت بھی ہوں گے اور بد بخت بھی ہوں گے، اور اس میں جو بد بخت ہوں گے وہ جہنم میں ڈالے جائیں گے، وہ چیخ و پکار کرتے رہیں گے۔

ان آیتوں کو لاکر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے کی تاکید فرمارہے ہیں۔

قیامت کا منظر

آگے ایک اور آیت ہے ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ﴾ قیامت کے دن آدمی اپنے بھائی، ماں، باپ، بیوی اور بیٹوں سے بھاگے گا۔ یعنی اپنے رشتہ داروں کو دیکھ کر اس ڈر سے بھاگے گا کہ معلوم نہیں وہ مجھ سے کیا مطالبہ کر بیٹھیں۔ عام طور پر آدمی کا دنیا میں جن لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، انہیں کے کچھ حقوق باقی رہ جاتے ہیں اور انہیں کی طرف سے مطالبہ کا ڈر رہتا ہے تو اس دن انہیں رشتہ داروں کو دیکھ کر آدمی بھاگے گا۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس دن ہر ایک اپنی حالت میں اس طرح گرفتار ہوگا کہ دوسروں کی طرف سے بے پرواہ ہو جائے گا۔ یعنی اس کو دوسرے کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں ہوگا، بس اپنا ہی فکر لاحق ہوگا۔

قیامت کا زلزلہ

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ﴾ اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، بے شک قیامت کا زلزلہ بڑا خطرناک ہے، جس دن تم اس کو دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور آپ اس دن لوگوں کو ایسا محسوس کریں گے گویا وہ نشے میں ہیں، حالاں کہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب بڑا سخت ہے۔ اس دن کی ہیبت وخوف لوگوں پر اتنا سخت طاری ہوگا کہ وہ اپنا ہوش و حواس کھو بیٹھیں گے۔

ایک رات میں جوان بوڑھا ہوگیا

کتبِ تفسیر میں لکھا ہے کہ ایک آدمی رات کو سویا تو اس کے بال سیاہ تھے، صبح میں اُٹھ کر دیکھا تو سب بال سفید تھے۔ اس سے پوچھا کہ بھائی! کیا بات ہے؟ تو اس نے کہا کہ میں نے رات کو خواب میں قیامت کا منظر دیکھا، اس کی مجھ پر ایسی ہیبت طاری ہوئی اور میری طبیعت پر ایسا اثر پڑا کہ سارے سیاہ بال سفید ہو گئے (تفسیر قرطبی، سورۂ مزمل) خواب میں یہ منظر دیکھ کر جب ایسا حال ہوسکتا ہے، تو بیداری میں کیا حال ہوگا؟

انسانی پیدائش کی ترتیب

۳۹۶ - عَنْ بْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَهُوَ الصادق المصدوق: إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوماً نُطْفَةً، ثُمَّ يَكُونُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يَكُونُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يُرْسَلُ المَلَكُ، فَيَنْفُخُ فِيهِ الرُّوحَ، وَيُؤْمَرُ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ: بِكَتْبِ رِزْقِهِ وَأَجَلِهِ وَعَمَلِهِ وَشَقِيٌّ أَوْ سَعِيدٌ. فَوَالَّذِي لا إِلٰهَ غَيْرُهُ إِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الجَنَّةِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وبَيْنَهَا إِلاَّ ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيهِ الكِتَابُ، فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ فَيدْخُلُهَا، وَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلاَّ ذراعٌ، فَيَسْبِقُ عَلَيهِ الكِتَابُ فَيعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا. (مُتَّفَقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ مع تشریح: - حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے ارشاد فرمایا، حال یہ ہے کہ آپ سچے بھی ہیں اور آپ کی تصدیق بھی کی گئی ہے (یعنی لوگ آپ پر ایمان بھی لائے اور آپ کی بات کو سچا بھی مانا) کہ انسان کو اس کی پیدائش کے لئے نطفہ کی شکل میں اس کی ماں کے رحم میں چالیس دن تک جمع کیا جاتا ہے (جب مرد کا نطفہ

عورت کے رحم کے اندر جوش اور شدت کے ساتھ پہنچتا ہے تو اس کے ذرات پورے رحم میں پھیل جاتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ کو اس نطفہ سے اگر بچہ پیدا کرنا منظور ہوتا ہے تو وہ اجزاء جو پورے رحم مادر میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں وہ سب دھیرے دھیرے ایک جگہ اکٹھے کئے جاتے ہیں۔نطفہ کے سارے منتشر اجزاء جو بچہ دانی میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں وہ سب ایک جگہ چالیس دن میں جمع ہوتے ہیں) اس کے بعد وہ نطفہ جمے ہوئے خون کی شکل اختیار کرتا ہے (اور اس کی یہ حالت چالیس روز تک رہتی ہے) اس کے بعد پھر وہ گوشت کے لوتھڑے کی شکل اختیار کرتا ہے (اور یہ کیفیت بھی چالیس دن تک رہتی ہے) اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے جو اس میں جان ڈالتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بچہ کی چار چیزیں لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے، پہلی چیز تو اس کی روزی، دوسری اس کی عمر، تیسری اس کے اعمال، اور چوتھی وہ نیک بخت ہے یا بد بخت۔

نئی فائل تیار کروائی

یہ چار چیزیں جو فرشتہ لکھتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے متعلق ابھی یہ فیصلہ ہوا۔ بلکہ فیصلہ تو پہلے سے ہو چکا تھا۔ حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یوں سمجھو کہ جب اللہ تعالیٰ کو اس کی پیدائش منظور ہوئی تو لوحِ محفوظ میں اس کے بارے میں جو کچھ لکھا ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے فرشتہ بھیج کر اس کے لئے ایک نئی فائل الگ تیار کروائی۔ چناں چہ روایتوں میں آتا ہے کہ فرشتہ پوچھتا ہے کہ باری تعالیٰ! اس کے لئے کیا لکھا جائے؟ باری تعالیٰ کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ دیکھو! لوحِ محفوظ میں اس کے لئے کیا لکھا گیا ہے؟ اس کے مطابق لکھ دو۔ تو یوں سمجھو کہ ایک سو بیس دن کے بعد اس کی الگ فائل شروع ہو گئی۔ اس کو ایک مثال سے میں سمجھاتا ہوں کہ جیسے حاملہ ہونے کی حالت میں ہسپتال کے اندر ماں کا جب داخلہ ہوتا ہے تو جب تک اس کو بچہ پیدا نہیں

ہوا، وہاں تک صرف ماں کی فائل ہوتی ہے، لیکن جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو بچہ کی ایک الگ فائل بنائی جاتی ہے، پھر وہ ماں کی فائل میں شمار نہیں ہوتا۔ اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی ہے کہ جب اس کو دنیا میں بھیجنا منظور ہوا تو فرشتہ بھیج کر اس کے لئے الگ معاملہ شروع کیا گیا۔

نوشتۂ تقدیر غالب آ کر رہتا ہے

(اب دیکھئے کون نیک بخت ہے اور کون بد بخت ہے وہ تو اللہ کی طرف سے طے ہو چکا ہے) تو حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: قسم ہے اس ذات کی جس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں، بعض مرتبہ کوئی آدمی جنتیوں جیسے اعمال کر رہا ہوتا ہے یعنی لوگ اس کو دیکھ رہے ہیں کہ اچھے اعمال کر رہا ہے، یہاں تک کہ اچھے اعمال کرتے کرتے زندگی کا جب آخری مرحلہ آیا اور اب موت میں اور اس میں زیادہ فاصلہ نہیں رہا، اور قریب ہے کہ اپنے اس عمل کے ذریعہ سے جنت میں پہنچ جائے، ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا (یہ قلیل فاصلہ کی طرف اشارہ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے روزِ ازل اس کے لیے جہنمی ہونے کا فیصلہ کیا تھا) تو اب وہ فیصلہ غالب آتا ہے اور اخیر میں موت سے پہلے وہ جہنمیوں جیسے اعمال کرتا ہے (جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسی حالت میں موت آتی ہے) اور جہنم میں جاتا ہے۔ اور کوئی آدمی جہنمیوں جیسے عمل کرتا رہا، یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان میں ایک ہاتھ کے برابر یعنی تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جنتی ہونے کا فیصلہ کیا تھا تو وہ فیصلہ غالب آتا ہے، اور وہ جنتیوں کے سے عمل کرنے لگتا ہے (اور اسی پر موت آتی ہے) اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کسی کو بھی اپنے عمل پر اعتماد کر کے مطمئن نہیں رہنا چاہیے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ڈرتے رہنا چاہیے کہ معلوم نہیں انجام کیا ہو؟ ملا علی قاریؒ

فرماتے ہیں کہ بڑے بڑے اہل اللہ کو اسی چیز نے فکر اور تشویش میں ڈال رکھا ہے کہ معلوم نہیں انجام کیا ہو؟ اس لئے کہ فیصلہ اسی پر ہوتا ہے۔

جہنم کا ایک منظر

۳۹۷- وعنه قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: يُؤْتَى بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لَهَا سَبْعُوْنَ أَلْفَ زِمَامٍ مَعَ كُلِّ زِمَامٍ سَبْعُوْنَ أَلْفَ مَلَكٍ يَجُرُّوْنَهَا. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جہنم کو قیامت کے روز (میدانِ حشر میں) لایا جائے گا، اس کی ستر ہزار (۷۰۰۰۰) لگام ہوں گی، اور ہر لگام کو ستر ہزار (۷۰۰۰۰) فرشتے کھینچ رہے ہوں گے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ جہنم اتنی بڑی ہوگی کہ اس کو قریب کرنے کے لئے اتنا زیادہ اہتمام کیا جائے گا۔ اس روایت کو لانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ یہ سن کر آدمی کے اندر خوف کی کیفیت پیدا ہو جو اس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ سے روکے۔

سب سے کم عذاب

۳۹۸- وعن النعمان بن بشير رضی اللہ عنہما قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ إِنَّ أَهْوَنَ أَهْلِ النَّارِ عَذَاباً يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَرَجُلٌ يُوْضَعُ فِيْ أَخْمَصِ قَدَمَيْهِ جَمْرَتَانِ يَغْلِيْ مِنْهُمَا دِمَاغُهُ. مَا يَرىٰ أَنَّ أَحَداً أَشَدُّ مِنْهُ عَذَاباً، وَأَنَّهُ لَأَهْوَنُهُمْ عَذَاباً. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے روز جہنمیوں میں عذاب کے اعتبار سے سب سے ہلکا وہ آدمی ہوگا جس کے دونوں پاؤں کے تلویوں کے نیچے دو انگارے رکھے جائیں گے۔ ان دو انگاروں کا اثر یہ

ہوگا کہ اس کا دماغ کھول رہا ہوگا جیسے ہانڈی کو آگ کے اوپر رکھتے ہیں تو اس کا پانی کھولتا ہے۔ اور وہ یوں سمجھ رہا ہوگا کہ مجھ سے زیادہ سخت عذاب والا اور کوئی نہیں ہے، حالانکہ سب سے ہلکا عذاب اس کو ہورہا ہوگا۔

افادات:-"أَخْمَصِ قَدَمَيْهِ" پاؤں کا وہ حصہ جو پاؤں زمین پر رکھتے وقت زمین پر نہیں لگتا۔ گویا دونوں پاؤں کے ان حصوں میں ایک ایک انگارا رکھا جائے گا، اور جہنم کے اندر سب سے ہلکے اور کم عذاب والا آدمی یہ ہوگا۔ بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ جہنم کا عذاب بہت ڈرنے کی چیز ہے۔ بعض لوگوں کو جب جہنم کے عذاب سے متعلق وعید کی کچھ آیتیں اور احادیث سنائی جاتی ہیں تو وہ بڑی جرأت سے اپنی زبان سے ایسی ویسی باتیں نکال دیتے ہیں کہ "نعوذ باللہ" جہنم میں چلے جائیں گے۔ یا بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ تیری طرف سے سزا میں بھگت لوں گا۔ یہ بڑے خطرناک جملے ہیں۔ اور سب سے ہلکا عذاب یہ ہے لیکن وہ سمجھ رہا ہوگا کہ مجھ سے زیادہ سخت عذاب والا اور کوئی نہیں ہے۔

گلے تک آگ

۳۹۹ - وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ نَبِيَّ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: مِنْهُمْ مَنْ تَأْخُذُهُ النَّارُ إِلَى كَعْبَيْهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ تَأْخُذُهُ إِلَى رُكْبَتَيْهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ تَأْخُذُهُ إِلَى حُجْزَتِهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ تَأْخُذُهُ إِلَى تَرْقُوَتِهِ. (رواه مسلم)

(الْحُجْزَةُ) مَعْقِدُ الْإِزَارِ تَحْتَ السُّرَّةِ وَ (التَّرْقُوَةُ) بِفَتْحِ التَّاءِ وَضَمِّ الْقَافِ: هِيَ الْعَظْمُ الَّذِي عِنْدَ ثَغْرَةِ النَّحْرِ وَلِلْإِنْسَانِ تَرْقُوَتَانِ فِي جَانِبَيِ النَّحْرِ.

ترجمہ:- حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جہنمیوں کو جب جہنم میں ڈالا جائے گا تو ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق آگ پکڑے گی (یعنی جس نے جیسے جیسے گناہ کئے ہوں گے اس کے مناسب اس کو عذاب ہوگا) بعض وہ ہوں گے

جن کو ٹخنوں تک آگ لگے گی۔ بعض وہ ہوں گے جن کو گھٹنوں تک آگ پکڑے گی۔ بعض وہ ہوں گے جو کمر تک آگ میں ڈوبے ہوں گے۔ اور بعض گلے تک آگ میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔

کانوں تک پسینے میں

۴۰۰- وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما: أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ حَتّٰى يَغِيْبُ أَحَدُهُمْ فِيْ رَشْحِهِ إِلٰى أَنْصَافِ أُذُنَيْهِ۔ (متفق عَلَيْهِ)
وَ(الرَّشْحُ): اَلْعَرَقُ۔

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے میدانِ حشر میں پیش ہوں گے (اور اس وقت سورج قریب ہوگا، اس کی وجہ سے ہر ایک پسینے میں ڈوبا ہوا ہوگا) یہاں تک کہ بعض وہ ہوں گے جو کانوں تک پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔

افادات:- یعنی ان کے پسینے اتنے ہوں گے کہ وہ کان تک ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ اور یہ تو میدانِ حشر کا حال ہے، جہنم کا نہیں۔ جہنم کا حال تو اوپر بتلایا تھا۔

......تو ہنسو کم، اور روؤ زیادہ

۴۰۱- وَعَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خُطْبَةً مَا سَمِعْتُ مِثْلَهَا قَطُّ فَقَالَ: لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا أَعْلَمُ، لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلاً وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيْراً. فَغَطّٰى أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وُجُوْهَهُمْ وَلَهُمْ خَنِيْنٌ۔ (متفق علیه)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ ہمیں ایک خطبہ دیا، ویسا خطبہ میں نے کبھی نہیں سنا۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! آخرت اور جنت و جہنم کے جو حالات میں جانتا ہوں، اگر تم لوگ جاننے لگو، تو ہنسو کم، اور روؤ زیادہ۔ جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے یہ ساری باتیں لوگوں نے سنیں تو حضراتِ صحابہ نے مارے غم کے اپنے چہرے

ڈھانپ لئے اور خوب رونے لگے۔ (یعنی ان کے منہ سے رونے کی آوازیں نکلنے لگیں۔)

سورج ایک میل دور ہوگا

۴۰۲ - وعن المقداد رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم يَقُوْلُ: تُدْنَى الشَّمْسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الْخَلْقِ حَتّٰى تَكُوْنَ مِنْهُمْ كَمِقْدَارِ مِيْلٍ.

قَالَ سُلَيْمُ بْنُ عَامِرٍ الرَّاوِيْ عَنِ الْمِقْدَادِ: فَوَاللّٰهِ مَا أَدْرِيْ مَا يَعْنِيْ بِالْمِيْلِ، أَمَسَافَةَ الْأَرْضِ أَمِ الْمِيْلَ الَّذِيْ تُكْتَحَلُ بِهِ الْعَيْنُ؟

قَالَ: فَيَكُوْنَ النَّاسُ عَلٰى قَدْرِ أَعْمَالِهِمْ فِي الْعَرَقِ، فَمِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ إِلٰى كَعْبَيْهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ إِلٰى رُكْبَتَيْهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ إِلٰى حِقْوَيْهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ يُلْجِمُهُ الْعَرَقُ إِلْجَاماً. قَالَ: وَأَشَارَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بِيَدِهِ إِلٰى فِيْهِ.

(رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت مقداد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے روز سورج کو مخلوق کے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ ان سے ایک میل کی مقدار دور ہوگا۔ حضرت مقداد صحابی سے یہ روایت نقل کرنے والے تابعی حضرت سلیم بن عامرؒ کہتے ہیں کہ میں یہ نہیں بتلاسکتا کہ میل سے کیا مراد ہے؟ (زمین کی مسافت ناپنے کے لئے بھی میل بولا جاتا ہے جو آٹھ فرلانگ کا ہوتا ہے۔ اور آنکھ میں سرمہ ڈالنے کے لیے جو سلائی استعمال ہوتی ہے اس کو عربی زبان میں میل کہتے ہیں) تو حضرت سُلَیم تابعی فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو فرمایا کہ ایک میل دور ہوگا، تو میں نہیں بتلاسکتا کہ میل سے کیا مراد ہے؟ زمین ناپنے کا میل، یا سرمہ دانی کی سلائی مراد ہے۔

اہلِ ہیئت کے یہاں ایک حساب ہے جس کو نوروالے میل کہا جاتا ہے۔ تو نور والے میل کے حساب سے سورج زمین سے نو کروڑ تینتیس لاکھ (۹,۳۳,۰۰,۰۰۰)

میل دور ہوتا ہے۔ تو سوچنے کی چیز یہ ہے کہ جب اتنا دور ہونے کی صورت میں گرمی کے زمانہ میں اس کی گرمی کی شدت کا یہ حال ہوتا ہے کہ ہم سے برداشت نہیں ہوتی، تو جب وہ ایک میل دوری پر ہو جائے گا تو پھر اس کی گرمی کا کیا عالَم ہوگا؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سورج کے اتنا قریب ہونے کی وجہ سے تمام لوگ اپنے اپنے اعمال کے مطابق پسینہ میں غرق ہوں گے۔ بعض لوگ ٹخنوں تک پسینہ میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ بعض گھٹنوں تک پسینہ میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ بعض ہنسلی تک ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ اور بعض لوگوں کو پسینے کی لگام پہنا دی جائے گی یعنی منہ تک ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے منھ تک اشارہ کر کے بتلایا۔

اتنا زیادہ پسینہ نکلے گا کہ......

۴۰۳۔ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: يَعْرُقُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يَذْهَبَ عَرَقُهُمْ فِي الْأَرْضِ سَبْعِيْنَ ذِرَاعًا وَ يُلْجِمُهُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ آذَانَهُمْ۔ (متفق عليه) وَمَعْنَى يَذْهَبُ فِي الْأَرْضِ: يَنْزِلُ وَيَغُوْصُ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز لوگ اتنے پسینہ میں غرق اور شرابور ہوں گے کہ ان کا پسینہ بہہ کر زمین کے اندر ستر ہاتھ نیچے تک چلا جائے گا۔

افادات:- پہلی بات تو یہ کہ پسینہ ان کے جسم سے اتنا نکلے گا کہ زمین کے اندر نیچے ستر ہاتھ تک چلا جائے گا۔ اب غور کیجیے کہ جو ندی ہوتی ہے جہاں بارہ مہینے پانی رہتا ہے اس کو بھی کھود کر دیکھئے کہ کتنا نیچے پانی گیا ہے۔ تو جب ان کے پسینہ کا اثر ستر ہاتھ تک نیچے جائے گا تو سوچو کہ کتنا پسینہ نکلے گا۔ اور پھر اس کے بعد جو پسینہ اوپر آئے گا وہ کسی کو ٹخنوں تک، تو کسی کو گھٹنوں تک، کسی کو کمر تک اور اخیر میں کانوں تک پہنچے گا۔

جہنم کی گہرائی

۴۰۴- وعَنۡهُ قَالَ: كُنَّا مَعَ رَسُوۡلِ اللهِ ﷺ إِذۡ سَمِعَ وَجۡبَةً، فَقَالَ: هَلۡ تَدۡرُوۡنَ مَا هٰذَا؟ قُلۡنَا: اَللهُ وَرَسُوۡلُهُ أَعۡلَمُ. قَالَ: هٰذَا حَجَرٌ رُمِيَ بِهِ فِي النَّارِ مُنۡذُ سَبۡعِيۡنَ خَرِيۡفًا، فَهُوَ يَهۡوِيۡ فِي النَّارِ الۡآنَ حَتّٰى انۡتَهٰى إِلٰى قَعۡرِهَا فَسَمِعۡتُمۡ وَجۡبَتَهَا.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے کسی چیز کے گرنے کی آواز سنی، تو حضراتِ صحابہ سے پوچھا: معلوم ہے یہ کاہے کی آواز آئی؟ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک پتھر تھا جو جہنم کے اندر ستر سال پہلے ڈالا گیا تھا، وہ گرتے گرتے آج اس کی تہہ میں پہنچا، اور تم نے اس کے گرنے کی آواز سنی (اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جہنم کتنی گہری ہوگی!)

براہِ راست گفتگو ہوگی

۴۰۵ - وَعَنۡ عَدِيِّ بۡنِ حَاتِمٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللهِ ﷺ: مَا مِنۡكُمۡ مِنۡ أَحَدٍ إِلَّا سَيُكَلِّمُهُ رَبُّهُ لَيۡسَ بَيۡنَهُ وَبَيۡنَهُ تَرۡجُمَانٌ، فَيَنۡظُرُ أَيۡمَنَ مِنۡهُ فَلَا يَرٰى إِلَّا مَا قَدَّمَ، وَيَنۡظُرُ أَشۡأَمَ مِنۡهُ فَلَا يَرٰى إِلَّا مَا قَدَّمَ، وَيَنۡظُرُ بَيۡنَ يَدَيۡهِ فَلَا يَرٰى إِلَّا النَّارَ تِلۡقَاءَ وَجۡهِهٖ، فَاتَّقُوا النَّارَ وَلَوۡ بِشِقِّ تَمۡرَةٍ. (متفق عَلَيۡهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر ایک سے اللہ تبارک وتعالیٰ گفتگو فرمائیں گے اس طرح کہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی ترجمان (ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے والا) نہیں ہوگا (گویا اللہ تعالیٰ کے سامنے بالکل اس طرح پیشی ہے کہ براہِ راست اللہ تعالیٰ

سے اس کی بات چیت ہو رہی ہے اور اللہ تعالیٰ سیدھا اس سے سوال کر رہے ہیں، اس وقت وہ ڈرے گا کہ کیسے میں اپنا بچاؤ کروں) دائیں طرف دیکھے گا تو جو اعمال اس نے کئے ہیں وہ ہوں گے، بائیں طرف دیکھے گا تو وہاں بھی اپنے ہی اعمال دیکھے گا، اور سامنے دیکھے گا تو جہنم ہوگی (اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ) اپنے آپ کو جہنم سے بچانے کی کوشش کرو، چاہے کھجور کے ایک ٹکڑے سے ہی کیوں نہ ہو۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ کھجور کا ایک آدھا حصہ اللہ کے راستہ میں صدقہ کر کے بھی آدمی اپنے آپ کو جہنم سے بچا سکتا ہے، جتنے بھی نیک اعمال ہیں وہ سب جہنم سے بچانے کا ذریعہ ہیں۔

......تم لذتیں اُٹھانا چھوڑ دو

۴۰۷ - وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم : إِنِّي أَرَى مَا لاَ تَرَوْنَ، أَطَّتِ السَّمَاءُ وحُقَّ لَهَا أَنْ تَئِطَّ، مَا فِيهَا مَوْضِعُ أَرْبَعِ أَصَابِعَ إِلاَّ وَمَلَكٌ وَاضِعٌ جَبْهَتَهُ سَاجِداً لِلّٰهِ تَعَالىٰ. وَاللهِ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا أَعْلَمُ، لَضَحِكْتُمْ قَلِيلاً وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيْراً، وَمَا تَلَذَّذْتُمْ بِالنِّسَاءِ عَلَى الْفُرُشِ، وَلَخَرَجْتُمْ إِلَى الصُّعُدَاتِ تَجْأَرُوْنَ إِلَى اللهِ تَعَالىٰ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: حديث حسن)

و(أطّت) بِفَتْحِ الْهَمْزَةِ وتشديد الطاء و(تئط) بِفَتْحِ التّاء وبعدها همزة مكسورة. والأَطِيْطُ: صوت الرَّحْلِ وَالْقَتَبِ وشِبْهِهِمَا، ومعناه: أَنَّ كَثْرَةَ مَنْ فِي السَّمَاءِ مِنَ الْمَلاَئِكَةِ الْعَابِدِيْنَ قَدْ أَثْقَلَتْهَا حَتّٰى أَطَّت. و(الصُّعُدَات) بِضَم الصاد والعين: الطُّرُقَات: ومعنى: (تَجْأَرُوْنَ) تَسْتَغِيْثُوْنَ۔

ترجمہ:- حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں وہ چیز دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔ آسمان چر چرا رہا ہے یعنی بوجھ کی شدت کی وجہ سے اس میں

سے آواز نکل رہی ہے (اونٹ کا جو کجاوا ہوتا ہے، اس کے اوپر لکڑی کا فریم رکھا جاتا ہے اوراس کے اوپر بوجھ لادا جاتا ہے، جب اس پر بوجھ لادتے ہیں تو لکڑی کے فریم کے اندر سے چرچرانے کی آواز نکلتی ہے۔ کرسی پر کوئی بھاری بھرکم آدمی بیٹھ جائے تو اس کرسی میں سے ایک قسم کی آواز نکلتی ہے؛ اس آواز کو چرچرانا کہتے ہیں) اوراس کو حق ہے کہ وہ چرچرائے (کیوں چرچراتا ہے؟) آسمان میں چار انگلی کے برابر بھی جگہ نہیں مگر وہاں ایک فرشتہ ہے جو اپنی پیشانی کو اللہ کے حضور سجدے میں رکھے ہوئے ہے۔ (گویا اتنے زیادہ فرشتے آسمان پر ہیں کہ ان کے بوجھ کی وجہ سے آسمان چرچراتا ہے۔) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم! آخرت میں پیش آنے والے ان حالات کو اگر تم جان لو جو میں جانتا ہوں، تو تم ہنسو کم، اور رو ؤ زیادہ۔ بلکہ ان حالات کا اگر تمہیں علم ہو جائے تو تم اپنے بستروں پر اپنی عورتوں سے لذت حاصل نہیں کرو گے۔ (یعنی طبیعت پر ایسا خوف اور ایسی خشیت غالب ہو جائے کہ آدمی اپنی بیوی سے صحبت کرنا بھی بھول جائے) اوراس خوف کی وجہ سے تم چِلّاتے ہوئے جنگلوں کی طرف نکل جاؤ۔

افادات:- یہ غفلت بھی اس معنیٰ کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت ہے کہ جس کی وجہ سے آدمی دنیا میں زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن اتنی بھی غفلت نہ ہو جائے کہ آدمی آخرت کی طرف سے بے خبر ہی ہو جائے۔

قیامت کے سوالات

۴۰۷- وَعَنْ أَبِيْ بَرْزَةَ-بِرَاء ثُمَّ زاى. نَضْلَةَ بْنِ عبيد الأسلمى رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: لاَ تَزُوْلُ قَدَمَا عَبْدٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَ أَفْنَاهُ؟ وَعَنْ عِلْمِهٖ فِيْمَ فَعَلَ فِيْهِ؟ وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ أَيْنَ اِكْتَسَبَهُ؟ وَفِيْمَ أَنْفَقَهُ؟ وَعَنْ جِسْمِهٖ فِيْمَ أَبْلَاهُ؟۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ، وقَالَ: حديث حسن صحيح)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز بندے کے قدم اللہ تعالیٰ کے حضور سے ہٹ نہیں پائیں گے یہاں تک کہ اس کو چند سوالات کئے جائیں۔ پہلا سوال تو یہ پوچھا جائے گا کہ عمر کہاں ختم کی؟ (آدمی یہ سوچ لے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، اپنی عمر کو جن چیزوں میں بسر کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ کے حضور یہ سوال ہونے والا ہے اور اس کا جواب دینا ہے۔) اور (یہ بھی سوال ہوگا کہ) اللہ تعالیٰ کے جو احکام تمہیں معلوم تھے ان پر کتنا عمل کیا؟

اور مال (کے متعلق بھی سوال ہوگا کہ) کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ (آج ہم لوگ مال کی طلب میں تو لگے ہوئے ہیں لیکن کبھی سوچتے نہیں کہ اس کا بھی جواب دینا ہے، کہاں سے آرہا ہے وہ بھی جواب دینا ہے، اور کہاں خرچ کر رہے ہیں وہ بھی جواب دینا ہے۔ اس لئے آدمی کمانے میں بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کو مدنظر رکھے اور جس طریقہ سے کمانے کا شریعت نے حکم دیا ہے اس کے مطابق کمائے، اگر غلط طریقہ سے حاصل کیا تو وہ مصیبت ہے۔ اور جائز طریقہ سے کمانے کے بعد غلط طریقہ سے خرچ کیا تو وہ بھی مصیبت ہے۔ اس لئے کہاں سے کمایا اس کا بھی جواب دینا ہے اور کس طرح خرچ کیا اس کا بھی جواب دینا ہے۔)

جسم (کے متعلق پوچھا جائے گا کہ) اس کو کہاں پرانا کیا۔ ''پرانا کیا'' کا مطلب یہ ہے کہ اس کا استعمال کہاں کیا۔ جسم میں آنکھیں بھی ہیں، زبان، کان، ہاتھ، پاؤں بھی ہے شرم گاہ بھی ہے؛ جسم کے مختلف اعضاء جو کچھ بھی کر رہے ہیں ان سب کا اللہ تبارک وتعالیٰ کو جواب دینا ہے، اور وہاں ایسا نہیں ہے کہ کچھ دے دلا کر کام نپٹا لیا جائے، بلکہ وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو فرشتے مقرر ہیں وہ سب کچھ لکھ رہے ہیں۔ قیامت کے روز لوگ جب اپنے اعمال نامہ کو دیکھیں گے تو کہیں گے ﴿مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً

﴿وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا﴾ اس کتاب کو کیا ہو گیا، یعنی فرشتہ کے لکھے ہوئے اس اعمال نامہ کا کیا حال ہے کہ کوئی چھوٹی بڑی بات ایسی نہیں جو اس نے چھوڑی ہو، سب کچھ اندر موجود ہے ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ آدمی جو بولتا ہے اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نگران مقرر ہے، آدمی جو بولتا ہے وہ لکھا جاتا ہے۔ اس لئے آدمی کو یہ سوچنا چاہیے کہ مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور جواب کے لیے پیش ہونا ہے اور اپنے کئے کا جواب دینا ہے، اگر یہ سوچے گا تو پھر اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا اور پھونک پھونک کر قدم رکھے گا ﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ﴾ جو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کے تصور سے ڈرا اور اپنے آپ کو خواہشات اور نفس کے تقاضوں سے روکا؛ تو پھر جنت اس کا ٹھکانا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

بَابُ الْخَوْفِ

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا بیان

﴿مجلس ۲﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خوف کا بیان چل رہا ہے، یہ روایت گزشتہ مجلس میں بھی آچکی ہے اسی کے ضمن میں کچھ باتیں آج بھی پیش کی جاتی ہیں۔

۴۰۷-وَعَنۡ أَبِیۡ بَرۡزَۃَ-بِرَاء ثُمَّ زای. نَضۡلَۃَ بۡنِ عبید الأسلمی رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لَا تَزُوۡلُ قَدَمَا عَبۡدٍ یَوۡمَ الۡقِیَامَۃِ حَتّٰی یُسۡأَلَ عَنۡ عُمُرِہٖ فِیۡمَ أَفۡنَاہُ؟ وَعَنۡ عِلۡمِہٖ فِیۡمَ فَعَلَ فِیۡہِ؟ وَعَنۡ مَالِہٖ مِنۡ أَیۡنَ اِکۡتَسَبَہٗ؟ وَفِیۡمَ أَنۡفَقَہٗ؟ وَعَنۡ جِسۡمِہٖ فِیۡمَ أَبۡلَاہُ؟

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندے کے قدم اللہ تعالیٰ کے سامنے سے میدان حشر میں نہیں ہٹیں گے، یہاں تک کہ اس سے اس کی عمر کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ اس نے اس کو کہاں ختم کیا۔

زندگی ایک سرمایہ ہے

افادات:- زندگی جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطا فرمائی ہے، دراصل یہی وہ سرمایہ اور دولت ہے جس کو لے کر انسان دنیا کے اندر آتا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جسم اور اعضاء کی شکل میں جو نعمتیں اس کو عطا کی جاتی ہیں ان سے دنیا میں رہ کر فائدہ اُٹھانے کے لئے ایک وقتِ مقررہ دیا گیا ہے جس کو ہم زندگی اور عمر سے تعبیر کرتے ہیں، یہی ایک سرمایہ ہے جس کو لے کر انسان دنیا کے اندر آتا ہے۔ اور حضراتِ علماء نے لکھا ہے کہ یہ ایک ایسا سرمایہ ہے جو سیال ہے یعنی آدمی اگر اس کو اپنے کام میں لاوے اور اس کو ایسے اعمال میں استعمال کرے جو اس کے لئے کارآمد ہوں، تب بھی عمر ختم ہو رہی ہے، اور اگر اس میں کوئی کام نہ کرے، بلکہ ویسے ہی بیٹھا رہے تب

بھی اس کی عمر ختم ہو جائے گی، زندگی کے ایام گزر رہے ہیں، آدمی کی سعادت کی بات ہے کہ وہ زندگی کے ان ایام کو ایسے کاموں میں خرچ کرے جو اس کے لئے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سامنے سرخروئی کا باعث ہوں، اللہ تعالیٰ نے یہ زندگی جس مقصد کے لئے دی ہے اسی مقصد میں اس کو استعمال کرے۔

جامد سرمایہ

اس کو اس طرح سمجھ لیں کہ دنیا کے اندر دو قسم کے سرمایے اور دولتیں ہیں۔ ایک دولت تو وہ ہے جو آدمی کے اختیار میں ہے، آدمی جب چاہے اس دولت کو استعمال کرے اور جب چاہے اس کو محفوظ رکھے، جیسے زیور ہے کہ جب اس کی مرضی ہوگی اس کو اپنے کام میں لاسکتا ہے، یا مثلاً آپ کے پاس پچاس ہزار روپے ہیں، یا سونا چاندی ہے، تو یہ ایک ایسا سرمایہ اور دولت ہے جس کو آپ اپنی مرضی کے مطابق جب چاہیں استعمال کر سکتے ہیں؛ اس کو ”جامد سرمایہ“ کہتے ہیں۔ اگر آپ ابھی خرچ کرنا نہ چاہیں تو تجوری میں بند کر دیں، یا کسی کے پاس امانت کے طور پر رکھ دیں، پھر سال دو سال کے بعد آپ اس کو استعمال کر لیں، کوئی بات نہیں، آپ جب چاہیں اپنی مرضی کے مطابق اس کو استعمال کریں، وہ پچاس ہزار روپے یا سونا چاندی کی شکل میں جو دولت ہے وہ محفوظ ہے، اگر ابھی ضرورت نہیں ہے تو محفوظ رکھیں۔ یہ جامد سرمایہ کہلاتا ہے۔

سیال سرمایہ

اور دوسرا ”سرمایہ سیال“ ہوتا ہے یعنی ایسا سرمایہ کہ اسی وقت آدمی اس سے فائدہ اُٹھالے تب تو وہ اُس کے لئے کارآمد ہے، اور اگر اس وقت فائدہ نہیں اُٹھایا تو وہ سرمایہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا، مثلاً آپ کے پاس ایک زمین تھی، اس پر آپ نے دوکان

یا مکان تعمیر کیا تا کہ اس کو کرایہ پر دے کر اس سے آمدنی حاصل کریں، اور اس کے لئے آپ نے پیسے خرچ کئے۔ تو وہ زمین جس پر مکان بنا ہوا ہے وہ تو ایک جامد سرمایہ ہے یعنی ایسا سرمایہ ہے کہ جو آپ کے قبضے میں ہے، آپ کے پاس محفوظ ہے، اور کوئی اس کو آپ کے پاس سے چرا نہیں سکتا، لیکن، ایک مقصد (یعنی کرایہ پر دینے) کے لئے آپ نے اس جگہ ایک عمارت بنائی ہے کہ کرایہ دار اس سے فائدہ اُٹھا کر اس کے بدلہ میں آپ کو معاوضہ کے طور پر کرایہ ادا کرے۔ تو مکان رہائش کے لئے ہے، اور دوکان تجارت کے لئے ہے۔ اب آپ کرایہ پر دیں گے تو کرایہ دار اس مکان میں رہائش اختیار کر کے جو فائدہ اُٹھا سکتا ہے یہ بھی ایک طرح کا سرمایہ اور دولت ہے، آپ اس دولت کو کرایہ دار کے ہاتھوں فروخت کر رہے ہیں۔ لیکن آپ نے مکان تیار ہونے کے بعد جب اس قابل ہو گیا کہ اس میں رہائش اختیار کی جائے، اور جن لوگوں کو ضرورت ہے وہ مطالبہ بھی کر رہے ہیں کہ آپ کا مکان تیار ہو گیا ہے، ہمیں کرایہ پر دید یجئے، لیکن آپ کہہ دیں کہ نہیں! ابھی نہیں دینا ہے، اور تالا بند کر کے رکھیں، تو اگر چہ مکان ایسا سرمایہ ہے کہ اپنی جگہ پر محفوظ ہے لیکن جس روز سے بنایا تھا اس روز سے لے کر دو سال پورے ہونے تک آپ نے اس کو تالے میں بند رکھا، اگر آپ خود اس میں رہائش اختیار کرتے یا اس کو کرایہ پر دید یتے، تو اس سے جو فائدہ اُٹھایا جا سکتا تھا، اس فائدہ کو آپ کرایہ دار کے ہاتھوں فروخت نہیں کر رہے ہیں، تو جوں جوں وقت نکل رہا ہے اس کا وہ فائدہ ضائع ہو رہا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اُس مکان میں رہائش اختیار کر کے جو فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے یہ بھی ایک طرح کا سرمایہ ہے، آپ کے پاس وہ دولت ایسی ہے جو سیال ہے، آپ ہاتھ در ہاتھ اسی وقت اس سے فائدہ اُٹھائیں تو آپ اس سے کوئی قیمت حاصل کر سکتے ہیں، آپ خود فائدہ اُٹھائیں یا کسی کرایہ دار کو

کرایہ پر دے کر اس سے رقم حاصل کریں، یہ بھی ایک طرح کی دولت ہے۔ مکان تو آپ کی پروپرٹی ہے جو ایک الگ دولت ہے، لیکن اس سے فائدہ اُٹھانا ایک الگ سرمایہ ہے۔

جیسے آپ اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بعض بڑے بڑے سرمائے ضائع ہو رہے ہیں۔ فلاں جگہ گیس ہے، لیکن وہ ہوا میں تحلیل ہو رہی ہے، اور حکومت اس کو ضائع کر رہی ہے۔ یہ ایسا سیال سرمایہ ہے کہ اس کو حاصل کر کے اِسی وقت فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔ ندیوں میں پانی بہہ رہا ہے اس سے بجلی حاصل کی جاسکتی ہے، اگر وہاں کوئی پلانٹ لگا کر اس سے بجلی حاصل نہیں کی گئی تو لوگ کہتے ہیں کہ جو قدرتی سرمایہ اللہ تعالیٰ نے ملک کو دے رکھا ہے اس سے حکومت فائدہ نہیں اُٹھاتی، اسے ضائع کر رہی ہے۔

عمر مثل برف

تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں عمر کے جو ایام دے رکھے ہیں اور زندگی عطا کی ہے؛ یہ بھی ایک سیال سرمایہ ہے۔ مثلاً اس وقت ۳۰-۸ بجے ہیں، اب ایسا تو ہے نہیں کہ آپ ۳۰-۸ سے ۰۰-۹ بجے تک کا آدھا گھنٹہ تجوری میں بند کر کے رکھ دیں کہ ابھی ہم اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتے، لیکن کل ہمیں اس وقت کی ضرورت پڑے گی تو ہم اِس آدھ گھنٹہ سے فائدہ اُٹھالیں گے۔ ایسا نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی کا جو وقت گزر رہا ہے، یہ سیال سرمایہ ہے، اس سے فائدہ اُٹھانے اور اس کو کارآمد بنانے کی ایک ہی شکل ہے کہ اس کو جامد شکل دیدی جائے، یعنی ابھی ہم اس کو کسی کام میں لگالیں اور اس سے فائدہ اُٹھا کر محفوظ کرلیں۔

اسی لئے بزرگوں نے عمر کو برف کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ برف کے بیوپاری کے پاس اس کی پونجی برف کی شکل میں ہوتی ہے، یہی اس کا رأس المال ہے جو لمحہ بہ لمحہ پگھل رہا ہے۔ ویسے آپ برف کو تو فریج میں رکھ کر یا اور طریقوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں

لیکن فرض کر لیجئے کہ کسی کے پاس فریج بھی نہیں ہے اور وہ برف بیچ رہا ہے، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ جلدی سے جلدی اس کو بیچ کر پیسوں کی شکل میں تبدیل کر لے، تب ہی اس کا سرمایہ محفوظ ہوگا۔ اس میں جتنی دیر ہوتی جائے گی، اتنی ہی برف پگھلتی چلی جائے گی۔ اسی طرح زندگی کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ جو نعمت عطا فرمائی ہے یہ بھی ایک سیال سرمایہ ہے۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ فرماتے ہیں:

ہو رہی ہے عمر مثل برف کم چپکے چپکے رفتہ رفتہ دم بہ دم

یعنی دھیرے دھیرے یہ عمر برف کی طرح گھٹتی جا رہی ہے، اب عمر کے ان ایام کو ہم اگر کسی چیز سے بدل کر اپنے لئے کارآمد بنالیں، تو یہ کام کی چیز ہے۔

وقت کی قیمت

میں نے پہلے بھی کسی وقت مثال دی تھی کہ دیکھو! جو وقت گذر رہا ہے اس سے ہم کیا قیمت وصول کر سکتے ہیں؟ اس سے دنیوی اعتبار سے بھی قیمت حاصل کر سکتے ہیں اور اُخروی اعتبار سے بھی قیمت حاصل کر سکتے ہیں۔ دنیوی اعتبار سے مثلاً آپ نے اپنا وقت کسی کے ہاتھ ملازمت کے طور پر بیچ دیا کہ میں آپ کے یہاں آٹھ گھنٹے نوکری کروں گا، اس کے ساتھ وقت طے ہوا، اب اس ملازمت پر آپ کو جو تنخواہ ملے گی، گویا آپ نے اپنی زندگی کے اس وقت سے پیسوں کی شکل میں فائدہ اُٹھا کر ان پیسوں کو محفوظ کر لیا۔

اور دوسری شکل اُخروی اعتبار سے ہے کہ آپ زندگی کے ان ایام کو ان کاموں میں خرچ کریں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت میں، اس کو راضی کرنے میں، نیکی کے کاموں میں۔ پھر اس میں بھی مختلف درجات ہیں، کسی کام میں ثواب کم ملتا ہے اور کسی میں زیادہ ملتا ہے۔ فرض کر لیجئے آپ کونے میں بیٹھ کر تسبیح پڑھتے ہیں تو اس تسبیح پر

آپ کو اجر وثواب ملے گا۔ قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے ہیں تو ایک حرف کے اوپر آپ کو دس نیکیاں ملیں گی، اگر آدھ گھنٹے تک یہ کام کریں گے تو اس تیس منٹ میں آپ بے شمار نیکیاں حاصل کر سکتے ہیں۔

سلیمانی سلطنت سے بہتر

ایک سبحان اللہ کتنا قیمتی ہے؟ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے فضائل ذکر میں واقعہ لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک مرتبہ اپنے تخت پر ہوا میں اُڑتے ہوئے تشریف لے جا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کر دیا تھا، آپ جہاں چاہتے تھے ہوا آپ کو لے جاتی تھی۔ گھوڑوں کے اوپر ایک مہینہ میں جو مسافت طے کی جا سکتی تھی، ہوا وہ مسافت آپ کو صبح یا شام کے تھوڑے سے وقت میں طے کرا دیا کرتی تھی، اللہ تبارک وتعالیٰ نے بطورِ معجزہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ چیز عطا فرمائی تھی۔ تو ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہوا پر اپنے پورے دربار کے ساتھ جا رہے تھے کہ ایک بندۂ مؤمن نے ان کو دیکھا۔ آدمی کا مزاج ایسا ہے کہ جب ایسی چیز کسی کے پاس دیکھتا ہے تو اس کے دل میں خیال آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کیسی عمدہ نعمت عطا فرمائی ہے! اس مؤمن کے دل میں بھی ایسا ہی خیال آیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر اس چیز کو منکشف کیا، آپ نے ہوا کو حکم دیا کہ مجھے نیچے اُتار دو، پھر اس سے کہا کہ ایک بندۂ مؤمن کا ایک مرتبہ سبحان اللہ کہنا؛ سلیمان بن داود کی پوری سلطنت سے بہتر ہے۔
(تفسیر قرطبی، ۱۵/۱۳۴)

ایک منٹ کی قیمت

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا کہ اپنی

امت کو میرا سلام کہو (علیٰ ابراہیم وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام) اوران سے یوں کہو کہ جنت تو چٹیل میدان ہے، اس کے درخت سبحان اللہ، الحمدللہ، لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر ہیں۔ آدمی جتنی تسبیح پڑھے گا، اتنے ہی درخت جنت میں لگ جائیں گے۔ گویا ہمیں یہ بتایا گیا ایک مرتبہ سبحان اللہ کہنے پر جنت میں ایک درخت لگ جاتا ہے۔ (ترمذی شریف، ۳۴۶۲)

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورج گرہن کی نماز پڑھا رہے تھے، دورانِ نماز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے بڑھے، پھر پیچھے ہٹے۔ نماز کے بعد صحابہ نے پوچھا کہ آج آپ نے نماز کے دوران ایسی چیزیں کیں جو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نماز کے دوران اللہ تعالیٰ نے میرے سامنے جنت وجہنم کو منکشف کیا، میں جو آگے بڑھا تھا وہ اس لئے کہ میں نے یہ چاہا کہ انگور کا ایک خوشہ توڑ لوں، اگر میں توڑ لیتا تو تم لوگ قیامت تک اس کو کھاتے رہتے اور کبھی بھی وہ ختم نہ ہوتا (بخاری شریف، ۷۴۸) اس لئے کہ جنت کی نعمت کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ باقی رہتی ہے، اس کو فنا نہیں ہے۔ تو اس کو دنیا کھاتی رہتی، وہ خوشہ جوں کا توں اپنی جگہ پر باقی رہتا۔ جب جنت کے ایک خوشہ کا یہ حال ہے کہ سب لوگ قیامت تک کھاتے رہیں تب بھی ختم نہ ہو؛ تو پھر ایک پورے درخت کا کیا حال ہوگا، اور یہ ایک درخت ایک مرتبہ سبحان اللہ پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اب آپ اپنی گھڑی اُٹھا کر دیکھو کہ ایک منٹ میں کتنی مرتبہ سبحان اللہ پڑھ سکتے ہو؟ آسانی سے پچاس، ساٹھ مرتبہ تو ہو ہی جائے گا۔ گویا ایک منٹ میں ساٹھ مرتبہ سبحان اللہ کہیں گے تو جنت کے ساٹھ درخت مل جائیں گے، تو زندگی کے ان اوقات سے آدمی کتنی بڑی دولت حاصل کر سکتا ہے!

ہماری اصل پونجی

دراصل اس سرمایہ کو ہم ضائع کر رہے ہیں یعنی اگر آدمی کچھ نہ کرے، ایک گناہ

بھی نہ کرے، صرف بیٹھا رہے، تب بھی وہ وقت ضائع اور برباد تو ہوا کہ اس نے اس وقت کو کسی بھی کام میں نہیں لگایا۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ زندگی بڑی قیمتی ہے اور یہی ہماری اصل پونجی اور سرمایہ ہے جس کو لے کر ہمیں دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی دو نعمتیں ایسی ہیں جن سے فائدہ اُٹھانے کے معاملہ میں لوگ بڑے نقصان اور گھاٹے میں ہیں۔ ایک تندرستی اور دوسری فرصت (بخاری شریف، ۶۴۱۲) یعنی ان دو نعمتوں سے جس قسم کا فائدہ اُٹھانا چاہیے، اتنا فائدہ نہیں اُٹھایا جاتا، اس کو ضائع کیا جاتا ہے، لوگ اس سے فائدہ اٹھانے کے سلسلہ میں کھوٹ میں رہتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما اور وقت کی قدر

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہیں تشریف لے جا رہے تھے، ایک قبر پر نظر پڑی تو اپنی سواری سے اُترے، دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ لوگ سمجھے کہ شاید صاحبِ قبر کے ساتھ کوئی تعلق اور رشتہ ہوگا، اس وجہ سے آپ نے نماز پڑھی ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ نہیں! میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ جب آدمی قبر میں پہنچ جائے گا تو یہ تمنا کرے گا کہ کاش! مجھے دو رکعت نماز پڑھنے کا وقت مل جاتا، لیکن اس کو موقع نہیں ملے گا۔ اس لئے جب میں نے اس قبر کو دیکھا تو مجھے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد یاد آ گیا تو میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی مجھے موقع دیا ہے، تو اس سے فائدہ اُٹھالوں۔

(کتاب الزھد لابن مبارک)

اس لئے آدمی کو سوچنا چاہیے کہ زندگی کے لمحات بہت قیمتی ہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا سوال ہوگا، ہمیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور زندگی کے متعلق جواب دینا ہے۔ اگر ہمارے کسی بڑے نے ہمیں کوئی دولت اور سرمایہ دیا ہو اور استعمال کی اجازت دی ہو، لیکن یہ بھی کہہ دیا ہو کہ اس کا حساب لوں گا، تو جب بھی ہم اُس کو

استعمال کریں گے اور جہاں کہیں خرچ کریں گے، ہر وقت ہمارے ذہن میں یہ چیز مستحضر رہے گی کہ مجھے جواب دینا ہے، اگر میں نے غلط جگہ خرچ کر دیا تو کیا جواب دوں گا۔

دوسرا سوال

دوسرا سوال یہ ہوگا کہ جو مسائل اور دین کے احکام تمہارے علم میں آئے ان پر تم نے کیا عمل کیا۔ یہ ہر ایک آدمی کے لئے ہے، جس آدمی کو اللہ تعالیٰ نے جس قدر بھی علم عطا فرمایا ہے، اس علم کے مطابق اس نے کتنا عمل کیا، قیامت کے روز اس کے متعلق پوچھا جائے گا، اس میں اگر کوتاہی ہوئی تو سزا ہوگی۔

ایسی چالاکی ہلاکت ہے

مال کے متعلق بھی سوال ہوگا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ آج کل لوگ مال کے معاملہ میں کوئی احتیاط نہیں برتتے۔ آدمی سوچتا ہے کہ میں کسی بھی طرح مال حاصل کرلوں۔ کوئی آدمی لوگوں کو دھوکہ دے کر، جھوٹ بول کر، غلط طریقوں سے اگر مال حاصل کر لیتا ہے تو سماج میں لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بڑا ہوشیار اور چالاک آدمی ہے، حالاں کہ یہ چالاکی اللہ تعالیٰ کے یہاں ہلاکت کا ذریعہ ہے۔ آدمی کو پہلے نمبر پر یہ سوچنا ہے کہ جو مال بھی میں حاصل کروں وہ غلط طریقہ سے نہ ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ کو ناراض کر کے نہ ہو، اور شریعت نے جن طریقوں سے مال حاصل کرنے کی اجازت دی ہے انہیں کے مطابق حاصل کیا جائے۔

مسائل معلوم کریں

اگر آپ تجارت کرتے ہیں تو اس علم کو سیکھ لیجئے کہ میں اس طریقہ سے کام کرتا

ہوں، یہ درست ہے یا نہیں؟ جو بھی کاروبار آپ کا ہو اس کا علم سیکھ لو۔ آج کل ہر آدمی دنیوی سرکاری قوانین کے متعلق بڑا چوکنا رہتا ہے کہ کوئی بات ایسی ویسی نہ ہو جائے، موقعہ بہ موقعہ وکلاء اور قانون کے ماہرین سے مدد لی جاتی ہے اور جس لائن کا مسئلہ ہو اس فن کے ماہر کے پاس برابر حاضری بھی دی جاتی ہے۔ غرض یہ کہ آپ نے اپنے لئے ہر ایک کی خدمات لے رکھی ہیں، اور وہ آپ کا اس سلسلہ میں پرسنل گائڈنس ہے، انکم ٹیکس وکیل سے آپ مشورہ لیں یا نہ لیں، سال کی فیس جو اس کو دینا ہے، وہ تو دینا ہی ہے۔ اسی طرح سیل ٹیکس وکیل اور پولیوشن آفیسر وغیرہ وغیرہ۔ بس! مسائل بتانے والا بیچارہ مولوی ہی مفت میں بیٹھا ہے جو آپ سے کوئی فیس نہیں لیتا، لیکن پھر بھی اس سے پوچھنے اور مسائل معلوم کر کے اس پر عمل کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ دنیا کی حکومت کے ڈر سے اور اس کے قانون کی گرفت سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اتنا زیادہ اہتمام کرتے ہیں اور پیسے بھی خرچ کرتے ہیں، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کل کو اگر گرفت ہو گئی تو کون بچانے آئے گا۔ اس لیے یہ بہت اہم بات ہے کہ مال کہاں سے کمایا۔

اگر یہ لقمہ میری جان کے ساتھ نکلتا

مشکوٰۃ شریف میں روایت ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: لوگوں پر ایک زمانہ آنے والا ہے کہ آدمی اس بات کی پرواہ نہیں کرے گا کہ مال کہاں سے آ رہا ہے، حلال طریقہ سے یا حرام طریقہ سے (مشکوٰۃ، ۲۴۱) حالاں کہ حرام بڑا خطرناک ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ہر وہ گوشت جو حرام مال سے پل کر تیار ہوا (یعنی حرام غذا استعمال کی اور اس سے جسم کا گوشت بنا) تو جہنم کی آگ اس کی زیادہ حقدار ہے، یعنی وہ گوشت

جہنم میں جائے گا (ترمذی، ۶۱۴) یہ حدیث تو ہم بھی سنتے ہیں۔ اور یہی حدیث حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی سنی تھی آپ نے حکایاتِ صحابہ میں یہ قصہ پڑھا اور سنا ہوگا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک غلام تھا جس کو خراج پر اُٹھا رکھا تھا یعنی اس کو اس بات کی اجازت دے رکھی تھی کہ وہ اپنے طور پر کمائے اور کچھ حصہ اس میں سے آپ کو بھی دیدیا کرے ۔ چنانچہ وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کھانا لایا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کئی وقت کا فاقہ تھا، وہ کھانا جب آپ کے سامنے لاکر رکھا تو آپ نے ایک لقمہ اُٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لیا اور وہ حلق سے نیچے اتر گیا اس غلام نے عرض کیا: حضرت! آپ تو ہمیشہ پوچھتے ہیں کہ یہ کہاں سے لایا ہے، آج نہیں پوچھا، کیا آپ بھول گئے؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اب بتادے کہ کہاں سے لایا ہے۔ اس نے کہا کہ اسلام لانے سے پہلے میں نے کچھ لوگوں کی کہانت کی تھی۔ ''کہانت'' یعنی غیب کی خبریں دینا، جوتشی یہی کرتے ہیں، اُس زمانہ میں اس کا بڑا رواج تھا۔ تو اس نے کہا کہ میں نے کہانت کی تھی اور وہ بھی مجھے برابر آتی نہیں تھی، اور اس وقت ان کے پاس اس کا معاوضہ دینے کے لئے کچھ نہیں تھا، تو انھوں نے کہا تھا کہ پھر کسی موقع پر ہم دیں گے۔ آج میرا وہاں سے گزر ہوا، تو کوئی تقریب چل رہی تھی اور کھانا پکا تھا، تو اس کہانت کے بدلہ میں انہوں نے مجھے یہ کھانا دیا۔ چونکہ یہ کہانت کا معاوضہ تھا جو ظاہر ہے کہ حرام کمائی تھی اس لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تو تو مجھے ہلاک ہی کر ڈالتا۔ پھر حلق میں انگلیاں ڈالیں اور جو ایک لقمہ حلق میں گیا تھا اس کو انگلی ڈال ڈال کر نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک دو وقت کے فاقہ کے بعد ایک لقمہ اندر گیا تھا، وہ اس طرح انگلی ڈالنے سے کہاں نکلنے والا تھا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ پانی پی لیجئے اور پھر قے کیجئے، ہوسکتا ہے کہ پانی کے ساتھ نکل آئے۔ چنانچہ ایک بڑے پیالہ میں پانی منگوایا، اور

خوب پانی پیا اور پھر انگلی ڈال کرتے کی، اس کے نتیجے میں بڑی مشکل سے وہ لقمہ - جو اندر چلا گیا تھا - باہر آیا۔ کسی نے کہا: حضرت! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے لئے اپنے آپ کو ہلاک کر دیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر یہ لقمہ میری جان کے ساتھ نکلتا تب بھی نکال کر رہتا۔ اس لئے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ جو گوشت حرام غذا سے تیار ہو، جہنم اس کی زیادہ حقدار ہے۔ تو مجھے یہ ڈر ہوا کہ اس لقمہ سے میرے جسم کا کوئی حصہ تیار نہ ہو جائے، اور ایسا نہ ہو کہ میں جہنم میں چلا جاؤں۔

ہم لوگ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کو سنتے ہیں لیکن ہم اس سے کیا اثر لیتے ہیں؟ اس پر ہمارا کتنا عمل ہے؟ اور ہم اپنی زندگی کے مختلف مواقع پر جہاں ایسی نوبت آتی ہے، اس سے کتنا فائدہ اُٹھاتے ہیں؟ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے سنا تھا تو وہ اس کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔

خرچ کرنے میں کُل مختار نہیں

اور صرف کمائی کا ہی سوال نہیں ہوگا کہ حلال طریقہ سے کمایا یا نہیں؟ بلکہ آپ نے جہاں خرچ کیا وہ جگہ غلط ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کا بھی سوال ہوگا۔ آدمی سمجھتا ہے کہ میں نے کمایا تو یہ میری کمائی ہے، اب میں جس طرح چاہوں خرچ کروں۔ ایسا نہیں ہے، ہم خرچ کرنے میں بھی اپنی مرضی پر چھوڑے نہیں گئے ہیں، ہم اس میں کُل مختار نہیں ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کی جگہیں بھی بتلائی ہیں اپنی ذات پر بھی اپنی ضرورت سے زائد خرچ کرنا فضول خرچی کہلاتا ہے اور اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصہ

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحابی کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس کسی غرض کے

لئے بھیجا، جب وہ ان کے مکان کے دروازے کے قریب پہنچے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی آواز آئی، جب اور قریب ہوئے تو معلوم ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ کو ڈانٹ رہے تھے۔ اور اہلیہ بھی کون تھیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی۔ اور اُن کو صرف اس بات پر ڈانٹ رہے ہیں کہ چراغ کی بتی اتنی اونچی کیوں رکھی ہے، تیل زیادہ جلتا ہے۔ جب اس آدمی نے یہ سنا تو سوچا کہ چراغ کی بتی ذرا اونچی رکھنے پر اپنی بیوی کو ڈانٹ رہے ہیں تو بھلا مجھے کیا دیں گے، یہ سوچ کر وہ واپس ہو گیا کہ آدمی اپنی بیوی کے معاملہ میں بڑا سخی رہتا ہے، خاص کر جب کہ اس کے ساتھ محبت ہو تو وہ جو چاہے خرچ کرائے، اور یہاں تو گھر کی ضرورت کے اندر چراغ جلایا تھا، اس میں بتی ذرا تیز ہو گئی تو اس پر اتنا خفا ہو رہے ہیں۔ دوسرے دن وہ صحابی جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خدمت میں پہنچے تو حضور نے پوچھا کہ: بھائی کیا ہوا؟ انہوں نے کہا کہ: میں نے ان سے نہیں کہا۔ پوچھا: کیوں؟ تو انہوں نے کہا کہ وہاں ایسا ایسا سنا تو میں واپس آ گیا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارہ بھیجا۔ جب جا کر اپنی حاجت رکھی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو خوب دیا۔ انہوں نے اپنے دل کی بات کہی کہ میں تو رات بھی آیا تھا لیکن آپ اپنی اہلیہ کو ڈانٹ رہے تھے اس لئے میں یہ سوچ کر واپس چلا گیا، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ ہم تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منشا کو دیکھتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاں خرچ کرنے کے لئے کہیں گے وہاں ہزاروں لاکھوں خرچ کر دیں گے، اور جہاں خرچ کرنے سے منع کریں گے وہاں ایک پائی بھی خرچ کرنے کے لئے ہم تیار نہیں ہیں۔

ایک مؤمن کا مزاج بھی یہی ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں خرچ کرنے کے لئے فرمایا اور ترغیب دی، وہاں خوب خرچ کرے۔ یا جتنی اجازت دی ہے اتنا ہی خرچ کرے، اس سے زیادہ نہیں۔ اور جہاں خرچ کرنے سے منع کیا ہے وہاں تو خرچ کرنے

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسی جگہ خرچ کرنا تو بڑی نافرمانی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اللہ تعالیٰ کی ہی نافرمانیوں میں استعمال ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے پیسہ دیا تو اسی پیسے سے اللہ کی نافرمانی کے لئے قوت حاصل کرے، یہ تو بڑی بے مروتی اور بڑی نالائقی کی بات سمجھی جائے گی۔

اور جسم کے متعلق بھی سوال ہوگا کہ اس کو کہاں استعمال کیا۔ جسم میں سارے اعضاء آ گئے؛ آنکھ، زبان، کان، ہاتھ، پاؤں اور جسم میں جو کچھ بھی ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے جس طرح استعمال کرنے کا حکم دیا ہے اگر اس کے خلاف استعمال کیا تو پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں پکڑ ہوگی۔

زمین کی خبریں کیا ہیں؟

۴۰۸ - عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَرَأَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا (الزلزلة:۴) ثُمَّ قَالَ: أَتَدْرُوْنَ مَا أَخْبَارُهَا؟ قَالُوْا: أَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ. قَالَ: فَإِنَّ أَخْبَارَهَا أَنْ تَشْهَدَ عَلٰى كُلِّ عَبْدٍ أَوْ أَمَةٍ بِمَا عَمِلَ عَلٰى ظَهْرِهَا، تَقُوْلُ: عَمِلْتَ كَذَا وَ كَذَا فِيْ يَوْمِ كَذَا وَ كَذَا فَهٰذِهٖ أَخْبَارُهَا. (رواہ الترمذی، وقال حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورۂ زلزال کی یہ آیت تلاوت فرمائی ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا﴾ جس دن زمین اپنی خبریں بیان کرے گی، اپنے اندر رکھے ہوئے سماچار (સમાચાર) دے گی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: تمہیں معلوم ہے کہ زمین کی خبریں کیا ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کی خبریں یہ ہیں کہ اس کی پیٹھ پر جو کچھ بھی کیا گیا اس کی ہر مرد اور عورت کے متعلق قیامت

کے روز گواہی دے گی کہ فلاں دن فلاں وقت یہ عمل کیا تھا۔

افادات:- اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے روز کئی قسم کے گواہ لائیں گے، ایک تو خود اعمال نامہ ہوگا۔ دوسرے وہ فرشتے جو آدمی کے ساتھ مقرر ہیں اور وہ سب لکھتے رہتے ہیں۔ تیسرے انسان کے اعضاء گواہی دیں گے۔ اور چوتھے زمین گواہی دے گی جہاں اس نے اعمال کئے تھے۔

مَیں کیسے راحت پا سکتا ہوں؟

۴۰۹- وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِی رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: كَيْفَ أَنْعَمُ! وَصَاحِبُ الْقَرْنِ قَدِ الْتَقَمَ الْقَرْنَ، وَاسْتَمَعَ الْإِذْنَ مَتَى يُؤْمَرُ بِالنَّفْخِ فَيَنْفُخُ فَكَأَنَّ ذٰلِكَ ثَقُلَ عَلٰى أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَقَالَ لَهُمْ: قُوْلُوْا: حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ حَدِيْثٌ حَسَنٌ)

(الْقَرْنُ) هُوَ الصُّوْرُ الَّذِيْ قَالَ اللهُ تَعَالٰى: (وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ) كَذَا فَسَّرَهُ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں کیسے خوش ہو سکتا اور راحت وآرام پا سکتا ہوں جبکہ صور پھونکنے والا فرشتہ صور (جو سینگ کی شکل کا ہے) اپنے منہ میں لئے ہوئے اور کان اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کئے ہوئے منتظر ہے کہ کب اس کو پھونکنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب یہ بات ارشاد فرمائی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس چیز کو سن کر ڈر گئے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہو "حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ" اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے (مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام پر چلتے ہوئے یہ کلمہ بھی پڑھتے رہو، اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد رکھو، تو اللہ تعالیٰ خیر کا معاملہ کرے گا)۔

افادات:- حضرت اسرافیل علیہ السلام جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے صور پھونکنے کی ڈیوٹی حوالہ کی گئی ہے، وہ روزِ اول سے اپنے منہ میں صور لئے ہوئے کھڑے

ہیں اور ہر لمحہ اس انتظار میں ہیں کہ کب اللہ تعالیٰ کا حکم ہو اور میں صور پھونکوں اور قیامت قائم ہو۔ تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب یہ کیفیت ہے تو آدمی کیسے آرام پا سکتا ہے۔ بھائی! کوئی آدمی اپنے گھر میں کھانا لے کر بیٹھا ہو، اور اس کو اندیشہ ہو کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے زلزلہ آیا تھا اور معلوم نہیں کہ زمین دوبارہ کب حرکت میں آجائے گی؛ تو وہ اطمینان سے کھانا کھا سکتا ہے؟ جب کسی خطرہ کے واقع ہونے کے امکانات ہوں جیسے مکان کی چھت بالکل کمزور گرنے کے قریب ہے، تو اس میں رہنے والا کیا اپنے آپ کو راحت میں محسوس کر سکتا ہے؟ نہیں! بلکہ وہ تو ہر وقت پریشان رہے گا۔ تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں کیسے راحت میں اپنے آپ کو رکھ سکتا ہوں جبکہ اسرافیل صور لئے ہوئے کھڑے ہیں اس انتظار میں کہ کب حکم ہو اور میں پھونک ماروں۔

وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا

۴۱۰- وعن أبي هريرة رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وآله وسلم: مَنْ خَافَ أَدْلَجَ، وَمَنْ أَدْلَجَ بَلَغَ الْمَنْزِلَ، أَلا أَنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ غَالِيَةٌ، أَلا أَنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ الْجَنَّةُ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی ڈرتا ہے، وہ اندھیرے میں نکل جاتا ہے۔ اور جو اندھیرے میں نکل جائے گا وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اور دیکھو! اللہ کا سامان بڑا قیمتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا سامان جنت ہے۔

افادات:- اُس زمانہ میں عام طور پر ایسا ہوتا تھا کہ جب کسی قبیلے والوں کو پتہ چل جاتا کہ صبح میں ہمارے قبیلہ پر دشمن کی طرف سے یلغار ہونے والی ہے، تو وہ لوگ اندھیرے ہی میں حفاظت کے طور پر اپنی جگہ چھوڑ کر نکل جاتے تھے۔ یہاں اندھیرے میں نکل جانے سے مراد یہ ہے کہ جو آخرت کا خوف رکھتا ہے، وہ رات کو اُٹھ کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت میں مشغول ہوگا، اور جو اس میں مشغول ہوگا وہ اپنی

منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔

پھر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کا سرمایہ بڑا قیمتی ہے یعنی جنت۔ گویا اللہ تعالیٰ نے جنت کو ہمارے سامنے بکاؤ مال بنا کر رکھا ہے کہ جنت کو خریدو۔ اور جنت کی قیمت اللہ تعالیٰ نے ہماری جان اور مال کو رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے ان کی جان اور مال کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا ہے، گویا جنت سودے کی چیز ہے۔ جو سامان آدمی فروخت کرنے کے لئے نکالتا ہے؛ اس کو "سِلْعَةٌ" کہتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا سامان بڑا قیمتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا سامان جنت ہے، اس کو حاصل کرنے کے لئے مشقت و محنت اُٹھانی چاہیے۔

معاملہ اتنا سخت ہوگا......

۴۱۱- وعن عائشة رضی اللہ عنہا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلاً. قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! الرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ جَمِيْعًا يَنْظُرُ بَعْضُهُمْ إِلىٰ بَعْضٍ؟ قَالَ: يَا عَائِشَةُ! الأَمْرُ أَشَدُّ مِنْ أَنْ يُهِمَّهُمْ ذٰلِكَ.

وَفِيْ رِوَايَةٍ: اَلأَمْرُ أَهَمُّ من أَنْ يَنْظُرَ بَعْضُهُمْ إِلىٰ بَعْض. (متفق عَلَيْهِ)

(غُرْلاً) بِضَمِّ الْغَيْنِ الْمُعْجَمَةِ أَيْ: غَيْرَ مَخْتُوْنِيْنَ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ لوگ قیامت کے دن اس حال میں اُٹھائے جائیں گے کہ وہ ننگے پیر، ننگے بدن، بغیر ختنہ کئے ہوئے ہوں گے۔ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مرد اور عورتیں سب اس حال میں ہوں گے تو وہ ایک دوسرے کو دیکھیں گے نہیں؟ (یعنی شرم نہیں آئے گی؟) تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے عائشہ! اس وقت معاملہ اتنا سخت اور اہم ہوگا کہ وہ ایسی باتیں سوچ ہی نہیں سکیں گے کہ ایک دوسرے کی طرف نظر اٹھائیں۔

بَابُ الرَّجَآءِ

اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کا بیان

﴿مجلس ۱﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَ نَسۡتَعِیۡنُہٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ. صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا کَثِیۡرًا. أما بعد:-

أَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِھِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا اِنَّہٗ ھُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ. (الزمر:۵۳)

وقَالَ تعالیٰ: وَھَلۡ نُجَازِیۡ إِلَّا الۡکَفُوۡرَ. (سبأ:۱۷)

وقَالَ تعالیٰ: إِنَّا قَدۡ أُوۡحِیَ إِلَیۡنَا أَنَّ الۡعَذَابَ عَلٰی مَنۡ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی. (طہ:۴۸)

وقَالَ تعالیٰ: وَرَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ. (الاعراف:۱۵۶)

امید اور خوف

علامہ نوویؒ نے نیا عنوان قائم کیا ہے "باب الرجآء" امید کا بیان۔ دو چیزیں ہیں؛ ایک امید، اور دوسری خوف اور ڈر۔ آدمی کا ایمان مکمل ہونے کے لئے دونوں کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید بھی ہونی چاہیے، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے بھی رہنا چاہیے۔ اسی لئے علماء نے لکھا ہے "اَلۡإِیۡمَانُ بَیۡنَ الۡخَوۡفِ وَالرَّجَاءِ" ایمان امید اور خوف کے درمیان میں ہے۔ صرف امید ہی امید ہو، خوف اور ڈر نہ ہو؛ تب بھی آدمی مؤمن نہیں رہتا۔ اور خوف ہی خوف ہو، امید نہ ہو؛ تب بھی آدمی کا ایمان باقی نہیں رہتا ﴿إِنَّہٗ لَا یَیۡأَسُ مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰہِ إِلَّا الۡقَوۡمُ الۡکَافِرُوۡنَ﴾ (یوسف۸۷) اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہی لوگ ناامید

ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔ مؤمن کے ایمان کے لئے دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔

دنیوی دستور بھی ہے

ویسے دنیا میں بھی دستور یہی ہے کہ آدمی کو کسی کام کے لئے ابھارنے والی یا کسی برائی سے روکنے والی دو ہی چیزیں ہوسکتی ہیں امید وخوف۔ کسی بھی چیز کے مطالبہ پر- چاہے وہ کسی کام کو کرنے کا ہو، یا کسی چیز سے بچنے کا ہو- فطری اور نفسیاتی طور پر آدمی کو ابھارنے کے لئے دو ہی چیزیں مؤثر ثابت ہوتی ہیں، ایک جلبِ منفعت، اور دوسری دفعِ مضرت۔ اس کو کوئی فائدہ حاصل ہونے کی توقع اور امید ہو، یا کسی نقصان کا ڈر ہو؛ تب ہی وہ حرکت میں آئے گا۔

شریعت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام دیئے گئے ہیں، انسان کو جن کا پابند و مکلف بنایا گیا ہے، ان میں بھی دو طرح کے احکام ہیں، کچھ چیزیں کرنے کی ہیں اور کچھ چیزیں بچنے کی ہیں، کچھ مامورات ہیں اور کچھ منہیات ہیں۔ جو کرنے کی چیزیں ہیں ان کے کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے امیدیں دلائی گئیں ہیں؛ اسی کو وعدہ کہتے ہیں۔ اور بچنے کی چیزوں سے اگر کوئی آدمی نہیں بچتا تو اس کو ڈرایا گیا ہے؛ اسی کو وعید کہتے ہیں۔ اور ایمان کے کمال کے لئے ان دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی امید وخوف

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقولہ ہے کہ اگر یہ اعلان ہو جائے کہ سوائے ایک آدمی کے سب کی مغفرت کر دی گئی؛ تو مجھے اپنے متعلق یہ ڈر ہوگا کہ شاید وہ ایک میں ہوں جس کی مغفرت نہیں کی گئی، گویا ان کو اتنا ڈر اور خوف ہے۔ اور اگر یہ اعلان ہو جائے کہ سوائے ایک آدمی کے سب کے لئے جہنم کا فیصلہ کیا گیا ہے، تو مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید

ہے کہ وہ ایک مَیں ہی ہوں۔ گویا امید بھی اتنی زیادہ ہے۔ (احیاء العلوم ۴/ ۱۷۳)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نصیحت

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادہ سے فرمایا کہ ڈر تو ایسا رکھو کہ ساری دنیا کے لوگوں کے برابر نیکی لے کر جاؤ، تب بھی یہ ڈر رہو کہ شاید وہ قبول نہ ہو۔ اور امید ایسی رکھو کہ سب کے برابر گناہ لے کر جاؤ، تب بھی یہ گمان ہو کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقولہ ہے کہ کوئی گناہ کا کام چھوٹا سمجھ کر کر و مت، اور کوئی نیکی کا کام چھوٹا سمجھ کر چھوڑ و مت۔ ہوسکتا ہے کہ وہ نیکی کا کام جو آپ نے چھوٹا اور معمولی سمجھ رکھا ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں وہی کام آپ کی مغفرت کا سبب اور ذریعہ بن جائے۔ اور جس گناہ کے کام کو معمولی سمجھ کر کیا ہے، ہوسکتا ہے وہی پکڑ کا ذریعہ بن جائے۔

دودھ والی رات یاد ہے؟

ایک بزرگ کا انتقال ہوا، کسی نے ان کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ انہوں نے کہا کہ مجھے باری تعالیٰ کے حضور پیش کیا گیا اور یہ سوال کیا گیا کہ ہمارے پاس کیا لے کر آئے ہو؟ مَیں نے اپنے اعمال پر نظر دوڑائی اور سوچا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ ایسا کون سا عمل ہے جس کو باری تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کروں، ہر عمل کے متعلق مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کوئی بھی عمل ایسا نہیں ہے جو باری تعالیٰ کے حضور پیش کرنے کے قابل ہو۔ پھر مَیں نے یہ سوچا کہ توحید البتہ ایک ایسا عمل ہے جو پیش کیا جاسکتا ہے۔ (توحید کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو بھی ایک مانا جائے،

اور اس کی تمام صفات میں بھی اسی کو یکتا سمجھے۔ نفع ونقصان کا مالک بھی اللہ تعالیٰ ہی کو مانے کہ اس کے علاوہ کوئی نفع ونقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اور بہت ساری چیزیں اس میں آجاتی ہیں۔) تو ان بزرگ نے جواب دیا کہ توحید لے کر آیا ہوں۔ وہاں سے کہا گیا کہ وہ دودھ والی رات یاد ہے؟ ہوا یہ تھا کہ انہوں نے ایک رات دودھ پیا، اور پیٹ میں کچھ درد ہوا تو ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ دودھ پینے کی وجہ سے پیٹ میں درد ہوا ہے، حالانکہ وہ درد تو اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے ہوا تھا، لیکن ظاہری سبب کے طور پر آدمی ایسا بول دیتا ہے۔ اسی طرح ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا تھا، اس پر پکڑ ہوگئی۔ بظاہر یہ جملہ توحید کے خلاف ہے کہ پیٹ کے درد کی نسبت دودھ پینے کی طرف کی گئی، حالانکہ پیٹ کا درد دینے والی ذات بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ اب تو وہ بزرگ ڈر گئے کہ پکڑ ہوگئی، اب معلوم نہیں چھٹکارا کیسے ہوگا۔

پھر وہاں سے کہا گیا کہ جاؤ! بلی کے ایک بچہ کی وجہ سے ہم نے تم کو بخش دیا۔ ہوا یہ تھا کہ ایک مرتبہ ٹھنڈی کی ایک رات کے اندر وہ اپنے گھر سے باہر نکلے، دیکھا کہ بلی کا ایک بچہ ٹھنڈی کی وجہ سے ٹھٹھر رہا ہے، ان کو اس پر ترس آگیا، وہ اس کو اپنے گھر میں لے آئے اور انگیٹھی کے پاس بٹھایا، جب اس کو گرمی پہنچی تو اس کو ٹھنڈی کی وجہ سے جو تکلیف تھی وہ دور ہوگئی، پھر جب اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ خود ہی چلا گیا۔ ان کا وہ عمل باری تعالیٰ کو پسند آگیا تو وہاں سے کہا گیا کہ اس عمل کی وجہ سے ہم نے تم کو بخش دیا۔ دیکھو! ان کے سارے عمل دھرے کے دھرے رہ گئے اور ایک چھوٹا سا عمل کارآمد بن گیا۔

کتے پر ترس کھانا کام آگیا

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایک زانیہ فاحشہ عورت تھی، ایک مرتبہ سفر میں کہیں

جارہی تھی، دورانِ سفر جنگل میں پیاس کا احساس ہوا، دیکھا کہ بغیر منڈیر کا ایک کچا کنواں ہے، اور جو کنواں کچا ہوتا ہے اس میں نیچے پانی تک پہنچنے کے لئے دیوار میں پالے بنے ہوئے ہوتے ہیں، کوئی اندر اترنا چاہے تو ان کے ذریعہ سے اُتر سکتا ہے۔ وہاں کوئی ڈول اور رسی تو تھی نہیں، اس لئے اس نے اندر اتر کر پانی پی لیا، پھر جب وہ باہر نکلی تو دیکھا کہ ایک پیاسا کتا وہاں کھڑا ہے اور پیاس کی شدت کی وجہ سے گیلی مٹی چاٹ رہا ہے۔ اس عورت نے سوچا کہ پیاس کی جس شدت کو میں بھگت چکی ہوں، اور اس کی وجہ سے جو تکلیف مجھے پیش آئی تھی، یہ کتا بھی اسی مشقت سے گذر رہا ہے، اس کو کتے پر ترس آیا اور وہ دوبارہ نیچے اتری، اس کے پاس چمڑے کا موزہ تھا، اس میں پانی لیا اور چونکہ دونوں ہاتھ اوپر چڑھنے کے واسطے استعمال کرنے تھے، اس لئے اس موزہ کو اپنے منہ میں دانتوں سے دبایا اور اوپر آ کر کتے کو پانی پلایا۔ اسی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مغفرت کردی گئی (بخاری شریف، ۳۴۶۷) دیکھنے میں وہ عمل چھوٹا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو قبول کرلیا۔

گناہ کی حقیقت

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کسی گناہ کو چھوٹا سمجھتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ گناہ کوئی بھی ہو، وہ چھوٹا نہیں ہے۔ کیونکہ گناہ کی حقیقت ہی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے، اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ وہ نافرمانی کس ذات کی ہے؟ جو شخصیت اور ذات جتنی اونچی اور جتنی عظمت والی اور جتنی صاحبِ وقعت ہوتی ہے؛ اس کی مخالفت، حکم عدولی اور اس کی نافرمانی اسی مناسبت سے اتنی ہی زیادہ سخت سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی معمولی آدمی ہے، اگر اس کی کوئی بات نہ مانی جائے تو کوئی بڑی بات نہیں سمجھی جاتی اور اگر بادشاہِ وقت کسی معمولی چیز کا بھی حکم دے، اگر اس کے اس حکم میں اس کی نافرمانی کی

جائے تو یہ بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔اسی طرح کوئی بھی گناہ چاہے کبیرہ ہو یا صغیرہ؛ اس کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔

کبیرہ اور صغیرہ کی بحث

ویسے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ گناہوں میں کبیرہ اور صغیرہ کی تقسیم بھی ہے یا نہیں؟ علماء کے یہاں اس مسئلہ میں باقاعدہ بہت کچھ گفتگو ہوئی ہے، اور اس موضوع پر مستقل بحث کی گئی ہے۔ بعض حضرات تو اس طرف گئے ہیں کہ تمام گناہ کبیرہ ہی کبیرہ ہیں، کوئی گناہ صغیرہ نہیں۔ اور اس کی وجہ وہ حضرات یہ بیان فرماتے ہیں کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے، اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی عظمت، اس کی کبریائی اس کی بڑائی جیسی ہے، اس کے مقابلہ میں کوئی آدمی چھوٹی سی بھی نافرمانی کرے گا تو وہ معمولی نہیں سمجھی جائے گی، بلکہ اس کو بڑا ہی کہا جائے گا۔ اسی بنیاد پر اہلِ علم میں سے بہت سے حضرات یہ فرماتے ہیں کہ کوئی بھی گناہ صغیرہ نہیں ہے، تمام گناہ کبیرہ ہی ہیں۔

لیکن علماء کی ایک بڑی جماعت قرآن وحدیث کے نصوص کو سامنے رکھ کر اس طرف گئی ہے کہ گناہوں میں تقسیم ہے، بعض کو صغیرہ کہا جائے گا اور بعض کو کبیرہ کہا جائے گا، قرآن وحدیث کے مطالعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ قرآنِ پاک میں ہے ﴿إِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ﴾(النسآء:۳۱) اور احادیث میں بھی مختلف حدیثوں میں یہ بات آتی ہے، ان کو سامنے رکھ کر ایسے حضرات نے جن کی بات تمام اہلِ علم کے یہاں قابلِ قبول ہے یہی فرمایا ہے کہ گناہوں میں صغیرہ اور کبیرہ کی تقسیم ہے، یہ اور بات ہے کہ صغیرہ گناہ پر بھی آدمی اصرار کرے یعنی اس کو کرتا رہے تو وہ کبیرہ بن جاتا ہے۔

بلی پر ظلم نے پکڑوا دیا

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حدیثِ پاک میں یہ قصہ آتا ہے کہ ایک عورت نے ایک بلی پال رکھی تھی، اور اس کو جو خوراک دینی چاہیے وہ دیتی نہیں تھی، اور اس کو باندھ کر رکھا ہوا تھا اگر اس کو کھلی چھوڑ دیتی تو کم سے کم وہ خود ہی اِدھر اُدھر جا کر اپنی غذا فراہم کر لیتی اور اپنا گذارا کر لیتی، لیکن وہ بھی نہیں کیا اور باندھے رکھا، اس لئے وہ خود بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی، اور یہ خود اس کو غذا نہیں دیتی تھی اسی میں وہ ہلاک ہوگئی۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس عورت کو جہنم میں ڈالا (بخاری شریف، ۲۳۶۵) حالاں کہ دیکھنے میں تو یہ ایک معمولی سی چیز ہے۔ تو میں نے حضرت عائشہؓ کا مقولہ نقل کیا تھا کہ کسی نیکی کو چھوٹا سمجھ کر چھوڑ و مت، اور کسی گناہ کو معمولی سمجھ کر کرو مت۔

نیکی کی مجھے بھی ضرورت ہے

خود نبی کریم ﷺ کی سیرت اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات کا اگر ہم مطالعہ کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیکیوں کے حریص تھے، جیسے ہم لوگ پیسوں کے حریص ہیں جس طرح بھی کوئی نیکی ہاتھ آ سکتی ہو، اس موقع کو چھوڑنے کے لئے وہ حضرات تیار نہیں ہوتے تھے۔ حدیثِ پاک میں خود نبی کریم ﷺ کا قصہ ہے۔ آپ ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب سفر میں ہوتے۔ اور آپ حضرات بھی جانتے ہیں کہ دورانِ سفر کھانا وغیرہ پکانے کی نوبت آتی ہے، تو رفقاء آپس میں کام کو تقسیم کر لیتے ہیں۔ تو نبی کریم ﷺ بھی اپنے ذمہ کوئی کام لے لیتے تھے، صحابۂ کرام عرض کرتے کہ اے اللہ کے رسول! ہم کر لیں گے، تو نبی کریم ﷺ جواب میں ارشاد فرماتے کہ تم مجھ سے زیادہ قوی نہیں ہو۔ کبھی کسی دوسرے کا کوئی کام اپنے ذمہ لینے کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ بے چارہ کمزور

ہے اور کام کر نہیں سکے گا اس لئے سوچتے ہیں کہ چلو ہم اس کا کام کر دیں۔ تو حضور ﷺ فرماتے کہ تم مجھ سے زیادہ قوی نہیں ہو۔ اور کبھی آدمی یہ سوچتا ہے کہ اس کا کام کر کے نیکی حاصل کر لوں، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ نیکی کی مجھے بھی ضرورت ہے۔

معمولی گناہ سے بھی بچو

اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ کسی نیکی کے کام کے لئے ترغیب دی جائے تو نعوذ باللہ بعض لوگ تو بڑی بے باکی اور جرأت کے ساتھ بول دیتے ہیں کہ ہمارے پاس بہت ساری نیکیاں ہیں یعنی ایسے جملے اپنی زبان سے نکالتے ہیں جس سے اس نیکی کی طرف سے ایک طرح کی بے رغبتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ بڑا خطرناک پہلو ہے۔

بات چل رہی تھی کہ نیکی اور گناہ کے سلسلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ ارشاد ہے کہ کسی بھی نیکی کو چھوٹا سمجھ کر چھوڑ و مت، اور کسی بھی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر کرو مت، بخاری شریف میں روایت ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ﴿إِيَّاكُمْ وَمُحَقَّرَاتُ الذُّنُوبِ﴾ (شعب الایمان، ۶۸۸۱) چھوٹے چھوٹے گناہ، جن کو تم معمولی سمجھتے ہو؛ ان سے بھی بچو، یعنی معمولی سمجھ کر ان کو مت کرو۔ اور میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ایمان کی بنیاد ان دونوں چیزوں - امید اور خوف - پر قائم ہے۔

امید کسے کہتے ہیں؟

یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ امید کو بیان کرنے جا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید رکھنی چاہیے، اور امید کے سلسلہ میں قرآنِ پاک کی آیتیں اور احادیث پیش کریں گے۔ لیکن امید کے سلسلہ میں آیات اور احادیث کو سننے سے پہلے ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ امید کس کو کہتے ہیں۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ہم لوگوں نے تو

امید کا مطلب یہ سمجھ رکھا ہے کہ بے باکی سے گناہ کرتے رہو، اور اگر کوئی سمجھائے کہ بھائی! یہ بڑا سخت گناہ ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے۔ بس! ایک جواب یاد کر رکھا ہے اور وہی جملہ ہماری زبانوں پر چڑھا رہتا ہے۔ اس لئے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر یہ یقین بھی ہو کہ سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے تب بھی یہ طریقہ بالکل درست نہیں ہے۔

ایک مثال

یہ تو ایسا ہی ہوا کہ ایک آدمی چھری لے کر اپنے ہاتھ کو کاٹ رہا ہے، جب آپ نے اس کو دیکھا تو کہا کہ بھائی! یہ کیا کر رہے ہو؟ تو وہ کہتا ہے کہ میرے پاس بہت اعلیٰ قسم کا مرہم ہے، کیسا ہی خطرناک زخم کیوں نہ ہو، وہ لگاتے ہی ٹھیک ہو جاتا ہے، اس لئے میں چھری لے کر ہاتھ کاٹنے بیٹھا ہوں۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ ایسے آدمی کے متعلق آپ کیا فیصلہ کریں گے؟ اس سے کہا جائے گا کہ تمہاری بات ٹھیک ہے کہ اس مرہم سے ایک دو سیکنڈ میں زخم ٹھیک ہو جاتا ہے، لیکن یہ مرہم تمہارے پاس ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم چھری لیکر ہاتھ اور جسم کاٹنے کے لئے بیٹھ جاؤ، بلکہ مرہم کا مطلب تو یہ ہے کہ خدانخواستہ اگر کبھی کسی حادثہ کا شکار ہو جائیں تو ایمرجنسی میں آپ کا یہ مرہم کام دے سکتا ہے۔ باقی اس کا مطلب کوئی بھی یہ نہیں سمجھتا کہ اگر ایسا مرہم پاس ہے تو چھری لے کر اپنے جسم کو کاٹنے بیٹھ جائیں اور پھر اس مرہم کو زخم پر لگاتے رہیں۔ یہ عقلمند اور دانشمند لوگوں کا کام نہیں ہے۔ ایسی حرکت تو ممکن ہے کہ بچے کر لیں، باقی کوئی بڑا آدمی تو ایسا نہیں کر سکتا۔ بہر حال! اگر یہ گارنٹی اور یقین مل بھی جائے کہ ہمارے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے تب بھی آدمی گناہوں کے اوپر جرأت نہ کرے۔

مؤمن کے ایمان کا تقاضہ

آپ نے فضائلِ نماز کی تعلیم میں پڑھا اور سنا ہوگا کہ نماز کی وجہ سے آدمی کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ وہاں علماء نے لکھا ہے کہ احادیث میں جہاں بھی ایسے اعمال سے گناہوں کا معاف ہونا آیا ہے اس سے صغیرہ گناہ مراد ہیں، کبیرہ نہیں۔ کبیرہ کے متعلق تمام علماء یہی لکھتے ہیں کہ وہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے۔ ویسے احادیث میں مطلق آیا ہے کہ گناہ معاف ہوجائیں گے، جیسے "مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيْمَاناً وَّ إِحْتِسَاباً غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ (بخاری شریف، ۱۸۰۲)" اسی طرح اور بھی اعمال کے متعلق احادیث موجود ہیں، وہاں مطلق گناہ کی معافی کا کہا گیا ہے، لیکن علماء نے اس کو صغیرہ کے ساتھ مقید کیا ہے۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والدِ محترم حضرت مولانا یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے ایک بات لکھی ہے کہ یہاں صغیرہ کی قید اس وجہ سے بھی لگائی جاتی ہے کہ ایک مؤمن کے ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی طرف سے کوئی کبیرہ گناہ تو پیش آہی نہیں سکتا، البتہ اس سے صغائر کا صدور ہوسکتا ہے، اس لئے ان اعمال سے وہ معاف بھی ہوجاتے ہیں اور اگر کبھی کسی وجہ سے اس سے کوئی کبیرہ گناہ ہوگیا تو اس کو اس وقت تک چین ہی نہیں آئے گا جب تک کہ توبہ کر کے اور رو دھو کر اس گناہ کو معاف نہ کرالے۔ گویا اس کے نامۂ اعمال میں کبائر تو ہوں گے ہی نہیں، ہاں! صغائر ہوں گے تو وہ ان عبادتوں سے معاف ہوجایا کریں گے۔

خیر! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ہمیں گناہوں کی معافی کی گارنٹی بھی مل جائے، تب بھی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی جان بوجھ کر گناہ کرے۔

امید رکھنا کسے کہتے ہیں؟

دوسری بات یہ ہے کہ امید رکھنا کس کو کہتے ہیں؟ اور ہم نے جو یہ انداز اختیار کر رکھا ہے کہ گناہ کرتے رہو اور یہ کہتے رہو کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بڑی وسیع ہے، اللہ تعالیٰ رحم کرنے والے اور معاف کرنے والے ہیں۔ تو جو آدمی ایسی بات کرتا ہے اسی سے یہ سوال کیا جائے کہ بھائی! اگر کسی کافر اور مشرک سے آپ کی ملاقات ہو، اور آپ اس کو ایمان کی دعوت دیں کہ ایمان لے آؤ، ورنہ ہمیشہ ہمیش جہنم میں جلنا پڑے گا اس کے جواب میں وہ مشرک اگر آپ سے یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت بڑی وسیع ہے؛ تو کیا اس کے اس جواب کو آپ تسلیم کرلیں گے؟ بالکل نہیں! بلکہ آپ اس سے یوں کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم تو ضرور ہے، لیکن اس کی مغفرت اور رحمت جن لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، اس کے لئے بھی خود اللہ تعالیٰ ہی نے کچھ اصول بتلائے ہیں اور اس میں سب سے پہلی بات یہ کہہ دی گئی ہے ﴿إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَالِكَ لِمَن يَشَآءُ﴾ (النسآء:۳۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے، اس کو تو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا، البتہ اس کے علاوہ دوسرے گناہوں کو جس کو چاہے گا اللہ تعالیٰ معاف کردے گا۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت کے اصول

پہلی آیت جو یہاں پیش کی ہے اس کے شانِ نزول میں جو باتیں کہی جاتیں ہیں اس کے ذیل میں بھی یہ آیت آتی ہے ﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ اِنَّ اللهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ (الزمر:۵۳) اے نبی! آپ کہہ دیجئے: اے میرے وہ بندو جنہوں نے گناہ کرکے اپنی

جانوں پر ظلم وزیادتی کی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف کردے گا، بیشک وہی معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اس آیت کے سلسلہ میں بھی مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآنِ پاک میں سورۂ فرقان میں باری تعالیٰ کی طرف سے یہ آیتیں نازل ہوئیں ﴿وَالَّذِيْنَ لَايَدْعُونَ مَعَ اللهِ إِلٰهاً آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ وَمَن يَفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ أَثَاماً﴾ (الفرقان:۶۸) وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے، اور کسی کو ناحق قتل نہیں کرتے، اور زنا کا بھی ارتکاب نہیں کرتے، ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ آیتیں جب مشرکین کے پاس پہنچیں، خاص کر حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کے پاس جنہوں نے اپنے زمانۂ کفر وشرک میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا، بعد میں تو وہ ایمان لے آئے تھے، تو انہوں نے کہا کہ ہم تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر وشرک کیا ہے، اور بہت سارے لوگوں کو قتل بھی کیا ہے، اور دوسرے بہت سارے گناہ کئے ہیں؛ اب ہمارے لئے تو معافی کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی، اس پر آیت نازل ہوئی ﴿إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَالِكَ لِمَن يَشَآءُ﴾ (النسآء:۳۱) جب یہ آیت لکھ کر مکہ والوں کے پاس بھیجی گئی تو انہوں نے کہا کہ اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے مغفرت کو اپنی مشیت پر موقوف رکھا ہے، گویا اس میں ان کو دعوت دی گئی ہے کہ تم ایمان لے آؤ انہوں نے کہا کہ ایمان لانے کے بعد بھی تو اللہ تعالیٰ نے دوسرے گناہوں کے متعلق یہی فرمایا ہے کہ جس کو چاہیں گے معاف کریں گے اور اگر اللہ تعالیٰ نے ہمارے متعلق نہیں چاہا تو ہمارا کیا ہوگا؟ اس پر آیت نازل ہوئی جس میں کہا گیا کہ اے میرے وہ بندو! جنہوں نے کفر وشرک اور دوسرے گناہوں کا ارتکاب کرکے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف کردے گا، بیشک وہ معاف

کرنے والا رحم کرنے والا ہے، اس کے بعد وہ ایمان لے آئے۔ (تفسیر قرطبی، سورۂ زمر)

خیر! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کسی کافر و مشرک کو آپ ایمان کی دعوت دیں اور وہ جواب میں یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے، تو آپ اس سے صاف طور پر یہ کہیں گے کہ بھائی! یہ مغفرت اور رحمت تمہیں ملنے والی نہیں ہے، بلکہ اس کا بھی ایک اصول ہے، اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور معافی کے لئے بھی کچھ قوانین ہیں، کافر کے لئے تو پہلا ہی قانون یہ ہے کہ جب تک وہ کفر چھوڑ کر اسلام و ایمان قبول نہ کرلے، وہاں تک تو وہ اس کا حقدار ہی نہیں بنتا۔ اسی طرح اہلِ ایمان کے حق میں بھی کچھ قاعدے بتائے گئے ہیں۔

کس کے اعمال تولے جائیں گے؟

جیسے قیامت میں اہلِ ایمان کے نامۂ اعمال کو تولا جائے گا۔ دیکھو! کافروں کے اعمال نہیں تولے جائیں گے، ان کے لئے تو کفر کی وجہ سے سیدھا ہی جہنم کا فیصلہ سنا دیا جائے گا۔ اس لئے یہ بھی ایک بحث ہے کہ کس کے اعمال تولے جائیں گے؟ اکثر علماء یہی لکھتے ہیں کہ اہلِ ایمان ہی کے اعمال تولے جائیں گے، اس لئے کہ وہ اپنے ایمان کی وجہ سے جنت کے مستحق بن چکے ہیں، لیکن گناہ نے ان کا معاملہ ذرا کھٹائی میں ڈال دیا ہے، تو اب وہاں ان کے اعمال تول کر یہ دیکھا جائے گا کہ اس میں نیکیاں کتنی ہیں اور گناہ کتنے ہیں۔ اگر گناہوں کا پلڑا غالب ہے تو سزا کے لئے جہنم میں بھیجا جائے گا اور سزا بھگتنے کے بعد مؤمن ہونے کی وجہ سے جنت کا فیصلہ ہوگا، اور اگر نیکیاں غالب ہیں تو اس صورت میں شروع ہی سے اس کو جنت میں بھیجا جائے گا۔ بہر حال! اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا اصول اور قانون بتایا ہے، اس لئے جو لوگ گناہ کر کے یوں کہتے ہیں

کہ اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے، ان کا یہ کہنا درست نہیں ہے۔

کسی کو عمل جنت میں داخل نہیں کرائے گا

اچھا! یہ تو گنہگاروں کی بات ہوئی۔ لیکن جو لوگ دیندار ہیں اور نیکی کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ سے امید رکھنے کے معاملہ میں غلو سے کام لیتے ہیں اور وہ اس طرح کہ جو اعمال ہمیں کرنے کے لئے کہا گیا ہے جیسے نماز، روزہ وغیرہ کا اہتمام کرنا، یا گناہوں سے بچنا؛ ان اعمال کے بعد بھی اصل تو یہ ہے کہ آدمی کے لئے جنت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بخاری شریف میں روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک روز ارشاد فرمایا: ''لَنْ یُّدْخِلَ أَحَدَ کُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ'' تم میں سے کسی کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرائے گا۔ حضراتِ صحابہ نے عرض کیا: ''وَأَنْتَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟'' اے اللہ کے رسول! آپ بھی؟ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وَأَنَا، إِلاَّ أَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِهٖ'' میں بھی؛ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ لیں (بخاری شریف، ۵۶۷۳)
جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے لئے یہ فرماویں تو پھر دوسروں کے لئے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی ان لوگوں کے لئے ہے جو اعمال کا اہتمام کرتے ہیں، اور جو لوگ اعمال کا اہتمام ہی نہیں کرتے اور گناہوں میں مست رہتے ہیں، ان کا تو جواب صاف ہو گیا۔

توفیق بھی اسی وقت ملتی ہے

اور جو لوگ اعمال کا اہتمام کرنے والے ہیں ان کے لئے بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ اپنے خیالات درست کرلیں، اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان اعمال کے اوپر جنت اور اس کی نعمتوں کے جو وعدے کئے ہیں وہ تمام صرف اللہ کے فضل سے ہی ملنے والے ہیں، اس لئے کہ جنت کے متعلق بھی بخاری شریف اور

تمام کتبِ احادیث میں موجود ہے کہ ایک ادنیٰ جنتی کو دنیا سے دس گنا بدلہ ملے گا، اور یہ بھی اس جنتی کو جو گرتا پڑتا جنت میں پہنچا ہوگا، جیسا کہ اس کا تفصیلی قصہ حدیث میں موجود ہے۔ ایک ادنیٰ اور معمولی جنتی کو دنیا سے دس گنا بدلہ ملے گا (بخاری شریف، ۶۵۶۱) اور حقیقت تو یہ ہے کہ سارے اعمال محض علامت ہیں، ورنہ آدمی کو جنت میں لے جانے والی اور جنت کی نعمتیں دلوانے والی چیز اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی ہے، اور وہی اصل ہے، اس کے اندر مؤثرِ حقیقی اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت شاملِ حال ہوگی تب ہی یہ رتبہ ملے گا۔ اور سیدھی بات تو یہ ہے کہ اعمال کی توفیق بھی اسی وقت ملتی ہے جب اللہ تعالیٰ کی رحمت شاملِ حال ہو، ورنہ جماعت کا کام کرنے والے بھی بہت سے احباب یہاں موجود ہیں جو لوگوں کے پاس جاتے ہیں اور لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھائی! مسجد میں آؤ، تو اس کو مسجد میں آنا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ سولی پر چڑھایا جارہا ہو، اتنی منت وسماجت کرنے کے بعد بھی وہ کیسے کیسے بہانے کر کے نکل جاتا ہے۔ کیا ان لوگوں نے مسجد میں اس کے لئے کوئی سولی کا تختہ تیار رکھا ہے جو وہ یہاں آنے سے ڈرتا ہے؟ یہاں آکر اس کو کیا کرنا ہے، صرف تھوڑی دیر کے لئے نماز ادا کرنی ہے، یا دین کی بات سن کر اللہ کو یاد کرنا ہے۔ سبحان اللہ کا جملہ آدمی اپنی زبان پر جو لاتا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی سے لاتا ہے۔

كُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ

حدیثِ پاک میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: ﴿كُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ﴾ (بخاری شریف، ۷۵۵۲) اللہ تعالیٰ نے جس کو جس کے لئے پیدا کیا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی توفیق بھی ملتی ہے، اور وہی کام اس کے لئے آسان بھی کیا جاتا ہے۔ دنیا میں

دونوں طرح کے لوگ ہیں، برے بھی ہیں اور اچھے بھی ہیں، برے لوگ برے کام کرتے ہیں، قتل کرتے ہیں، لوٹ چلاتے ہیں، اور گناہ کے بڑے بڑے خطرناک کام کرتے ہیں، اور وہ ان کاموں کو آسانی کے ساتھ انجام دے لیتے ہیں، اس لئے کہ ان کے لئے وہی کام طے ہوا ہے، لہٰذا ان کو وہ کام انجام دینے میں کوئی دشواری بھی پیش نہیں آتی۔ وہی آدمی جو بڑی بے باکی کے ساتھ دس آدمیوں کو آسانی سے قتل کر سکتا تھا، اسی سے آپ لا الٰہ الا اللہ پڑھنے کو کہئے، یا اس سے کہئے کہ ہمارے ساتھ چار رکعات نماز پڑھنے کے لئے آؤ، تو اس کے لئے وہ بڑا مشکل ہو جائے گا۔ حالاں کہ ہم اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہیں لیکن وہ اس کو مشکل سمجھ رہا ہے، اس سے یہ ہو ہی نہیں رہا ہے۔

اور جو لوگ نیکی کے کام کرنے والے ہیں اور جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے اطاعت وفرمانبرداری لکھ دی ہے، نماز ادا کرتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، گناہوں سے بچتے ہیں، ان کو آپ معمولی سا گناہ کرنے کے لئے کہئے تو وہ تیار نہیں ہوں گے۔ قتل کرنا تو درکنار، صرف کسی کو ایک تھپڑ مارنے کو کہیے۔ اور وہ بھی چھوڑو، ان سے کہیے کہ فلاں کو صرف ایک گالی ہی دیدو، تو ہم تم کو سو روپے دیں گے۔ تو وہ کہے گا کہ ہزار بھی دو تب بھی مَیں گالی نہیں بولوں گا۔ حالانکہ دیکھنے کے اعتبار سے زبان پر گالی کا لانا صرف ایک جملہ ہے اور کوئی مشکل کام بھی نہیں ہے، لیکن جیسے پہلی قسم کے آدمی کو سبحان اللہ کہنا مشکل معلوم ہوتا تھا، یہ جملہ اس کو بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی کی بات ہے، اس لئے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت وفرمانبرداری کی اور اپنا نام لینے کی، نمازوں کا اہتمام کرنے کی اور دوسرے نیکی کے کام کرنے کی توفیق دی ہے، اور ساتھ ہی گناہوں سے بچنے کی توفیق دی ہے؛ تو ان کو چاہیے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہیں۔ مَیں آپ

سب سے یہی کہتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرما رکھی ہے، اب اس نعمت میں آپ زیادتی چاہتے ہیں تو بہت آسانی سے کر سکتے ہیں کہ اس کا شکر ادا کیا جا تا رہے: ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ باری تعالیٰ کا قرآنِ پاک میں وعدہ ہے کہ اگر تم شکر ادا کرو گے تو ہم تمہاری نعمتوں میں اضافہ کریں گے۔

اس پہلو پر بھی غور کیجیے

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جو لوگ نیکی کے کام کرتے ہیں وہ بھی اس معاملہ میں ذرا غلو سے کام لیتے ہیں۔ دیکھو! ہم میں سے بہت سے لوگ وہ ہوں گے جو نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، نیکی کے کام کرتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے متعلق یہ فیصلہ کئے بیٹھے ہیں کہ گویا جنت میں ہماری بکنگ ہو چکی ہے، اور ریزرویشن ہو گیا ہے، دوسرا پہلو تو ہم کبھی بھولے سے بھی نہیں سوچتے، حالاں کہ حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم وہ لوگ ہیں جن کو دنیا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے جنت کی بشارتیں سنائی گئیں، اس کے باوجود وہ حضرات ڈر رہے ہیں۔ نعوذ باللہ ایسا تو نہیں تھا کہ جنت کی جو بشارت ان کو زبانِ رسول سے دی گئی تھی اس پر ان کو اعتماد نہیں تھا؟ ایسا بالکل نہیں تھا، بلکہ پورا پورا یقین تھا لیکن اس کے باوجود عذاب کا ڈر اتنا غالب آ جاتا تھا کہ وہ سہم جاتے تھے۔

الہامی مثال

اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ کسی جگہ اونچائی کے اوپر دو فٹ چوڑا راستہ بنا ہوا ہو اور آپ سے کہا جائے کہ اس پر چلو، تو سیدھی بات ہے کہ راستہ دو فٹ چوڑا ہے، اور عام طور پر آدمی کو چلنے کے لئے دو فٹ سے زیادہ چوڑی جگہ نہیں چاہیے، لیکن جب وہ یہاں چلتا ہے تو کبھی اس کو ایسا خطرہ یا خیال آتا ہے کہ میں گر جاؤں گا؟ اور اونچائی پر دو

فٹ چوڑے راستہ پر چلنے کے لئے کہا جائے گا تو بعض تو پہلے سے ہی منع کر دیں گے، بعض ڈرتے ڈرتے چلیں گے کہ کہیں گر نہ جائیں، حالانکہ وہ اوپر جتنی جگہ پر چل رہا ہے اتنی ہی جگہ پر نیچے بھی چلتا ہے، لیکن نیچے جس طرح آسانی سے چلتا ہے اُس طرح اوپر نہیں چل سکتا۔ آخر ایسا کیوں؟ اس لئے کہ وہاں خوف غالب آجاتا ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اسی طرح ان حضرات کو بشارتیں سنائی گئی تھیں، پھر بھی وہ بہت زیادہ ڈرتے تھے۔ اس سے نعوذ باللہ یہ خیال پیدا نہ ہو کہ ان کے ایمان و یقین میں کمی تھی، ان کے جیسا ایمان تو کون پیش کر سکتا ہے، وہ تو پوری امت کے لئے نمونہ ہیں، لیکن دراصل اس بشارت کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کا خوف اتنا زیادہ غالب آجاتا تھا کہ یہ چیز نگاہوں کے سامنے رہتی ہی نہیں تھی۔ جیسے کسی دشمن نے حملہ کر دیا، اب اپنے پاس بھی کوئی ہتھیار موجود ہے لیکن دشمن کا خوف اتنا غالب آیا کہ وہ اپنا ہتھیار تو بھول ہی گیا۔ بعد میں کہتا ہے کہ ارے یار! مَیں تو اپنا ہتھیار بھول ہی گیا تھا، اگر ذرا سا بتلاتا تو وہ بھاگ جاتا۔ جیسے فارسی کا مقولہ ہے: ''مُشتے کہ بعد از جنگ یاد می آید، بر پُشتِ خود باید زد'' وہ مُکّا جو لڑائی کے بعد یاد آئے، وہ اپنی ہی پیٹھ پر مارنا چاہیے۔ جب آدمی کا کسی سے جھگڑا ہوتا ہے تو بعد میں وہ سوچتا ہے کہ مَیں یوں مارتا اور یوں کرتا اور توں کرتا۔ آدمی کی ذہنی سوچ ہوتی ہے، یہ سب ایسی ہی بے تکی باتیں ہیں، جب کام کا وقت تھا اس وقت تو ساری چوکڑیاں تم بھول بھال گئے تھے، اب ان خیالات کا کیا فائدہ ہے۔

ہمارا مزاج

خیر! جن حضرات کو یقین تھا اور جن کو بشارتیں سنائی گئی تھیں ان پر اللہ تعالیٰ کا

کتنا خوف غالب تھا۔ اور ہم لوگ جو اعمال کرتے ہیں اس کے نتیجہ میں ہم جس قسم کی امیدیں لئے بیٹھے ہیں، اور اپنے اوپر مکمل اعتماد کئے ہوئے ہیں، گویا ہم یوں سمجھتے ہیں کہ حضرت جبرئیل وحی لے کر آکر ہمیں کہہ چکے ہیں کہ جنت میں تمہاری فلاں سیٹ نمبر ہے، اور فلاں بنگلہ نمبر ہے۔ ہم تو اپنے متعلق ایسا ہی سمجھتے ہیں اور دوسروں پر تبصرے کرتے رہتے ہیں۔ آج کل ہمارا مزاج یہی بنا ہوا ہے، حالانکہ جنت میں جانے کا اصل مدار اعمال نہیں ہیں، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے متعلق یہی فرما رہے ہیں۔

اعمال کا ویلیوئیشن (valuation)

اور پھر جن اعمال پر جنت کے بدلہ کا وعدہ کیا گیا ہے تو پہلے ذرا یہ بھی دیکھو کہ وہ بدلہ ہمیں حق کے طور پر نہیں مل رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان اعمال کی وجہ سے ہمارا استحقاق ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ اگر ایسا ہی ہوتا تو ہمیں ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے اعمال کی حیثیت اور اس کی قیمت کیا ہے؟ ہمیں اپنے اعمال کا ویلیوئیشن (valuation) کر لینا چاہیے، اور اس کے مقابلہ میں ہمیں جو کچھ معاوضہ مل رہا ہے جس کا جنت میں وعدہ کیا گیا ہے؛ وہ کیا ہے؟ لہٰذا آئیے ہم اپنے اعمال کا جائزہ لیتے ہیں۔ دیکھو! ہم پورے چوبیس گھنٹے اللہ کی عبادت میں نہیں لگاتے بلکہ چوبیس گھنٹوں میں پانچ وقت کی فرض نمازیں جماعت کے ساتھ ادا کرتے ہیں، جماعت سے پانچ سات منٹ پہلے مسجد میں آتے ہیں، اور اگر اس سے پہلے آگئے تب بھی اندر آنے کی زحمت نہیں کرتے، یوں کہتے ہیں کہ ابھی تو جماعت میں بہت وقت باقی ہے، ذرا باہر ہی کھڑے رہو۔ نفس اور شیطان کیسا ہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ اندر آنے ہی نہیں دیتا، جن کو مسجد میں آنے کی توفیق ملی ہوئی ہے وہ بھی مسجد کے احاطہ میں آنے کے بعد جماعت خانہ میں داخل

نہیں ہوتے، اس لئے کہ اندر جانے کے بعد باتیں کرنے کا وقت نہیں ملے گا۔ ارے بھائی! اللہ تعالیٰ نے آنے کی توفیق دی ہے تو بیٹھ کر کچھ پڑھ لو، اگر دس پندرہ منٹ پہلے آ گئے تو کیا حرج تھا کہ وضو کر کے اندر آ جاتے اور سنتیں پڑھ کر جو پانچ سات منٹ بچ گئے ان میں کچھ تسبیح اور قرآنِ پاک وغیرہ پڑھ لیتے تو اس میں ہمارا کیا چلا جاتا؟ لیکن ہم ایسا نہیں کرتے اور باہر جوتے اتارنے کی جگہ پر ہی کھڑے رہتے ہیں، جب پانچ منٹ باقی ہوں گے تو اندر آ کر جلدی جلدی وضو کریں گے، اور جب جماعت کھڑی ہوگی تب ہی مسجد میں داخل ہو کر نماز میں شامل ہوں گے۔ یہ ایک الگ موضوع ہے جو یہاں شروع ہو گیا۔ ضمناً بات آ گئی تو اس پر تنبیہ کر دی۔

زندگی بھر کی محنت کی قیمت

خیر! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہم اللہ کی عبادت میں جو اوقات لگاتے ہیں ہمیں اس کا حساب کرنے کی ضرورت ہے کہ پانچوں وقت کی نماز میں ہمارا کل کتنا وقت لگتا ہے؟ پانچ وقت کی نماز میں کل ملا کر زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سے دو گھنٹے لگتے ہیں، اور ذرا خشوع وخضوع سے پڑھیں تو ڈھائی گھنٹے ہوں گے، اس سے زیادہ نہیں لگتے۔ اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہمارے اس ڈھائی گھنٹے کی قیمت ہمیں دنیا میں کیا مل رہی ہے؟ اس لیے کہ ہم صرف یہ نماز تو نہیں پڑھ رہے ہیں، اس کے علاوہ اوقات میں ہم اپنے کاروبار میں لگتے ہیں، تجارت والا تجارت میں لگتا ہے، سروس اور ملازمت والا اس میں لگتا ہے، تو اب یہ آدمی جو ملازمت اور سروس کر رہا ہے اس کو ڈھائی گھنٹے کی تنخواہ کتنی ملتی ہے؟ سب کو معلوم ہے کہ آٹھ سے دس گھنٹے ملازمت اور سروس کے ہوتے ہیں اور اس کی ماہانہ تنخواہ جو مقرر ہوتی ہے وہ مان لیجئے کہ تیس ہزار ہے۔ چلو مان لو کہ تیس ہزار نہیں

بلکہ تین لاکھ ہے، حالانکہ ایسے تو بہت کم لوگ ہوں گے کہ جن کو ماہانہ تین لاکھ تنخواہ ملتی ہو لیکن ہم زیادہ سے زیادہ ویلیو کے حساب سے تسلیم کرتے ہیں کہ ٹھیک ہے کوئی کسی ڈائنگ ہاوس میں بہترین ماسٹر ہے تو اس کو تین لاکھ تنخواہ ملتی ہے۔تو اب اس کو مہینہ کے جو تین لاکھ ملے تو ایک دن کے دس ہزار ہوئے، اور دن بھر کے وہ دس گھنٹے لگاتا ہے تو ایک گھنٹہ کے ایک ہزار ہوئے۔اب ہم روزانہ ڈھائی گھنٹے اللہ کے کام میں اور عبادت میں لگاتے ہیں تو ہمارے ڈھائی ہزار اس کام میں لگے۔اب ہم زندگی میں پندرہ سولہ سال کے بعد نمازیں پڑھنا شروع کرتے ہیں اور پچاس ساٹھ سال میں سے شروع کے پندرہ سال نکال کر روزانہ کے ڈھائی ہزار کے اعتبار سے حساب لگالو تو چار سے پانچ کروڑ روپے ہوں گے، اب میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ ان پانچ کروڑ سے پوری دنیا نہیں بلکہ سورت شہر کا سب سے اعلیٰ اور پوش ایریا جو کہلاتا ہے وہاں کتنے اسکویر فٹ زمین خرید سکتے ہیں؟ اور اس میں کیسا بنگلہ بنا سکتے ہیں؟ آج اس زمانہ میں سورت شہر کے سب سے پوش ایریا (Posh Area) میں بڑا بنگلہ تو ملنے سے رہا۔یہ ہماری زندگی بھر کی محنت کی قیمت ہوئی۔

زندگی بھر کے نقشوں کا نقشہ

اب آپ پوری دنیا کا نقشہ اُٹھا کر دیکھو کہ اس پوری دنیا کے نقشہ میں ہندوستان کہاں ہے، اور پورا ہندوستان پوری دنیا کا کتنا حصہ بنتا ہے؟ اور پھر اس ہندوستان میں گجرات کی کیا حیثیت رکھتی ہے؟ اور دنیا کے نقشہ میں شاید گجرات کا نام تو ملے گا لیکن سورت کا نام اس میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔اس کے لئے آپ کو دنیا کا نقشہ چھوڑ کر ہندوستان کا نقشہ نکالنا پڑے گا، دنیا کے نقشہ میں سورت کا وہ نقطہ تھا ہی نہیں،

ہاں! ہندوستان کے اس نقشہ میں سورت کا حصہ ایک نقطہ اور پوئنٹ کے برابر ملے گا، اور پانچ کروڑ میں جو جگہ آپ نے خریدی ہے، اس کی حیثیت اس ایک نقطہ اور پوئنٹ میں کیا ہوگی؛ اس کا آپ اندازہ لگا لیجئے۔ یہ تو سب سے بڑی ویلیو نکال کر ہم حساب کر رہے ہیں، کم تنخواہ والے اس حساب سے اپنا اپنا اندازہ نکال لیں۔

اور پھر یہ تو ہم صرف نماز کا حساب لگا رہے ہیں، دوسرے اعمال کا کیا حال ہے وہ تو ابھی ہم نے دیکھا ہی نہیں۔ اور ادنیٰ جنتی کو دنیا کا دس گنا ملنے والا ہے، تو پھر اوپر کے بڑے درجہ والوں کا تو کہنا ہی کیا۔ حالاں کہ ہم نے اس مثال میں دنیا کے اونچی سے اونچی تنخواہ والے کا حساب لگایا تھا۔

یہاں اور وہاں کا تقابل

اور پھر یہ تو صرف مقدار اور کوئنٹیٹی (Quantity) کی بات ہوئی ہے، حالانکہ کسی بھی چیز میں صرف مقدار ہی نہیں دیکھی جاتی، کوالٹی (Quality) بھی دیکھی جاتی ہے، اس لئے وہاں کے ادنیٰ اور یہاں کے اعلیٰ کا موازنہ نہ کرو کہ یہاں کے اعلیٰ بنگلہ کا مٹیریل (Material) کیا ہوسکتا ہے اور وہاں کے ادنیٰ بنگلہ کی کوالٹی کیسی ہوگی۔ یہاں کی چیزیں کیسی ہیں اور وہاں کی چیزوں کی کوالیٹی کیسی ہے۔ جنت کی صرف ایک حور کے متعلق حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ اس کا صرف دوپٹہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، اور اگر وہ حور سمندر میں صرف تھوک دے تو سمندروں کا سارا کھارا پانی میٹھا ہو جائے۔ حالانکہ سمندر کتنے بڑے ہیں؟ زمین کے مقابلہ میں سمندروں کا حصہ دو تہائی زیادہ ہے اور ابھی تو ہم نے صرف یہاں کے بنگلہ اور زمین کا تذکرہ کیا ہے، اس کے علاوہ یہاں تو دوسری چیزیں مثلاً ڈیکوریشن (Decoration) رنگ روغن اور فرنیچر وغیرہ کے پیسے

الگ ہوں گے، اور وہاں تو سب کچھ تیار ملے گا۔

اپنے اعمال پر کبھی بھروسہ نہ کرو

تو اب کیا کسی کو یہ کہنے کا حق ہے کہ جنت اور اس کی ساری چیزیں ہمیں اعمال کے بدلہ میں ملیں گی۔ بالکل نہیں۔ یہ تو دراصل اللہ تعالیٰ دینا چاہتے تھے اس لئے بہانہ کے طور پر ہم سے یوں کہا گیا کہ یہ اعمال کرلو تو تم کو یہ مل جائے گا۔ اس کو میں ایک مثال سے سمجھاتا ہوں کہ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ایک غریب فقیر آدمی مسجد کے دروازہ پر آپ کے پاس آیا، آپ اس کو کچھ رقم دینا چاہتے ہیں، اس کو آزمانے کے لئے آپ نے اس سے کہا کہ اگر تم یہاں سے چوک بازار تک پیدل جاؤ تو میں تم کو ایک ہزار روپے دوں گا ظاہر ہے کہ کوئی بھی یہی کہے گا کہ چوک بازار تک جانے کی جو شرط لگائی گئی ہے وہ اس کی قیمت نہیں ہے، بلکہ صرف آزمائش ہے، ورنہ تو یہ آدمی اس کو ایک ہزار روپے دینا چاہتا ہے، صرف بہانہ کے طور پر یہ بات کہی گئی ہے۔ اب وہ وہاں تک تو کیا جاتا بلکہ آپ کی اس سوسائٹی کے باہر چند قدم جا کر واپس آیا اور کہنے لگا کہ لاؤ! وہ ایک ہزار روپے دو۔ تو اس سے کیا کہا جائے گا؟ اسی طرح اعمال کا بھی حال ہے، ہمیں اپنے اعمال کی حیثیت اور قیمت دیکھ لینی چاہیے کہ اس کی قیمت اور حیثیت کیا ہے۔ آدمی اپنے اعمال پر کبھی بھی بھروسہ نہ کرے۔

با حضورِ دل نہ کردم طاعتے

اور پھر ہم جو نمازیں پڑھتے ہیں وہ کیسی ہیں وہ ہم ہی جانتے ہیں جیسا کہ میں نے مسجد میں آنے کا ہمارا طریقہ اور ڈھنگ بتلا دیا، اسی طرح اللہ اکبر سے جو نماز شروع کریں گے وہاں سے لے کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ تک کا ہمارا کیا حال ہوتا ہے؟ دل پر

ہاتھ رکھ کر بتلائیں کہ اس دوران دل کا کتنا دھیان نماز میں حاضر رہتا ہے اور کتنا غائب رہتا ہے۔ جس طرح آج کل ہر چیز آٹومیٹک (Automatic) ہوگئی ہے، اسی طرح ہماری نماز بھی آٹومیٹک (Automatic) ہو چکی ہے، اللہ اکبر سے شروع ہوتی ہے تو اس کے بعد سب کام برابر ہوتے ہیں، کوئی چیز چھوٹتی نہیں ہے، لیکن سلام پھیرنے کے بعد اسی سے پوچھیں کہ کون سی سورت پڑھی تھی، تو کہتا ہے کہ یاد نہیں ہے، حالاں کہ اس نے سورت پڑھی ہے، لیکن خود اسے ہی یاد نہیں، پہلے وہ سوچے گا، دماغ پر زور لگانا پڑے گا کہ کون سی سورت پڑھی تھی۔ یہ ہماری نماز کا حال ہے۔

شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب ''پندنامہ'' ہمارے یہاں مدارس میں پڑھائی جاتی ہے، اس میں انہوں نے بڑی اچھی بات ارشاد فرمائی ہے:-

بے گنہ نہ گذشت بر من ساعتے با حضورِ دل نہ کردم طاعتے

اے اللہ! کوئی گھڑی میرے اوپر بغیر گناہ کے نہیں گذری، اور کوئی عبادت میں نے دل کی حاضری کے ساتھ نہیں کی۔ اگر ہم سے قیامت میں پوچھ لیا جائے کہ ایک سجدہ ایسا لاؤ جو حضورِ دل کے ساتھ کیا ہو؛ تو کیا زندگی بھر کی نمازوں میں سے ہم وہ پیش کرنے کے قابل ہیں؟ بالکل نہیں۔ ہمارے اعمال کی حیثیت یہی ہے۔

اس دربار کے قابل ہیں یا نہیں؟

اور آپ دیکھیں گے کہ یہ اعمال کس ذات کے لیے کئے جاتے ہیں؟ عبادتیں تو اللہ تعالیٰ ہی کے لیے کی جاتی ہیں، ہمارا عقیدہ ہے کہ جو کام عبادات کے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور ذات کے لئے نہیں کر سکتے، اگر کسی اور کے لئے کئے جائیں گے تو وہ شرک کہلائے گا، لیکن آپ احادیث کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اکثر عبادتوں

کے بعد استغفار کے کلمات رکھے گئے ہیں، حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نماز کا سلام پھیرنے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زور سے تین مرتبہ استغفر اللہ پڑھتے تھے (سنن دارمی، ۱۳۴۸) اور نماز کے بعد کے جواذ کار بتائے جاتے ہیں ان میں استغفار بھی آتا ہے۔اسی طرح روزہ افطار کرنے کی دعا میں ہے: یَاوَاسِعَ الْفَضْلِ اِغْفِرْلِیْ (المعجم الاوسط ۷۷۳۸) وہاں بھی معافی مانگی جارہی ہے۔غور کرنے کی چیز ہے کہ صبح سے شام تک بھوکے رہے، اوراب معافی مانگی جارہی ہے؟ درحقیقت اس سے یہی بتلایا جارہا ہے کہ جو عبادت تم پیش کررہے ہو، وہ اُس دربار کے قابل بھی ہے یانہیں۔اسی لئے قرآنِ پاک میں اللہ کے نیک بندوں کا حال بتلایا گیا: ﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ آتَوْا وَقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ یہ وہ لوگ ہیں جو اس طرح اعمال کرتے ہیں کہ ان کے دل ڈرے سہمے رہتے ہیں۔اس پر کسی نے پوچھا کہ کیا گناہ کرتے ہوئے ڈرتے ہیں؟ تو فرمایا کہ نہیں! بلکہ نیکی کے کام کرکے ڈرے رہتے ہیں کہ معلوم نہیں؛ وہ اس دربار کے قابل ہیں بھی یانہیں، اور قبول بھی ہوتے ہیں یانہیں۔ (ترمذی شریف، ۳۱۷۵)

میں یہ عرض کررہا تھا کہ امید کے معاملہ میں جو دیندار لوگ ہیں وہ بھی غفلت سے کام لیتے ہیں، اس لئے صرف امید کا سبق پڑھ لینے سے کوئی کام نہیں بنتا۔اور دراصل مَیں امید کی حقیقت بتلانا چاہتا تھا۔آج وقت بھی زیادہ ہوچکا ہے، بقیہ باتیں ان شاءاللہ آئندہ مجلس میں ہوں گی۔

بَابُ الرَّجَآءِ

اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کا بیان

﴿مجلس ۲﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

امید کا بیان چل رہا تھا، گذشتہ مجلس میں امید کی حقیقت بتلائی تھی، اور یہ بھی بتلایا تھا کہ ہم جو اعمال انجام دیتے ہیں اور ان کے بل بوتے پر بڑی بڑی امیدیں باندھتے ہیں۔ حالاں کہ درحقیقت ہمارے اعمال کی قیمت ہی کیا ہے؟ اور ہمیں جو بھی وعدے کئے گئے وہ تمام اللہ تعالیٰ کے فضل ہی سے پورے ہوں گے جن میں ہمارے اعمال کا کوئی عمل دخل نہیں۔

فقیر اللہ تعالیٰ کا نائب ہے

اور دیکھو! عبادت تو خالص اللہ تعالیٰ کا حق ہے جو اس کے علاوہ کسی اور کے لیے انجام نہیں دی جاسکتی، اسی طرح صدقہ بھی دراصل عبادت ہی کی ایک قسم ہے۔ جو مال اللہ کے راستہ میں خرچ کیا جاتا ہے؛ وہ صدقہ کہلاتا ہے، اور وہ بھی عبادت ہے، اس لئے وہ بھی اللہ کے علاوہ کسی اور کی نیت سے آپ خرچ نہیں کرسکتے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے اور اصولِ فقہ کی کتابوں میں فقہاء لکھتے ہیں کہ آدمی جب زکوٰۃ ادا کرتا ہے تو وہ مال جب فقیر کے ہاتھ میں جاتا ہے تو گویا آپ نے اللہ کے ہاتھ میں دیا۔ فقیر دراصل اللہ تعالیٰ کا نائب بن کر لیتا ہے۔ (المعجم الکبیر، ۷۱۸۵) اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں یہ کہہ دیا گیا کہ جو مال آپ کو ہمارے واسطے نکالنا ہے وہ فقیر کو دیدینا۔ اس کو دیا گویا ہم کو دیا۔

یہاں ایک بات قابلِ غور ہے کہ بہت سی مرتبہ ہم صدقات اور زکوٰۃ کے نام سے مال دیتے ہیں، اس وقت ہمارے دل میں اس فقیر کے متعلق - جو یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا نائب بن کر ہمارے پاس آیا ہے - کیا جذبات ہوتے ہیں؟ بھائی آپ کے اوپر کسی کا قرضہ ہو اور اس کی وصول یابی کے لئے وہ آدمی کسی کو اپنا نمائندہ بنا کر آپ کے

پاس بھیجے، تو کیا آپ اس کے ساتھ تحقیر یا بے عزتی کا معاملہ کر سکتے ہیں؟ ایسا کرتے ہوئے آپ ڈریں گے کہ یہ تو اس کا نمائندہ ہے، گویا کہ وہی بذاتِ خود میرے پاس آیا ہے، اگر کچھ بھی غلط معاملہ کروں گا تو یہ وہاں اس کی اطلاع کر دے گا۔ اور یہاں تو اللہ تعالیٰ کو اطلاع کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، سب کچھ اس کے علم میں ہے، اس کے باوجود ہم اس فقیر کے متعلق دل میں کیا جذبات رکھتے ہیں؟

اِس کا احترام کیوں نہیں؟

حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جملہ یاد آ گیا جو وہ اپنے بیان میں فرمایا کرتے تھے کہ تم مسجد کا اکرام اور تعظیم کرتے ہو، حالاں کہ وہ پتھر کی بنی ہوئی ایک عمارت ہے، اس کا اکرام اور ادب واحترام اس لئے کرتے ہو کہ یہ عبادت کی ایک جگہ ہے جہاں نماز ادا کی جاتی ہے، ورنہ پتھر کی ایک عمارت ہے، کوئی جاندار چیز بھی نہیں ہے۔ تو وہ جگہ چوں کہ عبادت کو ادا کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ایک اہم فریضہ وہاں ادا کیا جاتا ہے، اس لئے اس کا ادب اور احترام کیا جاتا ہے؛ تو آخر اس فقیر کا ادب اور احترام تمہارے دلوں میں کیوں نہیں ہوتا؟ جبکہ زکوٰۃ جو اللہ تعالیٰ کا ایک نہایت اہم فریضہ ہے وہ اسی کے ہاتھوں ادا ہو رہا ہے۔ اور وہ کوئی پتھر کی عمارت نہیں ہے، بلکہ جاندار مخلوق ہے، اور وہ بھی انسان ہے۔ ویسے بھی ایک انسان کا انسان ہونے کے ناتے اکرام کرنا چاہیے تھا، چہ جائیکہ وہ تو ایک اہم فریضہ ادا کرنے کی جگہ بھی ہے؛ پھر تو اس کا کتنا زیادہ احترام ہونا چاہیے!

ہمارے دئے ہوئے میں سے خرچ کرو

اور قرآنِ پاک میں جہاں خرچ کا تذکرہ آتا ہے وہاں ایک خاص انداز اختیار

کیا گیا ہے: ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ گویا یہ بتلایا گیا کہ تم جو کچھ خرچ کروگے وہ ہمارے دئے ہوئے ہی میں سے خرچ کروگے۔ جیسا کہ باپ کا بچہ سے مانگنا یہ اس کے محتاج ہونے کی علامت نہیں ہے، اور ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ جو دے گا اس سے باپ کی ضرورت پوری ہوجائے گی، بلکہ باپ تو صرف یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میرے کہنے پر وہ کیا کرتا ہے۔ اسی طرح یہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کا جو حکم دیا ہے اس سے نعوذ باللہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس کے خزانہ میں کوئی کمی تھی۔ یا ایسا بھی نہیں ہے کہ خرچ کر کے اس نے اللہ تعالیٰ پر کوئی احسان کیا ہے۔ بلکہ دراصل ہمیں مال دے کر آزمایا جارہا ہے کہ یہ میرا دیا ہوا میرے کہنے پر کتنا خرچ کرتا ہے، اور اسی سے تعلق کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔

خرچ کرنے کے دو طریقے

قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ﴾ (فاطر: ۲۹) ہم نے جو دیا اس میں سے چھپ کر اور کھلم کھلا خرچ کرتے ہیں۔ اس آیت میں یہ بھی بتلایا ہے کہ خرچ کرنے کے دو طریقے ہیں، ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ سات آدمی جن کو قیامت کے دن عرش کے سایہ میں جگہ ملے گی، ان میں سے ایک وہ بھی ہے جس نے اتنا اخفاء اور چھپا کر اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا اہتمام کیا کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا اس کا بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا (بخاری شریف، ۶۶۰) اور دوسرا طریقہ کھل کر خرچ کرنا ہے۔ علماء نے اس کی تفصیل بیان کی ہے کہ کون سا صدقہ کھل کر کیا جائے اور کون سا چھپ کر کیا جائے۔ تو زکوٰۃ کے معاملہ میں لکھا ہے کہ اگر وہ اس طرح دی جائے کہ لوگوں کو پتہ چلے تب بھی کوئی حرج کی بات

نہیں ہے۔اس لئے کہ اس میں لوگوں کو بھی ترغیب ہوگی، اور اس پر کسی کو بدگمانی کا بھی موقع نہیں ملے گا کہ فلاں زکوٰۃ نہیں نکالتا۔ اور نفلی صدقات میں چھپا کر دینا چاہیے، الّا یہ کہ کوئی ایسا موقع ہو جہاں لوگوں کو ترغیب دینے کی ضرورت ہو تو پھر وہاں کھل کر بھی دے سکتے ہیں۔ یہ دونوں طریقے ہیں۔

امید کا صحیح طریقہ

اس آیت میں تین چیزیں بتلائی ہیں کتاب اللہ کو پڑھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اور اللہ کے دئے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسے لوگ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جس میں کوئی گھاٹا نہیں ہے یعنی جنت کی امید رکھتے ہیں۔ اس آیت میں کہا﴿یَرْجُونَ﴾ امید رکھتے ہیں یعنی ان کاموں کو انجام دینے کے بعد بھی کوئی گارنٹی نہیں دی گئی، بلکہ اس کے بعد بھی امید رکھتے ہیں۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے کس طرح امید رکھنی چاہیے اس کا صحیح طریقہ یہی ہے جو قرآنِ پاک میں بتلایا گیا ہے۔

امید کا مفہوم، ایک مثال

دنیا میں بھی امید کا یہی طریقہ ہے۔ ایک آدمی اگر یہ چاہتا ہے کہ حکومت کے اندر کلکٹری کا منصب حاصل کرے، اور بچپن سے اس نے یہ امید رکھی ہے تو وہ کیا کرے گا؟ وہ شروع ہی سے اس انداز سے آگے بڑھے گا، کلکٹر بننے کے لئے تعلیم کی جتنی مقدار ضروری ہے، ان تمام مراحل کو (step by step) پوری توجہ سے طے کرے گا۔ پہلے پرائمری، پھر سیکنڈری، پھر ہائی سکول، پھر کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم اور جتنی ڈگریوں کی ضرورت ہے وہ پوری کرے گا، اور اس میں بھی اعلیٰ طریقہ سے پوری

کرنے کا اہتمام کرے گا۔ کلکٹر تو کئی سالوں کے بعد بنے گا، لیکن اس نسبت پر بچپن سے خوب اچھی طرح محنت چل رہی ہے۔ اور پھر مان لو کہ اس کو ڈگری مل گئی تو ڈگری کا مل جانا یہ تو صرف اس بات کی علامت ہے کہ اس میں کلکٹر بننے کی صلاحیت ہے، اس ڈگری کے ملتے ہی وہ کلکٹر نہیں بن جاتا، بلکہ ابھی اور بھی مراحل سے گذرنا باقی ہے۔ پہلے وہ درخواست دے گا، اس کے بعد بھی فوراً کلکٹر نہیں بنا دیتے، بلکہ پہلے کوئی دوسرا عہدہ ملتا ہے، مثلاً پہلے تحصیلدار بنایا، پھر نائب معاملتدار، اس کے بعد معاملتدار بنا، اور پھر کئی سالوں بعد کلکٹر بنا۔ اس طرح پورا سلسلہ چلتا ہے۔ اس درمیان کوئی اس سے پوچھے کہ کیا آپ کلکٹر بن گئے؟ تو کہتا ہے کہ ہاں! کام چل رہا ہے، ابھی معاملتدار میں ہوں، دھیرے دھیرے پوسٹ بڑھے گی تو کلکٹر تک پہنچ جاؤں گا۔ حالانکہ معاملتدار کی پوسٹ پر بھی کتنی مدتوں کی محنت کے بعد آیا ہے، لیکن یہی کہتا ہے کہ امید ہے۔

ایک بزرگ اور ایک ڈپٹی کمشنر

ایک صاحب ایک بزرگ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اللہ کی نزدیکی حاصل کرنے کا کوئی آسان طریقہ بتلا دیجئے۔ ان بزرگ نے ان کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ان کو باتوں میں لگا دیا کہ بھائی! آپ کون ہیں، اور کیا کرتے ہیں؟ وہ کہنے لگے کہ میں ڈپٹی کمشنر تھا۔ تو پوچھا کہ آپ ڈپٹی کمشنر کیسے بنے؟ اب اس کو پتہ نہیں تھا کہ وہ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں، وہ سمجھا کہ ایسے ہی میرے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہیں۔

اور ویسے بھی انسان کی ایک خاص نفسیات ہے کہ اس سے اس کے بارے میں سوال کیا جائے کہ مثلاً آپ کو اللہ تعالیٰ نے اتنی دولت سے نوازا تو آپ نے اس کے لئے کیا کام کئے؟ بس! پھر دیکھو کہ اس کا دفتر کھلے گا، اور وہ اپنی صلاحیتوں کو بیان کرے گا کہ

میں نے کیسی کیسی محنتیں کیں۔ ایک صاحب سے ہماری ملاقات ہوتی رہتی ہے، ان کی کپڑے کی دوکان ہے جب کبھی کپڑا خریدنے کی ضرورت سے وہاں جانا ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ پوچھے بغیر ہی مجھ سے یہ کہنے لگتے ہیں کہ مولوی صاحب! پہلے تو میں ماچس بیچتا تھا اور پھر یہ کیا اور وہ کیا۔ اور اگر کسی سے پوچھو تو پھر تو وہ ایسا شروع ہوتا ہے کہ بس آپ سنتے ہی رہ جائیں گے۔ یہ انسان کی نفسیات ہے۔ کوئی کسی عہدہ پر ہو اور آپ اس سے پوچھیں کہ آپ اس عہدہ پر کیسے پہنچے؟ تو وہ بڑے لطف اور مزے لے لے کر ساری تفصیل بیان کرے گا، پھر تو آپ کو معذرت کرنی پڑے گی کہ وقت تنگ ہو رہا ہے، آئندہ پھر کبھی سنیں گے۔

خیر! ان صاحب نے بھی بزرگ کو سنانا شروع کیا کہ میں نے بڑی محنت سے پڑھائی کی اور پھر ڈگری حاصل کی اور پھر درخواست دی اور اس کے لئے بھی بڑی تکلیف اُٹھانی پڑی، اور ایک مدت تک بڑی محنت اور لگن سے کام کرنے کے بعد ڈپٹی کمشنر بنا اور اب ریٹائرڈ ہوا ہوں۔ بزرگ نے پوچھا: آپ کی عمر کتنی ہوئی؟ کہا: ساٹھ سال ہوئی۔ اب ان بزرگ نے کہا کہ جناب! آپ ڈپٹی کمشنری سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے یہاں آئے ہیں، تو شاید آپ کی نگاہوں میں اللہ کا قرب ڈپٹی کمشنری سے تو اونچی ہی چیز ہوگی؛ تب ہی تو یہاں آئے ہیں؟ انہوں نے کہا: جی ہاں! یہ تو بہت بڑی چیز ہے۔ تو ان بزرگ نے کہا کہ آپ ڈپٹی کمشنری کی پوسٹ پر تو پچاس پچپن سال کی عمر تک محنت کرنے کے بعد پہنچے تھے، اور یہاں آکر ہم سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کا کوئی ایسا آسان راستہ بتادو کہ دو چار دن میں وہ حاصل ہو جائے۔

مفت میں لینا چاہتا ہے

آدمی کا یہی مزاج ہے کہ دنیا کے معاملہ میں بڑا ہوشیار بنتا ہے اور دن رات

خوب محنت کرتا ہے اور سردی، گرمی، بارش دھوپ کچھ نہیں دیکھتا۔ لیکن دین کے معاملہ میں ویسی محنت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ یہ چیز مفت میں لینا چاہتا ہے، دین کے معاملہ میں ڈھونڈتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے کوئی سستا سودا مل جائے۔ کوئی ایسا بزرگ مل جائے جو دم کر دے اور میرا سینہ کھل جائے۔

ایک مولوی صاحب کہتے تھے کہ یہ کیا ہے کہ کسی بزرگ کی خدمت میں جائیں اور ان سے بیعت ہوں اور اصلاح کا تعلق قائم کریں؛ تب کچھ کام بنے۔ مَیں یہ سب چیزوں کو نہیں مانتا۔ ہم کو تو ایسا بزرگ چاہیے کہ ایک نگاہ کرے اور سینہ کھل جائے۔ مَیں نے ان سے کہا کہ پھر تو ڈھونڈتے ہی رہو۔ ہمارا یہ مزاج ہو گیا ہے کہ آدمی دین کے معاملہ میں مفت کا چاہتا ہے، ویسے دنیا کے معاملہ میں بھی مفت کا ڈھونڈتا تو رہتا ہے لیکن کوشش بھی برابر جاری رہتی ہے، لیکن دین کے معاملہ میں کوشش بھی نہیں کرتا۔

اسی کا نام امید ہے

مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ دنیوی معاملہ میں امید کے ساتھ پوری محنت بھی کی جاتی ہے۔ جیسے ایک کسان اگر یہ چاہتا ہو کہ اس کے کھیت کے اندر ایک بیگہ میں زیادہ سے زیادہ کوئنٹل گیہوں میں حاصل کروں، تو وہ اس کے لئے عمدہ قسم کا بیج لائے گا کھاد ڈالے گا، پانی برابر پلائے گا، خوب محنت کرے گا، اور اب اس سے پوچھو کہ کیا حال ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ اب اچھی فصل کی امید ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ دنیوی معاملات میں امید کا مطلب یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس چیز کے لئے قاعدہ سے جتنی محنت کی جانی چاہیے، اتنی کوشش کرنے کے بعد اس چیز کی توقع رکھنا؛ اسی کا نام امید ہے۔

کنوارے کو اولاد کا تعویذ چاہیے!

جیسے ایک آدمی بچے کی امید رکھتا ہے تو اس کو شادی کرنی پڑے گی، اور صحبت

کے بعد توقع رکھے۔ ایک صاحب حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تعویذ لینے کے واسطے آئے اور کہا کہ حضرت! اولاد کا تعویذ چاہیے۔ حضرت نے پوچھا کہ آپ نے شادی کی ہے؟ تو اس نے کہا کہ نہیں! ابھی شادی تو نہیں کی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ وہ شادی کئے بغیر اولاد کا تعویذ لینے آیا تھا، اس کے متعلق آپ کیا رائے قائم کریں گے؟ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اسباب اختیار کئے جاتے ہیں اور پھر امید رکھی جاتی ہے۔ دنیوی معاملات میں ہم اسی کو امید کہتے ہیں۔

ایک طالبِ علم کو شاہزادی سے نکاح کرنے کے حوصلے تھے، اور وہ ہمیشہ اسی خیال میں مست رہتا۔ کسی نے پوچھا کہ بھائی کیا ہوا؟ تو کہنے لگا کہ بس! آدھا معاملہ تو طے ہوگیا ہے، آدھا باقی ہے۔ ہماری طرف سے تو منظوری ہے، اُدھر کی بات نہیں جانتا۔

اپنے بس میں جتنا ہو؛ کرلو پھر......

خلاصہ یہ ہے کہ آدمی دنیوی اعتبار سے محنت کرتا ہے پھر امید رکھتا ہے، اور امید کا اصل مفہوم یہی ہے۔ تو کیا امید کا جو معنیٰ، مفہوم ومطلب ہم دنیوی معاملات میں سمجھتے ہیں؛ دین کے معاملہ میں وہ بدل جاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ جو مطلب وہاں لیا جائے گا، وہی مطلب یہاں بھی لیا جائے گا۔ دنیا کے کسی بھی کام میں امید اس وقت رکھی جاتی ہے جب اس کے سارے اسباب اختیار کر لئے جائیں، اپنے ہاتھ میں جتنا تھا وہ کرلیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے توقع اور امید رکھو۔ ایسے ہی دین کے معاملہ میں اپنے ہاتھ میں جتنا ہو وہ کرلو، پھر اللہ تعالیٰ سے امید رکھو؛ اس کا نام امید ہے۔

یہ امید نہیں؛ ہوس ہے

اسباب کو اختیار کئے بغیر کوئی آدمی امید رکھے تو اس کو امید نہیں، بلکہ ہوس کہتے

ہیں۔اسی کو حدیثِ پاک میں فرمایا گیا:﴿اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللهِ﴾(مسند احمد،۱۷۱۲۳) سمجھدار اور ہوشیار آدمی وہ ہے جو اپنے نفس کو زیر کرے، قابو اور (control) میں لاوے، اور موت کے بعد آنے والی زندگی کے لئے عمل کرے۔اور عاجز و درماندہ، بے کار ہے وہ آدمی؛ جو اپنے نفس کی خواہشات کے پیچھے چلتا رہے، جیسا نفس کہے ویسا ہی کرے، اور پھر اللہ تعالیٰ سے امیدیں بھی باندھے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ سمجھداری کی بات نہیں ہے، بلکہ بے وقوفی کی بات ہے، یہ حماقت ہے، دنیوی معاملہ میں ہم بھی اس کو حماقت کہتے ہیں۔جیسے ایک کسان نے اپنی زمین کو جوتا اور اس میں ہل چلایا، بیج ڈالا، پانی پلایا، کھاد ڈالا اور اس کی پوری حفاظت کی، پھر جب کٹائی اور فصل لینے کا وقت آیا تو وہ امید لگائے بیٹھا ہے کہ میرا گھر غلہ سے بھر جائے گا؛ تو اس کا یہ امید رکھنا درست ہے اور دوسرا کسان ایسا ہے کہ نہ اس نے زمین میں ہل چلایا، نہ بیج ڈلا، نہ کھاد ڈالی، نہ پانی پلایا اور نہ کچھ کیا، لیکن جب فصل کاٹنے کا وقت آیا تو جیسے سب لوگ امید باندھے بیٹھے ہیں؛ یہ بھی امید لگائے بیٹھا ہے، تو اس کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ اس کو بے وقوف ہی کہیں گے، اس کے علاوہ اور کیا کہا جائے گا۔

اسی طرح سے دینی معاملہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے امید کا طریقہ بتلادیا ہے﴿إِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ كِتَابَ اللهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ﴾(فاطر:۲۹) قرآنِ پاک میں﴿یَرْجُوْنَ﴾کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یعنی امید اسی کا نام ہے کہ آپ سارے اسباب کو اختیار کر لیجئے اور پھر امید لگائیے، تب تو بات برابر ہے، اور یہی امید کا صحیح طریقہ بھی ہے۔اس کے بغیر کوئی آدمی امید لگا رہا ہے، تو اس کا نام امید نہیں ہے بلکہ یہ تو حماقت ہے، اور اسی کا نام ہوس ہے۔

مؤمن کی شان

تو بنیادی چیز میں یہی بیان کرنا چاہتا تھا کہ امید کی حقیقت کیا ہے۔ اور میں بار بار یہ کہتا رہتا ہوں کہ دیکھو! ایمان کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں کرنے کو کہا ہے، مؤمن ان کو کرتا رہے۔ اور جن چیزوں سے بچنے کے لئے کہا ہے ان سے بچتا رہے اور پھر اللہ تعالیٰ سے امیدیں قائم کرے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے کرنے کو کہا ہے وہ کرسکتا ہے پھر بھی نہ کرے۔ یا جن چیزوں سے بچنے کے لئے کہا گیا ہے ان کو جان بوجھ کر اختیار کرے۔ یہ مؤمن کی شان سے بعید ہے۔ مؤمن تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہی رہے گا، اور گناہوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہی رہے گا، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے کے دوران کبھی اپنی بیماری کی وجہ سے، یا کمزوری کی وجہ سے اتفاقیہ طور پر کوئی کام کرنے کے لئے کہا گیا تھا لیکن چھوٹ گیا، تو وہ معافی مانگنے سے معاف ہو جائے گا۔ جیسے آپ کا کوئی نوکر ایسا ہے جس کو آپ جو کچھ کہتے ہیں وہی کرتا ہے، پھر کسی روز کہی ہوئی کوئی بات اس نے نہیں کی، تو آپ اس پر اس کی گرفت نہیں کریں گے (Let go) کر دیں گے کہ ہمیشہ وہ ہر کام برابر کرتا ہے، آج بیمار ہو گیا ہوگا، خود ہی اس کا عذر نکال لیں گے۔

اسی طرح جن چیزوں سے بچنے کے لئے کہا گیا ہے ان سے بچتا ہے، کبھی اپنے ارادہ سے وہ کام اس نے کئے نہیں ہیں، لیکن غیر اختیاری طور پر اس سے کوئی کام ہو گیا اور اس سے اس نے معافی بھی مانگ لی تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں سے منع کیا ہے، آدمی جانتا ہے کہ وہ حرام کام ہیں اور ان کا کرنا گناہ ہے اور پھر بھی کرے۔ یہ تو ایمان کے تقاضہ کے سراسر خلاف ہے۔ مؤمن سے

تو ایسا ہونا ہی نہیں چاہیے۔ یہ سیدھی سادی بات ہے۔

باب کا مقصد

خیر! علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب کا جو عنوان قائم کیا ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ اس باب میں وہ ایسی حدیثیں بیان کرنا چاہتے ہیں جن سے آدمی کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ورجا پیدا ہو۔ اس لئے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سارے اعمال برابر انجام دیتا ہے اور گناہوں سے بچتا بھی ہے، لیکن کبھی کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو بعض انسانوں پر اس گناہ ہو جانے کے نتیجہ میں اتنی زیادہ ندامت غالب ہو جاتی ہے کہ وہ یوں سوچنے لگتے ہیں کہ ہم نے یہ کیا کر ڈالا؟ اب ہمارا کیا ہوگا؟ اب تو ہم بالکل ہلاک ہی ہو جائیں گے۔ ایسی مایوسی چھانے لگتی ہے۔ اس باب میں جو حدیثیں آرہی ہیں وہ دراصل اسی قسم کی مایوسی کو ختم کرنے کے لئے ہیں۔ لیکن سیدھی بات ہے کہ جو آدمی کچھ بھی نہیں کرتا، اس کے لئے یہ باتیں نہیں ہیں۔ اس باب کو قائم کرنے کی بنیاد یہی ہے کہ گویا ہمیں یہ تلقین کی جا رہی ہے کہ کوئی آدمی باوجود اہتمام کے یہ سوچنے نہ لگ جائے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک نافرمانی ہلاکت کا سبب ہو سکتی ہے۔ اس سے کہا گیا کہ بالکل مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت بڑی وسیع ہے ﴿إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَى مَن كَذَّبَ وَتَوَلَّى﴾ (طٰہٰ:۴۸) اللہ تعالیٰ کا عذاب تو انہیں لوگوں کو ہوگا جنہوں نے رسولوں کی نافرمانی کی اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے رخ پھیرا۔

باری تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے: ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (أعراف:۱۵۶) میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔ اس جگہ پر بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ حکم دنیا ہی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت دنیا میں مؤمن اور کافر سب کے لئے عام ہے، لیکن آخرت میں

تو معاملہ ایمان کی وجہ سے ہوگا۔

جنت میں ضرور جائے گا

۴۱۲-عن عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مَنْ شَهِدَ أَنْ لاَإِلٰهَ إِلاَّ اللّٰهُ وَحْدَهُ لاَشَرِيْكَ لَهُ، وأَنَّ مُحَمّداً عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ، وَأَنَّ عِيْسٰى عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَاإِلىٰ مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِنْهُ،وَأَنَّ الْجَنَّةَ حَقٌّ،وَالنَّارَ حَقٌّ أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ عَلىٰ مَاكَانَ مِنَ الْعَمَلِ۔ (متفق علیہ)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: مَنْ شَهِدَ أَنْ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ النَّارَ۔

ترجمہ:- حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اس بات کی گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور اس بات کی گواہی دے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اور یہ گواہی بھی دے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور اللہ کا کلمہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم پر ڈالا ہے (اس لیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کسی مرد کے نطفہ سے نہیں ہوئی بلکہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کلمۂ کن سے ہوئی ہے۔) اور یہ گواہی دے کہ جنت اور جہنم حق ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کریں گے، چاہے جیسے بھی اعمال ہوں گے۔

افادات:- اتنی بات تو طے ہے کہ جب وہ ایمان لے آیا تو اب اس کے کیسے ہی اعمال کیوں نہ ہوں، اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کریں گے۔ اگر کوئی آدمی دنیا سے ایمان کے ساتھ گیا اور شرک کا کوئی ایسا کام اس نے نہیں کیا جس سے ایمان ختم ہوجائے، تو وہ ایک نہ ایک دن جنت میں ضرور جائے گا۔ یا فوراً جائے گا جس کو دخولِ اولین کہتے ہیں، یا پھر یہاں سے گناہوں کی آلودگی لے کر گیا تھا تو پاک وصاف کرنے

کے لئے بھٹی میں ڈالا جائے گا اور پاک وصاف کروا کر جنت میں بھیجا جائے گا۔ باقی جنت میں ضرور جائے گا۔

طلب سے زیادہ عنایت

۴۱۳ - وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: يَقُوْلُ اللهُ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا أَوْ أَزِيْدُ، وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا أَوْ أَغْفِرُ وَمَنْ تَقَرَّبَ مِنِّي شِبْرًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ ذِرَاعاً، وَمَنْ أَتَانِيْ يَمْشِيْ أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً، وَمَنْ لَقِيَنِيْ بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطِيْئَةً لَا يُشْرِكُ بِيْ شَيْئًا، لَقِيْتُهُ بِمِثْلِهَا مَغْفِرَةً.

(رواہ مسلم)

معنی الحدیث: (مَنْ تَقَرَّبَ) إِلَيَّ بِطَاعَتِيْ (تَقَرَّبْتُ) إِلَيْهِ بِرَحْمَتِيْ۔ وَإِنْ زَادَ زِدْتُ۔ (فَإِنْ أَتَانِيْ يَمْشِيْ) وأَسْرَعَ فِيْ طَاعَتِيْ (أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً) أَيْ: صَبَبْتُ عَلَيْهِ الرَّحْمَةَ وَسَبَقته بِهَا، وَلَمْ أحوجهُ إِلَى الْمَشْيِ الْكَثِيْرِ فِي الْوُصُوْلِ إِلَى الْمَقْصُوْدِ۔ (وَقُرَابُ الْأَرْضِ) بِضَمِّ الْقَافِ، وَيُقَالُ بِكَسْرِهَا وَالضَّمُّ أَصَحُّ وَأَشْهَرُ وَمَعْنَاهُ: مَا يُقَارِبُ مِلْأَهَا۔ وَاللهُ أَعْلَمُ.

ترجمہ مع تشریح: - حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ باری تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ جو آدمی ایک نیکی لے کر آئے گا اس کو دس گنا یا اس سے بھی زیادہ بدلہ دیا جائے گا (گویا نیکی کے کاموں میں اللہ تعالیٰ کے یہاں کم سے کم دس گنا ملتا ہے، اور زیادہ جتنا اللہ تعالیٰ چاہیں گے دیں گے۔) اور جو آدمی کوئی گناہ کا کام کرے، تو اس کے گناہ کا بدلہ اتنا ہی ہے جتنا اس کا گناہ ہے، یا میں اس کو معاف کردوں گا۔ (اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے وہ چاہے تو معاف کردے) اور جو آدمی مجھ سے ایک بالشت قریب ہوگا، میں اس سے ایک ہاتھ قریب ہوؤں گا (یعنی جو آدمی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کر کے اللہ تعالیٰ کی رحمت

حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ذریعہ سے اس سے ایک ہاتھ قریب ہوں گے، یعنی وہ جتنا بڑھا اللہ تعالیٰ اس سے دوگنا اس کی طرف متوجہ ہوئے، گویا اس کی طرف سے جتنی طلب ہوتی ہے، وہاں سے اس سے زیادہ عنایت ہوتی ہے جیسے بچہ جب آدھا قدم آگے بڑھاتا ہے تو ماں باپ آگے بڑھ کر اس کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں بس وہاں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بندہ میرے پاس آنا چاہتا ہے) اور جو آدمی ایک ہاتھ میری طرف بڑھا تو میں اس کی طرف ایک باع یعنی چار ہاتھ متوجہ ہوتا ہوں (آدمی جب دونوں ہاتھ پھیلائے گا تو وہ چار ہاتھ ہوجائیں گے؛ اس کو باع کہتے ہیں۔ بعضوں نے دو ہاتھ کہا ہے، لیکن صحیح یہی ہے کہ چار ہاتھ مراد ہیں۔) اور جو میری طرف چل کر بڑھے گا تو میں اس کی طرف دوڑ کر بڑھوں گا (مطلب یہ ہے کہ بندے کی طرف سے جو کوشش ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئی گنا زیادہ اس کو قبولیت ملتی ہے آج کل کی زبان میں اس کو (Response) کہتے ہیں) اور جو میرے پاس قیامت کے روز ایسی حالت میں آئے گا کہ زمین بھر کر گناہ ہوں، لیکن (ایک بات ہے کہ) کسی کو میرے ساتھ شریک نہیں ٹھہراتا تھا؛ تو مَیں اتنی ہی مغفرت لے کر اس سے ملتا ہوں۔

افادات:- علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کا مطلب بیان کیا ہے کہ جو میرے قریب ہوا یعنی جس نے میری اطاعت وفرمانبرداری اختیار کی، وہ میرے قریب ہوتا ہے۔ یہ بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے قریب ہونا ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے قریب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت بندے کی طرف بھیجتے ہیں "وَإِنْ زَادَ زِدتُّ" اگر وہ زیادتی کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی زیادتی ہوتی ہے۔ "اور وہ چل کر آیا" یعنی میری اطاعت وفرمانبرداری بہت جلدی کی، اس میں

تاخیر نہیں کی۔ دیکھو! وہاں مقدار بتلائی گئی تھی اور یہاں وقت بتلایا جارہا ہے یعنی بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنے میں جتنا وقت لگتا ہے، اس سے زیادہ جلدی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو نوازا جاتا ہے، وہاں سے بدلہ ملنے میں دیر نہیں لگتی۔

واجب کرنے والے دو کام

۴۱۴ - عَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: جَاءَ أَعرَابِيٌّ إِلىٰ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللهِ! مَاالْمُوْجِبَتَانِ؟ قَالَ: مَنْ مَاتَ لاَ يُشْرِكُ بِاللهِ شَيْئاً دَخَلَ الْجَنَّةَ. وَمَنْ مَاتَ يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دیہاتی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا: یارسول اللہ! وہ دو کام کونسے ہیں جو واجب کرنے والے ہیں؟ (یعنی جن کا نتیجہ بالکل طے شدہ ہے کہ اس کے خلاف نہیں ہوسکتا۔) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی ایسی حالت میں مرا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا ہے؛ تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اور جو آدمی اس حالت میں مرا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتا تھا؛ تو وہ جہنم میں داخل ہوگا (یہ دونوں واجب کرنے والی چیزیں ہیں۔)

بَابُ الرَّجَآءِ

اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کا بیان

مجلس ۳

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

موضوع چل رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید رکھنی چاہیے، اسی سلسلہ میں آج روایت لائے ہیں۔

نہایت ہی امید افزا روایت

۴۱۵۔ وَعَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَمُعَاذٌ رَدِيفُهُ عَلَى الرَّحْلِ، قَالَ: يَا مُعَاذُ! قَالَ: لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللهِ وَسَعْدَيْكَ۔ قَالَ: يَا مُعَاذُ! قَالَ: لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللهِ وَسَعْدَيْكَ۔ قَالَ: يَا مُعَاذُ! قَالَ: لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللهِ وَسَعْدَيْكَ۔ (ثلاثا) قَالَ: مَا مِنْ عَبْدٍ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ صِدْقًا مِنْ قَلْبِهِ إِلَّا حَرَّمَهُ اللهُ عَلَى النَّارِ. قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَفَلَا أُخْبِرُ بِهَا النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُوا؟ قَالَ: إِذًا يَتَّكِلُوا. فَأَخْبَرَ بِهَا مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِهِ تَأَثُّمًا. (متفق علیه)

وَقَوْلُهُ: (تَأَثُّمًا) أَيْ خَوْفًا مِنَ الْإِثْمِ فِي كَتْمِ هٰذَا الْعِلْمِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سواری پر تشریف لے جا رہے تھے اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ آپ کے پیچھے اس سواری پر سوار تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے معاذ! انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مَیں حاضر ہوں، ارشاد فرمائیے۔ پھر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے معاذ! انہوں نے پھر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! حاضر ہوں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر فرمایا: اے معاذ! انہوں نے پھر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! حاضر ہوں (دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور آئندہ جو بات کہی جانے والی ہے اس کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے تین مرتبہ خطاب فرمایا تھا، ورنہ حضرت معاذ تو اسی اونٹ کے اوپر آپ کے پیچھے ہی

سوار تھے، آپ ﷺ ''یا معاذ'' نہ بھی فرماتے اور اپنی بات ارشاد فرما دیتے تو حضرت معاذ سن لیتے، لیکن ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے پہلے ان کا نام لے کر آپ نے خطاب فرمایا، پھر جب انہوں نے جواب میں اپنی توجہ کا اظہار فرما دیا تو دوبارہ پھر پکارا، پھر سہ بارہ پکارا جب یہ بات ہو چکی) تو پھر ارشاد فرمایا: اللہ کا جو بندہ اس بات کی سچے دل سے گواہی دے کہ اللہ کے علاوہ اور کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں؛ تو اللہ تعالیٰ اس بندے کو جہنم کے اوپر حرام کر دیتے ہیں۔

(ظاہر ہے کہ اس روایت میں ایمان والوں کے واسطے کتنی بڑی امید ہے کہ جو ایمان لے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور معبود ہونے کا اور نبی کریم ﷺ کی عبدیت و رسالت کا اقرار کرتے ہیں، دل سے بھی سچا سمجھتے ہیں اور زبان سے بھی اس کا اقرار کرتے ہیں، صرف اتنی بات پر یہ بشارت سنائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو جہنم پر حرام کر دیتے ہیں۔)

جب نبی کریم ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! (اتنی بڑی بشارت جو آپ نے اہلِ ایمان کے لئے سنائی ہے) مَیں لوگوں کو اس کی اطلاع نہ کر دوں؛ تاکہ وہ بھی اس بشارت کو سن کر خوش ہو جائیں؟ (اس لیے کہ جو بھی اہلِ ایمان اس چیز کو سنے گا تو ظاہر ہے کہ اس کو اس پر قلبی مسرت ہوگی اور وہ خوش ہوگا) نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا: ''إِذًا يَتَّكِلُوْا''، لوگ بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔ پھر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے موت کے وقت گناہ کے ڈر سے یہ روایت بتلا دی۔

روایت کرنے سے کیوں منع فرمایا؟

افادات:- بعض طبیعتیں ایسی ہیں کہ اتنا سننے کے بعد ان کے عمل کا جذبہ کمزور

ہو جائے گا اور اعمال کر کے جو اونچے مراتب حاصل کر سکتی ہیں ان سے محروم رہ جائیں گی۔ ایک تو ہے اس کا جہنم پر حرام ہونا اور جنت میں پہنچ جانا، اور ساتھ ہی جنت میں پہنچنے کے بعد وہاں کے مراتب کی بھی کوئی انتہاء نہیں ہے، آدمی جیسے جیسے اعمال کرے گا اور اس میں جتنی محنت کوشش و مجاہدہ کرے گا، اس کو اللہ تعالیٰ جنت میں اتنا ہی اونچا مقام عطا فرمائیں گے تو حضور اکرم ﷺ کے اس ارشاد کا حاصل یہ تھا کہ آپ لوگوں کو یہ بات سنا دیں گے تو ہو سکتا ہے کہ بعض طبیعتیں اس کو سننے کے بعد اعمال کے معاملہ سست پڑ جائیں، اور اعمال کر کے جو مراتب حاصل کر سکتی ہیں، ان کے معاملہ میں کوتاہی سے کام لینے لگیں۔ اور اس بشارت پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں کہ چلو! ہم کلمہ تو پڑھتے ہی ہیں، ہم کو اتنی گارنٹی تو مل ہی گئی ہے، اس لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ابھی لوگوں کو کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس روایت کا پتہ کیسے چلا؟

راوی کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ نے بتلانے سے منع فرما دیا تھا تو اس روایت کا پتہ کیسے چلا؟ تو حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت آیا تو چونکہ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی کریم ﷺ کی طرف سے ایک ذمہ داری یہ بھی سونپی گئی تھی "فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ" جو سننے والے موجود ہیں وہ ان لوگوں تک - جو ابھی موجود نہیں ہیں - میری بات پہنچا دیں۔ یہ ایک ذمہ داری ان کے حوالہ کی گئی تھی اس لئے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی موت کا وقت آیا تو یہ سوچ کر کہ نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے دی گئی یہ بشارت کہیں میرے ساتھ قبر میں نہ چلی جائے اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد امت تک پہنچنے سے رہ جائے، اس لئے بالکل آخری

وقت میں گناہ سے بچنے کے لئے انہوں نے یہ بات لوگوں کو بتلائی۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ خود اس کی تشریح فرماتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ایک علم جو نبی کریم ﷺ نے عطا فرمارکھا تھا وہ چھپارہ جائے، اور اس کی وجہ سے سر پر ایک گناہ آجائے، اس لئے مرتے وقت یہ بات لوگوں کو بتلا کر گئے۔

عشق است و ہزار بدگمانی

ویسے یہ بشارت نبی کریم ﷺ نے ایک اور موقع پر بھی ارشاد فرمائی تھی۔ مسلم شریف میں (مسلم شریف، ۱۶۵) روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ صحابہ کے درمیان تشریف فرما تھے، اچانک آپ ﷺ ان کے درمیان سے اٹھے اور آبادی سے باہر تشریف لے گئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ سمجھے کہ آپ اپنی کسی ضرورت سے تشریف لے گئے ہیں، تھوڑی دیر انتظار کیا لیکن جب حضور اکرم ﷺ تشریف نہیں لائے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فکر لاحق ہوئی کہ پتہ نہیں کیا بات ہوئی۔ اس لئے کہ آپ ﷺ کے دشمن بھی بہت تھے جو آپ کو مختلف طریقوں سے ایذاء پہنچانے کے درپے رہتے تھے، اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حضور اکرم ﷺ کے ساتھ جو محبت تھی اس کی وجہ سے ان کے دلوں میں یہ خیال آیا کہ کہیں کچھ ہو تو نہیں گیا۔ جیسے ایک بچہ ماں کے بازو میں لیٹا ہوا ہے، اور اس کی سانس کی آواز نہیں آتی تو ماں ایک دم سے بیٹھ کر دیکھنے لگ جاتی ہے کہ اس کو کچھ ہوا تو نہیں۔

کسی کا کوئی عزیز قریب جس سے اس کو محبت ہے، اگر وہ بیمار ہو اور سانس کا پتہ نہ چلتا ہو، تو وہ اس کے چہرہ کے قریب کان لے جاتا ہے، اس کو ہاتھ لگا کر دیکھتا ہے، اس کی نبض دیکھتا ہے، یہ محبت کا لازمی تقاضہ ہے۔ ''عشق است و ہزار بدگمانی'' جیسا معاملہ ہوتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کو عبادت میں مصروف ہوئے، جب سجدہ میں تشریف لے گئے تو دیر تک سجدہ میں رہے، وہ فرماتی ہیں کہ مجھے اندیشہ لاحق ہوا، میں نے اُٹھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدمِ مبارک پر ہاتھ رکھ کر دیکھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ روح پرواز کر گئی ہو۔ جس کے ساتھ محبت ہوتی ہے اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے، جو لوگ اس کیفیت سے گذر چکے ہیں وہ اس چیز کو بہت آسانی کے ساتھ محسوس کر سکتے ہیں۔ بہرحال! حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ فکر لاحق ہوا کہ آپ کہاں تشریف لے گئے، سب آپ کی تلاش اور جستجو میں نکلے۔

جنت کی خوشخبری سنادو

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک باغ کے متعلق مجھے خیال ہوا تو میں نے اندر جانے کا راستہ ڈھونڈا، لیکن مجھے راستہ نہیں ملا، اس باغ کے پانی کے باہر نکلنے کی جو نالی تھی اس میں سے ہو کر میں اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس باغ میں تشریف فرما ہیں، میں نے جا کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے درمیان سے اچانک اٹھ کر چلے آئے اور دیر ہوگئی تو سب پریشان ہو گئے، اور سب ہی آپ کی تلاش اور جستجو میں نکلے ہوئے ہیں، میں بھی اسی لئے نکلا تھا اور اس باغ میں آنے کا کوئی راستہ نہیں ملا تو پانی نکلنے کی نالی سے میں اندر گُھسا ہوں اور آپ یہاں تشریف فرما ہیں۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ معلوم ہوا کہ حضراتِ صحابہ پر یہ کیفیت گذری، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو اپنے نعلین مبارک دے کر یہ فرمایا کہ جاؤ اور جو بھی تمہیں راستہ میں ملے، جو اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں؛ اس کو جنت کی خوشخبری

سنادو۔ گویا اس طریقہ سے صحابہ کرام کی طبیعتوں پر آپ کے ساتھ محبت کی وجہ سے جو فکر لاحق ہوا تھا اور انہوں نے کلفت کی جو کیفیت محسوس کی تھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کی تلافی فرمانا چاہتے تھے۔ چوں کہ اہلِ ایمان کو ایمان کی وجہ ہی سے آپ سے محبت تھی، اسی ایمان پر یہ خوشخبری سنائی جارہی ہے۔

کہیں لوگ بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائیں

خیر! حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نعلین مبارک لے کر خوشی خوشی باہر نکلے اور اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوگئی، اب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تو بڑے جوش وخروش کے ساتھ جارہے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے ابو ہریرہ! کیا بات ہے؟ تمہارے ہاتھ میں یہ جوتیاں کیسی؟ کہاں جارہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جوتیاں مبارک ہیں اور مجھے حضور نے فرمایا ہے کہ جو بھی اہلِ ایمان تمہیں راستہ میں ملے اس کو جنت کی خوشخبری سنادو، اس لئے میں جارہا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے سینے پر اتنی زور سے ہاتھ مارا کہ حضرت ابو ہریرہ گر گئے اور کہا کہ واپس جاؤ۔ اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو واپس کیا۔ اب حضرت ابو ہریرہ آگے آگے اور حضرت عمر پیچھے پیچھے، دونوں اسی باغ میں پہنچے۔ حضرت ابو ہریرہ تو بالکل رونے کے قریب ہوگئے تھے، انہوں نے جا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے شکایت کی کہ اے اللہ کے رسول! آپ نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی تھی، میں اسی کی ادائیگی کے لئے جارہا تھا اور حضرت عمر سے ملاقات ہوگئی، انہوں نے مجھے منع کردیا اور کہا کہ واپس چلو۔ اتنی دیر میں حضرت عمر بھی وہاں پہنچ گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے ان کو بھیجا تھا؟ کہا: ہاں۔ پوچھا کہ وہ آپ کی جوتیاں مبارک تھیں؟ کہا: ہاں۔ عرض

کیا کہ کیا اس لئے بھیجا تھا کہ لوگوں کو خوشخبریاں سنائیں؟ کہا: جی ہاں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ایسا نہ کیجئے، کہیں لوگ اس پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائیں۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ٹھیک ہے، کسی کو اطلاع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ گویا ایک پہلو یہ بھی تھا اور دوسرا پہلو وہ بھی تھا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ملحوظ رکھتے ہوئے صحابہ کی دلجوئی کے لئے بشارت سنانے کے لئے بھیجا تھا، لیکن جب دوسرا پہلو آپ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روک دیا کہ ٹھیک ہے، کسی کو اطلاع دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ بات لوگوں کو بتلائی نہ جائے، بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عرض کرنے کا حاصل یہ تھا کہ یہ پہلو بھی ہونے کی وجہ سے مناسب یہ ہے کہ ابھی لوگوں کو اس بات کی اطلاع نہ دی جائے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ عرض کیا تھا کہ اے اللہ کے رسول! لوگوں کو ابھی عمل کرنے دیجئے، ورنہ بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔

بات ایک؛ اثر مختلف

ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی بات کا اثر مختلف طبیعتوں پر مختلف ہوتا ہے، ایک ہی بات مختلف آدمیوں کے سامنے کہی جائے تو سننے والوں کے مزاج کے اعتبار سے اس بات کا اثر ضروری نہیں کہ ایک پر جیسا ہوا، دوسرے پر بھی وہی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ دوسرے پر کوئی دوسرا اثر ہو۔ آخر جن حضرات کو دنیا میں جنت کی بشارت سنائی گئی تھی جن کو عشرۂ مبشرہ کہا جاتا ہے، اسی طرح صحابہ میں ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے حضرات ہیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے دنیا ہی میں جنت کی بشارت سنائی گئی تھی، لیکن جیسا کہ آپ حضرات نے پڑھا اور سنا ہوگا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے

تھے کہ کاش! مَیں کوئی تنکا ہوتا۔ کاش! مَیں کوئی گھاس ہوتا جس کو کوئی جانور کھا جاتا۔ حالاں کہ یہ وہ لوگ تھے جن کو نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے جنت کی بشارت مل چکی تھی۔ اور ایک حال ہمارا ہے کہ اگر ایک مہینہ تک پابندی کے ساتھ نماز پڑھنا شروع کر دی تو ہم ایسا سمجھنے لگتے ہیں کہ اب حضرت جبرئیل وحی لے کر آنے ہی والے ہیں۔ دراصل میں مزاجوں کا فرق بتلانا چاہتا ہوں۔

طبیعتوں کا فرق......ایک مثال

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:-

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

بارش کی خوبی میں کسی کو کوئی کلام نہیں ہوسکتا، کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ بارش میں عیب ہے، بارش کا پانی تو ماشاء اللہ ہوتا ہے، اس میں تو کوئی کلام ہو ہی نہیں ہوسکتا، لیکن یہی بارش کا پانی باغ میں جب پہنچتا ہے تو اس میں پھول کھلتے ہیں، اور یہی بارش کا پانی جب کھاری زمین میں پڑتا ہے؛ تو وہاں کانٹے اُگتے ہیں۔

دوسری مثال

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک لوگوں کی ہدایت کے واسطے نازل کیا ہے، اس کے باوجود قرآنِ پاک ہی میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَّيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا﴾ اللہ تعالیٰ اسی قرآن کے ذریعہ سے بہت سوں کو گمراہ بھی کرتا ہے، اور بہت سوں کو ہدایت بھی عطا فرماتا ہے۔ دراصل یہ طبیعتوں کا فرق بتایا گیا ہے، اس میں نعوذ باللہ قرآنِ پاک کی کوئی خرابی نہیں ہے۔ جیسے بارش کے پانی میں کسی کو کوئی اشکال نہیں ہے بلکہ وہ پانی جہاں گرا ہے، اس جگہ کی خرابی کی وجہ سے اس میں خرابی پیدا ہوئی۔

تیسری مثال

ایک عمدہ غذا اور بہترین خمیرہ کسی تندرست آدمی کو کھلائیے جس کا معدہ غذا کو ہضم کرتا ہے تو یہ غذا اس کے پیٹ میں جا کر صالح خون اور قوت پیدا کرے گی اور یہی غذا کسی ایسے آدمی کو کھلائیے جس کو ہیضہ اور کولیرا ہو گیا ہو، تو وہ آدمی مر جائے گا۔ یہ سمجھنے کی بات ہے۔ اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ ایک ایسی بات ہے جو امت تک پہنچانی ضروری ہے، لیکن سب کا حال ایک سا نہیں ہوتا۔

اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جب خبر دینے کی اجازت مانگی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جواب میں صرف اتنا ہی اشاد فرمایا: "اِذاً یَتَّکِلُوْا" لوگ بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے، یہ نہیں فرمایا کہ کسی کو خبر مت کریو۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم لوگوں کو اس بات کی خبر دینا چاہو تو اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا۔ چنانچہ اسی پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے پوری زندگی تو کسی کو اس بات کی خبر نہیں دی، لیکن مرتے وقت اطلاع دی کہ بھائی دیکھو! میرے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشادات کے قبیل سے جو کچھ تھا وہ سب تو میں پہنچا چکا ہوں، لیکن یہ ایک بات ہے جو میں ابھی تک نہیں پہنچا پایا ہوں۔ اب ظاہر ہے کہ ایک آدمی اتنی ساری چیزوں کا خیال رکھتے ہوئے اور اتنے اہتمام سے مرتے وقت آخر میں یہ چیز بتا کر گیا ہو، تو پھر دوسرا جو خطرہ والا پہلو تھا وہ باقی نہیں رہے گا۔ اس لئے انہوں نے اس بات کی خبر دیدی، اور اپنا ذمہ بھی پورا کر دیا۔

اس روایت میں ایمان والوں کے واسطے بہت بڑی بشارت ہے کہ جو آدمی سچے دل سے ایمان لاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کو حرام کر دیتے ہیں۔

اہم اور قابلِ فہم بحث

یہاں ایک بات یاد رہے کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ جو کلمہ پڑھے گا وہ جنت میں جائے گا، اور جو فلاں گناہ کرے گا وہ جہنم میں جائے گا۔ شرک کی وجہ سے کبھی جنت میں نہیں جاسکتا۔ غرض کہ مختلف باتوں پر مختلف چیزیں سنائی گئیں ہیں۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں دراصل ہر عمل کی ایک خاصیت بتلائی ہے، جیسے ڈاکٹری اور طب کی جو کتابیں ہوتی ہیں ان میں ایک تو کتابیں وہ ہوتی ہیں جن میں مفردات کو بتایا جاتا۔ یعنی ایک جڑی بوٹی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس کی خاصیت یہ ہے، اگر اس کو کھاؤ گے تو یہ ہوگا۔ دوسری جڑی بوٹی کی خاصیت یہ بتائی ہے کہ اس کو کھاؤ گے تو یہ ہوگا۔ ہر ایک کی الگ الگ خاصیت بتائی گئی ہے۔ مفردات میں یہی ہوا کرتا ہے۔

اسی طرح یہاں اعمال کے متعلق آیا کہ مثلاً کسی کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر ہو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ اور دوسری طرف یہ بھی آیا ہے کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جنت میں جائے گا۔ اب سوال پیدا ہوا کہ یہ کیا بات ہے؟ بظاہر ان دونوں باتوں میں تعارض سا معلوم ہوتا ہے۔ تو دراصل ہر عمل کا الگ الگ خاصہ بتلایا گیا ہے۔ فقط ایمان کی خاصیت یہ بتلائی کہ وہ جنت میں لے جائے گا۔ اور اِدھر کبر کی خاصیت اور نقصان یہ بتلایا کہ وہ جہنم میں لے جائے گا۔ تو جن احادیث میں اس طرح مختلف اعمال پر مختلف چیزیں بتلائی گئی ہیں وہ دراصل ہر ہر عمل کا الگ الگ خاصہ بتلایا گیا ہے، لیکن اب اگر اس طرح کی کئی چیزیں جمع ہوجائیں تو کیا ہوگا؟

اس کو اسی مثال سے سمجھئے کہ جیسے کوئی طبیب یہ بتلائے کہ کیلا کھاؤ گے تو سردی ہوجائے گی، اور الائچی کھاؤ گے تو گرمی ہوجائے گی۔ تو الائچی اور کیلے کی خاصیت الگ

الگ بتلائی، لیکن کسی نے الائچی بھی کھائی اور کیلا بھی کھایا؛ تو اب کیا ہوگا؟ وہ اس طبیب نے نہیں بتلایا تھا۔ اس لئے اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ دونوں چیزیں اندر جا کر کیا اثر دکھلاتی ہیں اور اس کی طبیعت ان دونوں کا کیا اثر لیتی ہے، اور اندر دونوں کے جمع ہونے کے بعد کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے، اور کون کس پر غالب آتا ہے، یہ ایک الگ چیز ہے جو بعد میں جا کر پتہ چلے گی۔

اسی طریقہ سے یہاں پر بھی ہے کہ نیک اعمال کی خاصیتیں بتلائی ہیں کہ فلاں نیک عمل کی وجہ سے یہ ہوگا، اور فلاں عمل کی وجہ سے یہ ملے گا۔ اور اسی طرح برے اعمال اور گناہوں کا نقصان بتلایا کہ یہ کرو گے تو یہ ہوگا اور یہ کرو گے تو یہ ہوگا۔ ہر عمل کو الگ الگ کر کے بتلایا۔ اب اگر دونوں جمع ہو جائیں تو کیا ہوگا؟ تو وہ تو وہاں جا کر ہی پتہ چلے گا لیکن یہ بات ضرور ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کہنے والا جنت میں ضرور جائے گا۔ یہ بڑی اہم اور قابلِ فہم بحث ہے، اس لئے اس کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔

خیر! باب کا عنوان قائم کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ سے امید رکھنی چاہیے تو جو بھی اہلِ ایمان ہیں ان کے لئے اس روایت سے بہت بڑی امید قائم ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ سے ان کی حفاظت فرمائیں گے۔

ان دو چیزوں کو لے کر جائے

۴۱۶ - وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَوْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيْ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا (شَكَّ الرَّاوِيْ، وَلاَ يَضُرُّ الشَّكُّ فِيْ عَيْنِ الصَّحَابِيْ؛ لِأَنَّهُمْ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ) قَالَ: لَمَّا كَانَ غَزْوَةُ تَبُوْكَ، أَصَابَ النَّاسَ مَجَاعَةٌ، فَقَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللهِ! لَوْ أَذِنْتَ لَنَا فَنَحَرْنَا نَوَاضِحَنَا فَأَكَلْنَا وَادَّهَنَّا؟ فَقَالَ: رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: افْعَلُوْا۔ فَجَاءَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ فَقَالَ:

يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنْ فَعَلْتَ قَلَّ الظَّهْرُ، وَلٰكِنِ ادْعُهُمْ بِفَضْلِ أَزْوَادِهِمْ، ثُمَّ ادْعُ اللّٰهَ لَهُمْ عَلَيْهَا بِالْبَرَكَةِ، لَعَلَّ اللّٰهَ أَنْ يَجْعَلَ فِيْ ذٰلِكَ الْبَرَكَةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: نَعَمْ. فَدَعَا بِنَطْعٍ فَبَسَطَهُ، ثُمَّ دَعَا بِفَضْلِ أَزْوَادِهِمْ، فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَجِيْءُ بِكَفِّ ذُرَّةٍ وَيَجِيْءُ بِكَفِّ تَمْرٍ وَيَجِيْءُ الآخَرُ بِكِسْرَةٍ حَتّٰى اجْتَمَعَ عَلَى النَّطْعِ مِنْ ذٰلِكَ شَيْءٌ يَسِيْرٌ، فَدَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالْبَرَكَةِ. ثُمَّ قَالَ: خُذُوْا فِيْ أَوْعِيَتِكُمْ فَأَخَذُوْا فِيْ أَوْعِيَتِهِمْ حَتّٰى مَاتَرَكُوْا فِي الْعَسْكَرِ وِعَاءً إِلَّا مَلَأُوْهُ وَأَكَلُوْا حَتّٰى شَبِعُوْا وَفَضَلَ فُضْلَةٌ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ. لَا يَلْقَى اللّٰهَ بِهِمَا عَبْدٌ غَيْرَ شَاكٍّ فَيُحْجَبَ عَنِ الْجَنَّةِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح: - حضرت ابو ہریرہ یا حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب غزوۂ تبوک ہوا تو لوگوں کو بڑی بھوک کا سامنا ہوا (یعنی اس غزوہ میں سامانِ سفر زیادہ نہیں تھا، اس کی وجہ سے دورانِ سفر فاقے بھی بہت ہوئے) تو حضراتِ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنے اونٹوں کو ذبح کریں اور اس کا گوشت کھانے میں استعمال کرلیں ("نَوَاضِح"، "نَاضِحَةٌ" کی جمع ہے، پانی کھینچنے کے لئے جو اونٹ ہوا کرتا ہے، اس کے لیے بولا جاتا ہے، لیکن یہاں مطلق اونٹ مراد ہے) اور اس کی چربی سے جو تیل نکلے اس کو جسموں پر لگائیں (گرمی کی وجہ جسم کی کھال جو سخت ہوجاتی وہ بھی نرم رہے گی) نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے ایسا کرلو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ویسے بھی سواریوں کی کمی ہے (ایک اونٹ پر باری باری کئی کئی آدمی سوار ہوتے ہیں) اگر آپ اونٹوں کو ذبح کرنے کی اجازت دیدیں گے تو (ابھی سفر جاری ہے) سواریاں اور بھی کم ہوجائیں گی، اس لئے آپ ایسا کیجئے کہ لوگوں کو حکم دیجئے کہ ہر ایک کے توشہ دان میں جو کچھ بچا کھچا ہو، وہ حاضر کریں اور جب سب آجائے تو آپ اللہ تعالیٰ سے دعا

فرمایئے، اللہ تعالیٰ آپ کی دعا کی برکت سے سب کی ضرورتیں پوری کردے گا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں! یہ بات ٹھیک ہے۔ چناں چہ ایک چمڑا لایا گیا (جو عام طور پر اُس زمانہ میں دستر خوان کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا) اس کو بچھا کر اعلان کردیا گیا کہ جس کے توشہ دان میں جو کچھ بچا ہو، سب لاؤ اور یہاں جمع کردو۔ چنانچہ جس کے پاس جو کچھ تھا وہ لے آیا، کوئی آدمی صرف ایک مٹھی مکئی لے کر آیا، اور کوئی ایک مٹھی کھجور لے کر آیا، کسی کے پاس روٹی کا ایک ٹکڑا تھا تو وہ لے کر آیا۔ جس کے پاس جو کچھ تھا وہ سب لا کر اس چمڑے پر ڈال دیا، یہاں تک کہ پورے لشکر کے پاس سے ملا کر اس چمڑے کے ٹکڑے پر بہت قلیل مقدار جمع ہوگئی (حالاں کہ ایک قول کے مطابق چالیس ہزار کا لشکر تھا، اور ایک قول کے مطابق ستر ہزار کا لشکر تھا) خیر! نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے برکت کی دعا فرمائی اور فرمایا کہ اپنے اپنے برتن بھرلو۔ چناں چہ سب نے اپنے برتنوں کو بھرنا شروع کیا تو پورے لشکر میں کوئی برتن ایسا نہیں بچا جو بھر نہ گیا ہو (چالیس ہزار کے لشکر کے پاس جتنے برتن تھے وہ سب بھر گئے) اور اس میں سے سب نے کھایا، یہاں تک کہ سب نے پیٹ بھر کر کھایا پھر بھی اس میں بچ گیا (یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کی برکت تھی) پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنِّي رَسُوْلُ اللهِ'' میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ (ایسا کوئی بھی معجزہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک پر ظاہر ہوتا تھا یا آپ کی بیان فرمائی ہوئی کوئی پیشین گوئی رونما ہوتی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ جملہ ارشاد فرماتے تھے کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ گویا آپ کے رسول ہونے کی ایک علامت اور نشانی لوگوں کے سامنے ظاہر ہوئی جس کو دیکھ کر لوگ اس کو تسلیم کر رہے ہیں اور ویسے بھی وہ تو اہلِ ایمان تھے گویا ان کو مزید ثبوت فراہم ہوا۔)

(پھر حضور نے فرمایا) جو اللہ کا بندہ ان دونوں چیزوں کو (یعنی توحید و رسالت؛

اللہ تعالیٰ کی الوہیت، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اللہ کا رسول ہونے کا اقرار) لے کر اللہ تعالیٰ کے پاس جائے گا کہ اس کے دل میں توحید و رسالت کے بارے میں ذرہ برابر تردّد اور شک وشبہ نہیں ہوگا (جس کو یقین کہتے ہیں) تو پھر اس کے اور جنت کے درمیان کوئی حجاب اور پردہ نہیں ہوگا

افادات:- کوئی آدمی اگر یہ دو چیزیں- توحید اور رسالت کا اقرار- لے کر اللہ کے دربار میں پہنچ گیا تو پھر وہ جنت سے روکا نہیں جائے گا، اس کو جنت میں داخلے کا پروانہ مل جائے گا۔ گویا یہ بھی بہت بڑی بشارت ہے، اس لئے اس روایت کو امید والے باب میں ذکر کیا گیا ہے۔

غزوۂ تبوک

غزوۂ تبوک ۹ھ میں ہوا تھا۔ ''تبوک'' جزیرۃ العرب میں مدینہ منورہ سے شام جاتے ہوئے ایک علاقہ ہے اور وہیں سے قیصرِ روم کی مملکت کے حدود شروع ہوتے تھے، شام کے نبطی سوداگر زیتون کا تیل فروخت کرنے مدینہ منورہ آیا کرتے تھے، ان کے ذریعہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ خبر ملی کہ قیصرِ روم نے ایک بہت بڑا لشکر مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا ہے، جس کا مقدمۃ الجیش مقامِ بلقاء تک پہنچ گیا ہے اور ہرقل نے تمام فوج کو سال بھر کی تنخواہیں بھی تقسیم کردی ہیں۔ اور پھر اس علاقہ میں غسان، بنو قین وغیرہ جو قبائل آباد ہیں، وہ بھی اس کے ساتھ مل گئے ہیں، اور وہ سب مل کر مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا کہ وہ ہم پر لشکر لے کر آویں، اس سے پہلے ہم ہی جا کر ان سے مقابلہ کریں گے۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرام کو تیاری کا حکم دیا۔ چوں کہ یہاں مقابلہ دنیا کی ایک بہت بڑی حکومت اور سلطنت سے تھا جو اس زمانہ کی سپر پاور سمجھی جاتی تھی۔ اُس زمانہ میں

دو ہی حکومتیں سپر پاور تھی، ایک تو یہی روم کی حکومت تھی جس کا بادشاہ قیصر کہلاتا تھا اور دوسری فارس کی حکومت تھی جس کا بادشاہ کسریٰ کہلاتا تھا۔ تو یہاں روم والوں کی طرف سے لشکر آرہا تھا، اور اِدھر مدینہ منورہ میں جو مسلمان آباد تھے ان کا حال جو تھا وہ سب کے علم میں ہے، اس لیے اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرام کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی۔ اس لیے کہ جنگ کی تیاری کے لئے سواریوں اور ہتھیاروں وغیرہ بہت کچھ چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے، اور اس زمانہ میں الگ سے تو کوئی نظام تھا نہیں، جیسے آج کل تمام ممالک کے بجٹ کے اندر اس کے لیے ایک الگ سے حصہ رکھا جاتا ہے۔ اور ہر مسلمان کے اوپر فوجی تعلیم ضروری ہے، وقت آنے پر جب یہ کہا جائے کہ جہاد کے لئے نکلنا ہے تو ہر ایک کے لئے نکلنا ضروری ہو جاتا ہے، اسلامی تعلیم یہی ہے۔ خیر! حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اعلان فرمادیا کہ تیاری کرو۔

روایتوں میں آتا ہے کہ ویسے تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب کسی دشمن کے مقابلہ کے لئے لشکر تیار کراتے تھے تو بتلاتے نہیں تھے کہ کہاں جانا ہے (بخاری شریف، ۴۴۱۸) جنگ کی مصلحت کا تقاضہ یہی ہوتا ہے، کسی مہم کو سر کرنے کے لئے جب کوئی ٹکڑی بھیجی جاتی ہے تو پہلے سے بتایا نہیں جاتا۔ اس کے سردار کو بھی عین وقت پر بتاتے ہیں اور وہ سردار بھی اپنے ساتھیوں کو تو بتاتا ہی نہیں، بلکہ ساتھ لے کر جاتا ہے کہ ایک جگہ جانا ہے اور یہی رازداری کا تقاضہ ہوا کرتا ہے۔ لیکن اس موقع پر چوں کہ دور کا سفر تھا اور مقابلہ بھی ایک طاقتور دشمن سے تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صاف صاف بتلادیا تھا کہ تبوک جانا ہے، اور فلاں دشمن سے مقابلہ ہے تاکہ جیسی پُرزور تیاری کرنا چاہیں وہ کرلیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے لوگوں سے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی اپیل کی تھی۔ چناں چہ یہ وہی موقع تھا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے جس کو جو حیثیت دی

تھی وہ اس کے مطابق لے کر حاضر ہوا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اللہ کے راستہ میں دینے کے لئے اپنے گھر کا سب کچھ لے کر حاضر ہوئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جو کچھ تھا اس کا آدھا لے کر آئے۔

کبھی ان سے آگے نہیں بڑھ سکتا

روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس وقت جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی تو مجھے معلوم تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ اس وقت کشادہ نہیں ہے، اور میری حالت اس وقت ذرا اچھی تھی، تو میں نے سوچا کہ اگر کسی موقع پر حضرت ابوبکر سے میں آگے بڑھ سکتا ہوں تو یہی موقع ہے، اس لئے میرے پاس جو کچھ تھا اس کا آدھا لے کر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُدھر حضرت ابوبکرؓ کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ سارا لے کر حاضر ہوئے۔ مربی کی شان دیکھئے کہ ویسے کبھی یہ پوچھا نہیں جاتا تھا کہ کیا لے کر آئے اور کیا چھوڑ کر آئے، لیکن اس روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ گھر پر کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ آدھا چھوڑ کر آیا ہوں۔ حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا: گھر پر کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ جو کچھ تھا وہ سب لے کر آیا ہوں۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ مَیں دل میں سوچنے لگا کہ مَیں کبھی ان سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ آپ سیرت کا مطالعہ کیجئے تو پتہ چلے گا کہ کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا سوال نہیں فرمایا، صرف یہی ایک موقع ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ پوچھا۔ اس میں بھی گویا ان لوگوں کی تربیت مقصود ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی قربانی

خیر! اس موقع پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی ترغیب

دی، اور لوگوں نے بھی اس وقت خوب خرچ کیا، سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے پورا مال پیش کیا جو تقریبا چار ہزار درہم تھے۔ حضرت عمرؓ آدھا مال لے کر حاضر خدمت ہوئے۔ اور جو بڑے مالدار صحابہ تھے جیسے حضرت عثمانؓ؛ انہوں نے نوسو (۹۰۰) اونٹ اور سو (۱۰۰) گھوڑے ساز وسامان کے ساتھ اور نقد روپئے الگ؛ اتنا سب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ دوسو اوقیہ چاندی لے کر حاضر ہوئے۔ حضرت عباسؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ، حضرت محمد بن مسلمہؓ اور حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہم اور دوسرے حضراتِ صحابہ میں سے ہر ایک نے اپنی حیثیت کے مطابق بہت کچھ دیا، یہاں تک کہ بعض حضرات کے پاس کچھ نہیں تھا تو انہوں نے مزدوری کی اور شام کو ایک یا دو صاع کھجوریں جو مزدوری میں ملیں، وہی لا کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیں۔ بہر حال! لشکر روانہ ہوا۔ (الرحیق المختوم) اور پھر اس سے پچھلے سال قحط سالی ہوگئی تھی اور اس وقت کھجوروں کے پکنے کا زمانہ تھا، شدید گرمی تھی، اور مدینہ والے چونکہ کھیتی باڑی والے لوگ تھے اور باغ والوں کی عادت ہوتی کہ وہ اپنا سب سامان لے کر باغات میں چلے جاتے ہیں، جیسے ہمارے یہاں بھی یہی ہوتا ہے کہ جن کے آم کے باغات ہوتے ہیں، جب آم کے پکنے کا زمانہ آتا ہے تو وہ پورے خاندان کے ساتھ باغ کے اندر چلے جاتے ہیں، وہیں چھوٹا سا مکان بنا ہوا ہوتا ہے، جب تک پوری فصل وصول نہ کرلیں تب تک وہیں قیام رہتا ہے۔ مدینہ والوں کے یہاں بھی یہی دستور تھا اور باغات کے اندر ٹھنڈک بھی اچھی ہوتی ہے۔ اُدھر کھجوروں کے کاٹنے کا عین وقت آیا تھا کہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے نکلنے کا مطالبہ ہوا۔ حضراتِ صحابہ تو ہر وقت تیار ہی رہتے تھے، وہ سب روانہ ہوئے۔ البتہ کچھ حضرات کی طرف سے تھوڑی سی کوتاہی ہوئی تو ان کو تنبیہ ہوئی۔ جب مقامِ تبوک پر پہنچے اور آپ

ﷺ نے وہاں قیام فرمایا تو کوئی لشکر نہیں آیا، روایتوں میں ہے کہ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے ایسا رعب ڈال دیا کہ ان کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ آپ ﷺ وہاں پندرہ روز اور ایک قول کے مطابق پچیس روز قیام پذیر رہے اور جنگ کی نوبت نہیں آئی، تو پھر وہاں سے واپس تشریف لائے۔ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا یہ آخری غزوہ تھا، اس کے بعد کوئی غزوہ پیش نہیں آیا۔

بَابُ الرَّجَآءِ

اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کا بیان

﴿ مجلس ۴ ﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ تعالیٰ کی ذات سے آدمی کو امید رکھنی چاہیے، یہ مضمون پچھلی کئی مجلسوں سے چل رہا ہے، اس سلسلہ میں احادیث بیان کر رہے ہیں۔

سچے دل سے کلمہ طیبہ پڑھنے پر وعدہ

۴۱۸ - وعَنْ عِتْبَان بن مالك رضی اللہ عنہ وَهُوَ مِمَّنْ شَهِدَ بَدْراً ، قَالَ : كُنْتُ أُصَلِّي لِقَوْمِي بَنِي سَالِمٍ، وَكَانَ يَحُوْلُ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ وَادٍ إِذَا جَاءَتِ الْأَمْطَارُ، فَيَشُقُّ عَلَيَّ اجْتِيَازُهُ قِبَلَ مَسْجِدِهِمْ، فَجِئْتُ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَقُلْتُ لَهُ: إِنِّي أَنْكَرْتُ بَصَرِي وإِنَّ الْوَادِيَ الَّذِي بَيْنِي وَبَيْن قَوْمِي يَسِيْلُ إِذَا جَاءَتِ الْأَمْطَارُ فَيَشُقُّ عَلَيَّ اجْتِيَازُهُ فَوَدِدْتُ أَنَّكَ تَأْتِيْ فتُصَلِّيْ فِيْ بَيْتِي مَكَاناً أَتَّخِذُهُ مَصَلًّى . فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم : سَأَفْعَلُ . فَغَدَا رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَأَبُوْ بَكْرٍ رضی اللہ عنہ بَعْدَ مَا اشْتَدَّ النَّهَارُ۔ وَاسْتَأْذَنَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَأَذِنتُ لَهُ ، فَلَمْ يَجْلِسْ حَتَّى قَالَ: أَيْنَ تُحِبُّ أَنْ أُصَلِّيَ مِنْ بَيْتِكَ ؟ فَأَشَرْتُ لَهُ إِلَى الْمَكَانِ الَّذِيْ أُحِبُّ أَنْ يُصَلِّيَ فِيْهِ۔ فَقَامَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَكَبَّرَ وَصَفَفْنَا وَرَآءَهُ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ وَسَلَّمْنَا حِيْنَ سَلَّمَ ۔ فَحَبَسْتُهُ عَلٰى خَزِيْرَةٍ تُصْنَعُ لَهُ۔ فَسَمِعَ أَهْلُ الدَّارِ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فِيْ بَيْتِيْ . فَثَابَ رِجَالٌ مِنْهُمْ حَتّٰى كَثُرَ الرِّجَالُ فِي الْبَيْتِ . فَقَالَ رَجُلٌ: مَا فَعَلَ مَالِكٌ لاَ أَرَاهُ! فَقَالَ رَجُلٌ : ذٰلِكَ مُنَافِقٌ، لاَ يُحِبُّ اللهَ وَرَسُوْلَهُ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لاَ تَقُلْ ذٰلِكَ، أَلاَ تَرَاهُ قَالَ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ يَبْتَغِيْ بِذٰلِكَ وَجْهَ اللهِ تَعَالٰى. فَقَالَ: أَللهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ ۔ أَمَّا نَحْنُ فَوَاللهِ مَا نَرَى وُدَّهُ وَلاَ حَدِيْثَهُ إِلاَّ إِلَى الْمُنَافِقِيْنَ . فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: فَإِنَّ اللهَ قَدْ حَرَّمَ عَلٰى

النَّارِ مَنْ قَالَ لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ يَبْتَغِي بِذٰلِكَ وَجْهَ اللّٰهِ۔ (متفق علیه)

وَ(عِتْبَانَ) بِكَسْرِ الْعَيْنِ الْمُهْمَلَةِ واسكان التاء المثناة وبعدها باء موحدة۔ وَ(الْخَزِيْرَةُ) بالخاء المعجمة والزاى: هِيَ دَقِيْقٌ يُطْبَخُ بِشَحْمٍ۔ وَقَوْلُهُ: (ثَابَ رِجَالٌ) بالثَّاءِ الْمُثَلَّثَةِ: أَيْ جَاؤُوْا وَاجْتَمَعُوْا۔

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عتبان بن مالک انصاریؓ (صحابی ہیں اور یہ ان حضرات میں سے ہیں جو غزوۂ بدر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے ہیں) فرماتے ہیں کہ میں اپنے قبیلہ بنو سالم والوں کو نماز پڑھایا کرتا تھا (گویا وہ اپنے قبیلے والوں کے امام تھے) میرے قبیلے کی جو مسجد تھی اس کے اور میرے گھر کے درمیان ایک وادی اور ایسی نشیبی جگہ پڑتی تھی کہ جہاں بارش کے زمانہ میں پانی بھر جاتا تھا، جس کی وجہ سے بارش کے زمانہ میں اس وادی کو پار کر کے مسجد تک پہنچنا میرے لئے مشکل ہوا کرتا تھا۔ (جب تک بینائی ٹھیک رہی وہاں تک تو وہ اس مشکل کے باوجود بھی آتا رہا۔ لیکن جب بینائی میں کمزوری آگئی تو) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میری نگاہیں کچھ کمزور ہوگئیں ہیں، اور یہ وادی جو میرے گھر اور محلہ کی مسجد کے درمیان میں پڑتی ہے وہ بارش کے زمانہ میں بھر جاتی ہے اور میرے لئے اس کا پار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ (گویا میں مسجد تک جا نہیں سکتا) اس لئے میری دلی تمنا ہے کہ اللہ کے رسول! آپ میرے گھر تشریف لایئے، اور میرے گھر میں کسی جگہ پر نماز ادا فرمالیجئے، تاکہ میں اپنے گھر کی اس جگہ کو اپنے لئے نماز کی جگہ کے طور پر مقرر کرلوں (جس کو گھر کی مسجد کہا جاتا ہے) چناں چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان شاء اللہ آؤں گا (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے وعدہ فرمالیا) حضرت عتبانؓ فرماتے ہیں کہ دوسرے روز چاشت کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ میرے یہاں تشریف لائے اور گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کی، میں نے اجازت دی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اندر تشریف لائے تو

آتے ہی بیٹھنے سے پہلے آپ نے مجھ سے فرمایا کہ تم کون سی جگہ کو مسجد بنانا چاہتے ہو؟ میں نے ایک جگہ کی طرف اشارہ کر دیا، آپ اس جگہ تشریف لے گئے اور نماز کی نیت باندھ لی، تو ہم نے بھی آپ کے پیچھے صف بنا کر نیت باندھ لی (ویسے کوئی آدمی اس طرح نفل پڑھ رہا ہو تو اس کے پیچھے نیت باندھنے کی اجازت ہے، لیکن دو آدمی سے زیادہ نہیں ہونے چاہئیں) آپ ﷺ نے دو رکعات نماز ادا فرمائی (جب آپ ان کے مکان پر تشریف لائے تھے تو ظاہر ہے کہ گھر والے آسانی سے تو چھوڑتے نہیں) چناں چہ ہم نے نبی کریم ﷺ کی تواضع کے لیے خزیرہ پیش کیا۔ اور جب نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کی محلہ والوں کو اطلاع ہوئی تو بہت سارے لوگ میرے گھر میں جمع ہو گئے، ان میں سے ایک آدمی نے کہا کہ کیا بات ہے کہ مالک بن دخیشن نظر نہیں آتے؟ (یہ ایک صحابی ہیں جو اسی محلہ میں رہتے تھے، اور اتفاق کی بات کہ وہ اس وقت محلے میں نہیں ہوں گے، ورنہ ظاہر ہے کہ ان کو اطلاع ملتی تو وہ نبی کریم ﷺ کی ملاقات کے لیے ضرور آتے، لیکن جب وہ نظر نہیں آئے تو ایک آدمی نے موقع پا کر یہ تذکرہ چھیڑا کہ محلہ کے سب لوگ آئے، لیکن مالک نظر نہیں آتے، کیا بات ہے؟ جب اس نے یہ سوال قائم کیا) تو دوسرے نے کہا کہ وہ تو منافق آدمی ہے، اللہ اور اس کے رسول سے محبت نہیں رکھتا۔ جب دوسرے نے یہ کہا تو اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایسا مت بولو کیا تمہیں معلوم نہیں کہ انہوں نے خالص دل سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کرنے کے لیے لا الٰہ الا اللہ کہا ہے؟ (گویا حضور اکرم ﷺ نے ان کے متعلق پکے مؤمن ہونے کی گواہی دے دی۔ اس پر وہ صحابی خاموش ہو گئے) اور کہا کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں، لیکن میں نے تو یہ بات اس لیے کہی تھی کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا اور ملنا جلنا منافقین سے زیادہ ہوتا ہے۔ پھر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم کو اس آدمی پر حرام کر دیا ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے۔

افادات:- یہ روایت اسی لیے لائے ہیں کہ دیکھئے! سچے دل سے صرف کلمہ طیبہ پڑھنے پر اور دل سے اس کو مان لینے پر یہ وعدہ ہے۔ منافقین بھی زبان سے کلمہ پڑھتے تھے لیکن دل میں دوسری بات ہوتی تھی۔ اب ظاہر ہے کہ مؤمنین کے لئے یہ کتنی بڑی امید کی چیز ہے۔

گھر کی مسجد بھی ہونی چاہیے

اس روایت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ آدمی کو چاہیے کہ اپنے گھر کی کسی جگہ کو نماز کے لیے مخصوص کر لے، تاکہ گھر والوں میں سے جس کسی کو نماز پڑھنی ہو تو اسی جگہ پر نماز ادا کریں، اور اس جگہ کو پاک صاف رکھنے کا اہتمام کیا جائے۔ اس لیے کہ اگر کوئی جگہ مقرر نہیں ہوگی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی پاکی اور صفائی کا جتنا اہتمام ہونا چاہیے وہ نہیں ہو پائے گا۔ بچوں والا گھر ہوتا ہے تو ہر جگہ بچے گھومتے پھرتے رہتے ہیں کہیں پیشاب پاخانہ کر دیتے ہیں اور ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو پاکی ناپاکی سے واقف نہیں ہوتے، تو اگر گھر کے اندر نماز کے لیے کوئی جگہ مقرر نہیں کریں گے تو ظاہر ہے کہ کوئی اہتمام اور فکر نہیں ہوگی۔ اس کے بجائے اگر ایک جگہ مقرر کر لی جائے گی تو گھر والے تمام افراد بھی اس جگہ کی پاکی کا خاص اہتمام کریں گے، اور اس جگہ کو ناپاکی سے بچانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ اس لیے تاکید آئی ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ اپنے گھر کی کسی مناسب جگہ کو نماز کے لیے مقرر کر لے۔ اسی کو فقہاء کی اصطلاح میں اور کتابوں میں گھر کی مسجد کہا جاتا ہے۔ اور مرد تو محلے کی مسجد میں جہاں وہ نماز پڑھتے ہیں وہاں اعتکاف کرتے ہیں، لیکن عورتوں کے لیے اعتکاف کا مسئلہ آتا ہے کہ عورتیں کہاں اعتکاف کریں گی؟ تو آپ نے پڑھا ہوگا کہ عورتیں اپنے گھر کی مسجد میں اعتکاف کریں

یعنی گھر کی اس جگہ میں اعتکاف کریں جس کو نماز کے لئے مقرر کیا ہے۔اب اگر کوئی یہ سوال کرے کہ ہمارے گھر میں تو کوئی ایسی جگہ متعین نہیں ہے تو ہم کیا کریں؟ تو علماء فرماتے ہیں کہ آج تک نہیں تھی تو اب مقرر کر لیجئے، اور آئندہ اسی جگہ پر نماز پڑھا کیجئے اور وہیں اعتکاف کر لیا کیجئے، اور اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔

خزیرہ کیا چیز ہے؟ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تشریح فرمائی ہے کہ آٹے کو چربی ڈال کر پکایا جاتا ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس میں گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی ڈال دیتے ہیں، جب وہ خوب پک جاتا ہے اور پانی خشک ہو جاتا ہے؛ اسی کو خزیرہ کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو بندوں سے ماں سے زیادہ محبت ہے

۴۱۸۔ عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قَالَ: قَدِمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بَسَبْيٍ۔ فَإِذَا امْرَأَةٌ مِنَ السَّبْيِ تَسْعٰى۔ إِذْ وَجَدَتْ صَبِيًّا فِي السَّبْيِ أَخَذَتْهُ فَأَلْزَقَتْهُ بِبَطْنِهَا، فَأَرْضَعَتْهُ۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: أَتَرَوْنَ هٰذِهِ الْمَرْأَةَ طَارِحَةً وَلَدَهَا فِي النَّارِ؟ قُلْنَا: لَا وَاللّٰهِ۔ فَقَالَ: لَلّٰهُ أَرْحَمُ بِعِبَادِهِ مِنْ هٰذِهِ بِوَلَدِهَا. (متفق علیه)

ترجمہ مع تشریح:۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کچھ قیدی لائے گئے، ان قیدیوں میں عورتیں اور بچے بھی تھے، ان میں ایک عورت تھی (جس کا دودھ پیتا بچہ ہوگا۔ اور دودھ پلانے والی جو عورت ہوتی ہے اس کی چھاتی میں جب دودھ بھر جاتا ہے، تو اس کو بے چینی ہوتی ہے، جب تک بچے کو دودھ نہ پلائے وہاں تک اس کو چین نہیں پڑتا۔ تو اس عورت کی چھاتی جب دودھ سے بھر گئی اور اس کا بچہ اس کے پاس نہیں تھا اس لئے) وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھی اور جو بھی بچہ اس کو مل جاتا اس کو

اُٹھا لیتی اور اپنے سینے سے چپکا لیتی اور اس کو دودھ پلا دیتی۔ نبی کریم ﷺ نے جب یہ منظر دیکھا تو حضراتِ صحابہ سے پوچھا کہ بتلاؤ! اگر اس عورت کو اس کا بچہ مل جائے تو کیا یہ دیدہ ودانستہ اپنے بچے کو آگ میں کبھی ڈال سکتی ہے؟ (جو اپنے بچے کے لئے اتنی بے چین ہے اور جس کی یہ کیفیت ہے کہ کسی پل اس کو اطمینان وسکون نہیں، تو کیا وہ اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں) ہم نے جواب دیا کہ اللہ کی قسم! کبھی نہیں ڈال سکتی۔ اس پر حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس عورت کو اپنے بچے کے ساتھ جتنی محبت، شفقت اور مہربانی ہے؛ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے زیادہ محبت وشفقت اور مہربانی ہے۔

افادات:- تو اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں کو جہنم میں نہیں ڈالے گا، لیکن جو آدمی باوجود روکے جانے کے خود ہی جہنم میں جاوے؛ تو اس کا کوئی علاج نہیں۔

رحمت غضب پر غالب ہے

۴۱۹ - وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: لَمَّا خَلَقَ اللهُ الْخَلْقَ كَتَبَ فِيْ كِتَابٍ، فَهُوَ عِنْدَهُ فَوْقَ الْعَرْشِ: إِنَّ رَحْمَتِيْ تَغْلِبُ غَضَبِيْ۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ: غَلَبَتْ غَضَبِيْ۔ وَفِيْ رِوَايَةٍ: سَبَقَتْ غَضَبِيْ۔ (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا کیا تو ایک صحیفے میں ایک جملہ لکھ دیا اور وہ عرش کے اوپر اس کے پاس محفوظ ہے کہ ''میری رحمت میرے غضب کے اوپر غالب ہے''۔

بعض روایتوں میں ہے: میری رحمت میرے غضب سے آگے نکل جاتی ہے۔

افادات:- دنیا کے اندر ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بے انتہاء نافرمانیاں

ہوتی ہیں، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ ہر ایک کو روزی پہنچا رہے ہیں، ہر ایک کی ضرورتیں پوری کر رہے ہیں، جو لوگ اللہ تعالیٰ کے بڑے نافرمان ہیں ان کو بھی روزی دی جاتی ہے۔ آپ ہی بتلائیں کہ یہ سارے اختیارات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت میں رکھے ہیں اگر وہ اختیارات ہمیں دیئے جاتے تو کیا ہم اپنے کسی مخالف کو ایک دانہ بھی دیتے؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی ہے جس کے نتیجہ میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے سارے بندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام کیا ہے، گویا اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے۔ بہت ہی کم اس کے غضب کا ظہور ہوتا ہے، ورنہ جہاں دیکھو گے آپ کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مظاہر ہی نظر آئیں گے۔

رحمت کے ایک حصہ کا کمال

۴۲۰- وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: جَعَلَ اللهُ الرَّحْمَةَ مِئَةَ جُزْءٍ، فَأَمْسَكَ عِنْدَهُ تِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ، وَأَنْزَلَ فِي الْأَرْضِ جُزْءًا وَاحِداً، فَمِنْ ذَالِكَ الْجُزْءِ يَتَرَاحَمُ الْخَلَائِقُ، حَتَّى تَرْفَعُ الدَّابَّةُ حَافِرَهَا عَنْ وَلَدِهَا خَشْيَةَ أَنْ تُصِيْبَهُ.

وَفِيْ رِوَايَةٍ: إِنَّ لِلّٰهِ تَعَالَى مِئَةَ رَحْمَةٍ أَنْزَلَ مِنْهَا رَحْمَةً وَاحِدَةً بَيْنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالْبَهَائِمِ وَالْهَوَامِّ. فَبِهَا يَتَعَاطَفُوْنَ، وَبِهَا يَتَرَاحَمُوْنَ، وَبِهَا تَعْطِفُ الْوَحْشُ عَلَى وَلَدِهَا، وَأَخَّرَ اللهُ تَعَالَى تِسْعاً وَتِسْعِيْنَ رَحْمَةً، يَرْحَمُ بِهَا عِبَادَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (متفق عَلَيْهِ)

رواه مسلم أيضًا من رِوَايَة سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: إِنَّ لِلّٰهِ تعالى مِئَةَ رَحْمَةٍ، فَمِنْهَا رَحْمَةٌ يَتَرَاحَمُ بِهَا الْخَلْقُ بَيْنَهُمْ، وَتِسْعٌ وَتِسْعُوْنَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ۔

وَفِیْ رِوَایَۃٍ: إِنَّ اللهَ تَعَالٰی خَلَقَ یَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِئَۃَ رَحْمَۃٍ، کُلُّ رَحْمَۃٍ طِبَاقَ مَا بَیْنَ السَّمَاءِ إِلَی الْأَرْضِ، فَجَعَلَ مِنْهَا فِی الْأَرْضِ رَحْمَۃً، فَبِهَا تَعْطِفُ الْوَالِدَۃُ عَلٰی وَلَدِهَا ، وَالْوَحْشُ وَالطَّیْرُ بَعْضُهَا عَلٰی بَعْضٍ، فَإِذَا کَانَ یَوْمُ الْقِیَامَۃِ أَکْمَلَهَا بِهٰذِهِ الرَّحْمَۃِ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو حصے کئے، ان میں سے ننانوے حصے اپنے پاس رہنے دیئے، اور ایک حصہ یعنی سوواں حصہ زمین پر اتارا۔ دنیا کی ساری مخلوقات؛ چاہے وہ جنات ہوں یا انسان، چوپائے ہوں یا درندے، ان سب میں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت، مہربانی اور شفقت کا جو سلوک (آپ دیکھ رہے ہیں وہ) اسی رحمت کے سوویں حصہ کا اثر ہے، شیر اور شیرنی بھی اپنے بچوں کے ساتھ اور بھیڑیا اپنے بچے کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں۔

دوسری روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ سوواں حصہ جنات، انسانوں چوپایوں اور زمین کے کیڑوں مکوڑوں میں اور تمام جانوروں میں تقسیم کر دیا، اور اسی ایک حصہ کا یہ اثر ہے کہ یہ ساری مخلوق آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت و مہربانی اور شفقت کا معاملہ کر رہی ہے۔ اور اسی ایک حصہ کا یہ نتیجہ ہے کہ درندہ بھی اپنی اولاد کے ساتھ محبت کرتا ہے۔ اور گھوڑا اپنا پاؤں اونچا رکھتا ہے تاکہ اس کا بچہ دب نہ جائے (خاص کر گھوڑی میں آپ یہ بات دیکھیں گے کہ اس کے پاس جب اس کا بچہ بیٹھا ہوا ہوتا ہے تو گھوڑی اپنا آگے والا پاؤں اونچا ہی رکھتی ہے اور وہ بچہ جب کھیل رہا ہوتا ہے تب ہی وہ اپنا وہ پیر رکھتی ہے، ورنہ وہ اسی ڈر سے اپنے پاؤں کو اُٹھائے رکھتی ہے کہ کہیں بچہ میرے پاؤں کے نیچے دب نہ جائے۔ تو آخر ایک جانور کے اندر اپنے بچہ کے ساتھ محبت کی یہ بات کہاں سے آئی؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ رحمت کا وہ سوواں حصہ جو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اتارا ہے؛ یہ سب اسی کا

اثر ہے) پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے بقیہ ننانوے حصے اپنے پاس رہنے دیئے ہیں ان ننانوے حصوں کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اپنے بندوں کے ساتھ رحمت ومہربانی کا معاملہ کریں گے۔

افادات:- جب رحمت کے ایک پرسینٹ (۱رفیصد) کی وجہ سے ان نافرمانیوں کے باوجود ساری دنیا قائم ہے، تو جب آخرت میں بقیہ ننانوے حصوں کا اثر ظاہر ہوگا؛ تو پھر کیا کچھ نہ ہوگا؟ یہ بات سن کر ظاہر ہے کہ آدمی کو کتنی امید پیدا ہوسکتی ہے، اوراس کی وجہ سے آدمی کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید دل میں پیدا ہوتی ہے، اس لئے اس روایت کو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے امید والے باب میں ذکر کیا ہے۔

میرے بندے کو معلوم ہے

۴۲۱ - وعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فِيمَا يَحْكِي عَنْ رَبِّهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَىٰ قَالَ: أَذْنَبَ عَبْدٌ ذَنْباً فَقَالَ: أَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي ذَنْبِي. فَقَالَ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَىٰ: أَذْنَبَ عَبْدِي ذَنْباً، فَعَلِمَ أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ، وَيَأْخُذُ بِالذَّنْبِ. ثُمَّ عَادَ فَأَذْنَبَ، فَقَالَ: أَيْ رَبِّ اغْفِرْ لِي ذَنْبِي، فَقَالَ تَبَارَكَ وَتَعَالَىٰ: أَذْنَبَ عَبْدِي ذَنْباً، فَعَلِمَ أَنَّ لِي رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ، وَيَأْخُذُ بِالذَّنْبِ، قَدْ غَفَرْتُ لِعَبْدِي فَلْيَفْعَلْ مَا شَاءَ. (متفق عَلَيْهِ)

وقوله تعالىٰ: (فَلْيَفْعَلْ مَا شَاءَ) مَادَامَ يَفْعَلُ هٰكَذَا يُذْنِبُ وَيَتُوبُ أَغْفِرُ لَهُ فَإِنَّ التَّوْبَةَ تَهْدِمُ مَا قَبْلَهَا.

ترجمہ:- یہ حدیثِ قدسی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جب کوئی بندہ گناہ کرتا ہے، پھر وہ اپنے گناہ کی معافی مانگتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ عرض کرتا ہے کہ اے اللہ! میرے گناہ کو معاف کردے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے نے ایک گناہ کیا اوراس کو معلوم ہے کہ میرا

ایک رب و مالک ہے جو میرے گناہ کو معاف کرتا ہے اور گناہ پر پکڑ بھی کرتا ہے (گویا بندہ یہ جانتا ہے تب ہی تو مجھ سے عرض کر رہا ہے کہ یا اللہ! میرے گناہ کو معاف کردے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ وہ گناہ معاف کر دیتا ہے۔ پھر وہ آدمی دوبارہ اس گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، اور پھر عرض کرتا ہے کہ یا اللہ! میرے گناہ کو معاف کردے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندہ نے گناہ کیا، اور اس کو معلوم ہے کہ اس کا ایک رب و مالک ہے جو اس کے گناہ کو معاف کرتا ہے اور گناہ پر پکڑ بھی کرتا ہے۔ پھر بندہ تیسری مرتبہ گناہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے اللہ! میرے گناہ کو معاف کردے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ دیکھو! میرے بندے نے گناہ کیا اور وہ جانتا ہے اس کا ایک رب ہے جو گناہ کو معاف بھی کرتا ہے اور گناہ پر پکڑ بھی کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بندہ کو معاف کر دیا اب وہ جو چاہیے کرے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ جب وہ بندہ معافی مانگتا ہے تو میں معاف کر دیتا ہوں، گویا بندوں کے لئے ہر وقت توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا گنہگار ہو اور اس سے بار بار گناہ کا صدور ہوا ہو، تب بھی اس کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ میرا گناہ معاف ہوگا یا نہیں، بلکہ وہ جب بھی اللہ کی بارگاہ کے اندر اپنے گناہ کی معافی کے لئے درخواست پیش کرے گا، وہاں سے ذرہ برابر تاخیر نہیں ہوگی اور گناہ کی معافی آہی جائے گی۔

آدمی نڈر نہ بن جائے

باقی جیسا کہ پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ آدمی کو دیدہ ودانستہ گناہ کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ ایک تو آدمی بے حیائی کے ساتھ جرأت کر کے اللہ کا ڈر رکھے بغیر گناہ کرے۔ ایسے حالات میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کو یہ کہنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی کہ اے اللہ! میرے گناہ کو معاف کردے۔ ہاں! پھر بھی اگر

اس کی زبان سے ایسا جملہ نکلے گا تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے، لیکن عام طور پر ایسا جملہ اس کی زبان سے نکلتا ہی نہیں ہے۔ اور جس نے بے حیائی اور نڈر بن کر گناہ نہ کیا ہو، بلکہ نادانستہ ہو گیا ہو؛ اسے ہی ڈرتے ڈرتے یہ کہنے کی توفیق ہوتی ہے، یہاں پر یہ بتلانا ہے کہ کسی آدمی سے نادانستہ ایسا کام ہوا، یا جرأت کے ساتھ ہوا لیکن بعد میں ندامت ہوئی اور وہ توبہ کرے گا؛ تو پھر کیسا ہی بڑا گناہ کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دیتا ہے۔

آدمی جب بھی توبہ کرے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توبہ بار بار ٹوٹتی رہی تب بھی آدمی کو اس کی وجہ سے پشیماں ہونے کی، یا یہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں تو بار بار توبہ کرتا ہوں اور ٹوٹ جاتی ہے؛ اب کیا کروں؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی کوئی انتہا نہیں ہے، بس اتنا ہے کہ آدمی جب بھی توبہ کرے اس وقت توبہ کی حقیقت کو سامنے رکھے۔ ہر توبہ میں تین چیزیں ضروری ہیں، اور بعض میں چوتھا ایک حصہ بھی لگ جاتا ہے۔ لیکن عام طور پر توبہ میں تین چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ دل میں ندامت اور پچھتاوا ہو۔ ندامت کہتے ہی ہیں دل کے اندر تکلیف اور رنج ہونا کہ ہائے! میں نے یہ کیا کر ڈالا؟ تو ایک تو دل کے اندر ندامت کا احساس ہو، جیسے کوئی آدمی اپنے محبوب کو- جس کے ساتھ اس کو دلی تعلق ہے- ناراض کر لے، کوئی ایسا کام کر لے جس سے وہ ناراض ہو جائے، تو اس کے دل کو اس وقت تک چین ہی نہیں آتا جب تک کہ اس کو راضی نہ کر لے، اس کے لئے یہ تصور ہی سوہانِ روح ہوتا ہے کہ میرا محبوب مجھ سے ناراض ہو گیا۔ تو پہلی بات یہ ہے کہ دل میں ندامت ہو۔

دوسرا یہ ہے کہ اس گناہ کو چھوڑ دے۔ اور تیسرا یہ ہے کہ پختہ ارادہ کرے کہ آئندہ اس کام کو نہیں کروں گا۔ جس وقت توبہ کر رہا ہے اس وقت یہی ارادہ پختہ ہو۔ اس

وقت دل میں یہ نہ ہو کہ میں کروں گا، پھر چاہے اس توبہ کرنے کے دو منٹ بعد وہ کام ہو جائے۔ اس نے تو پکا ارادہ کیا تھا کہ میں نہیں کروں گا لیکن ہو گیا، تو پہلے جو توبہ کی تھی وہ اپنی جگہ پر صحیح تھی، اللہ نے اس پر گناہ معاف کر دیا۔ بعد میں دوبارہ جو گناہ ہوا اس کی وجہ سے پہلے والی توبہ پر کوئی زد نہیں پڑتی ہے، وہ اپنی جگہ درست ہے، اگر اس وقت یہ ارادہ تھا تو اللہ نے گناہوں کو معاف کر دیا ہے۔

توبہ کا مسئلہ بہت آسان ہے

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفیؒ تھے، وہ نوجوانوں کو جمع کر کے فرماتے تھے کہ بھائی دیکھو! توبہ کا مسئلہ بہت آسان ہے کہ بس! رات کو سوتے وقت پکا ارادہ کرلو اور توبہ کرلو؛ سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔ مولانا تقی صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سے عرض کیا: حضرت! توبہ کے اندر تو تین چیزیں ہیں، ایک تو ندامت، دوسرا اس گناہ کو چھوڑنا اور تیسرا پختہ ارادہ کرنا۔ اور آپ جو کہہ رہے ہیں کہ روزانہ رات کو سوتے وقت توبہ کرلو، تو ٹھیک ہے کہ ندامت بھی ہو سکتی ہے، ساتھ میں وہ گناہ بھی چھوڑ رہا ہے، لیکن تیسری شرط کہ "پختہ ارادہ کرلے" تو اگر دل میں ذرا بھی تردد ہے تو یہ شرط نہیں پائی جاتی ؟ تو حضرت نے فرمایا: پختہ ارادہ کا تعلق تو دل سے ہے، اور پختہ ارادہ کی حقیقت اتنی ہی ہے کہ آدمی یہ طے کر لے کہ آئندہ میں اس کام کو نہیں کروں گا۔ عرض کیا گیا کہ کبھی دل میں ہوتا ہے کہ کہیں میری توبہ ٹوٹ نہ جائے، اور میرا نفس غالب نہ آجائے، اور شیطان مجھ سے یہ کام کروالے گا تو؟ تو حضرت نے فرمایا: یہ جو اندیشہ اور خطرہ لگا ہوا ہے اور آپ ڈر رہے ہیں کہ کہیں ایسا ہو گیا تو کیا ہوگا؟ ایسا خطرہ

پختہ ارادہ کے منافی نہیں ہے۔ہم نے تو اپنے طور پر پختہ ارادہ کرلیا کہ آئندہ یہ کام نہیں کرنا ہے،اب ساتھ میں جو ڈر لگا ہوا ہے کہ کہیں ہمارا نفس غالب آ کر یا شیطان بہکاوے میں ڈال کر ہم سے یہ کام نہ کروالے؛تو یہ گمان ہمارے اس پختہ ارادے کے خلاف نہیں ہے۔اوراگر یہ ڈر ہے تو اس کا بھی ایک آسان علاج ہے کہ اس وقت ارادہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا بھی کرلے کہ اے باری تعالیٰ! میں نے تو پختہ ارادہ کرلیا کہ میں یہ کام نہیں کروں گا،لیکن میں کمزور ہوں اور میرا ارادہ بھی کمزور ہے، ہوسکتا ہے کہ میرا نفس مجھ پر غالب آجائے، یا شیطان بہکاوے میں ڈال دے،اس لئے اے اللہ! تو ہی مدد کرنے والا ہے،تو میری مدد کر اور نفس وشیطان کے مقابلہ میں مجھے ثابت قدم رکھ۔اس کے بعد بھی اگر گناہ ہوگیا تو اپنی پہلے والی توبہ تو پکی تھی،اب پھر سے دوبارہ ویسی ہی توبہ کرلے،توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے،آدمی جب چاہے توبہ کرلے۔

باقی یہ سوچنا کہ جب توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے تو گناہ کرلو۔تو جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ کسی کے پاس کتنا ہی بڑھیا مرہم کیوں نہ ہو،اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ چھری لے کر اپنی انگلیاں کاٹنے کے لئے بیٹھ جاوے۔اگر کوئی کہے کہ بھائی! یہ کیا کررہا ہے؟ تو وہ کہے کہ میرے پاس بہت عمدہ مرہم ہے،اس کو لگاتے ہی فوراً خون بند ہوجاتا ہے اور زخم بالکل ٹھیک ہوجاتا ہے اس لیے انگلی کاٹ رہا ہوں؛ تو یہ بے وقوفانہ حرکت ہے۔اس کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ باوجود حفاظت کی تمام تدابیر اختیار کرنے کے جسم کا کوئی حصہ کٹ گیا؛ تب وہ مرہم استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔

بہر حال! اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ بندہ جو چاہے کرے یعنی جب تک یہ توبہ کرتا رہے گا اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس کے گناہ کو معاف کرتا رہوں گا، چاہے اس نے کیسے ہی گناہ کیوں نہ کئے ہوں۔باقی یہ ہے کہ توبہ ہوتی رہنی چاہیے۔

اگر تم لوگ گناہ نہ کروتو......

۴۲۲- وعنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْلَمْ تُذْنِبُوْا لَذَھَبَ اللّٰہُ بِکُمْ، وَجَاءَ بِقَوْمٍ یُذْنِبُوْنَ فَیَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰہَ تَعَالیٰ، فَیَغْفِرُ لَھُمْ۔

۴۲۳- وعن أبی ایوب خالد بن زید رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: لَوْلَا أَنَّکُمْ تُذْنِبُوْنَ، لَخَلَقَ اللّٰہُ خَلْقاً یُذْنِبُوْنَ، فَیَسْتَغْفِرُوْنَ، فَیَغْفِرُ لَھُمْ۔

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر تم لوگ گناہ نہ کروگے تو اللہ تعالیٰ تم کو ہٹا کر ایسی قوم کو لائے گا جو گناہ کرے گی اور اپنے گناہوں کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے گی اور استغفار کرے گی اور اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف کرے گا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

افادات:- اس حدیث کا مطلب سمجھنے میں غلط فہمی نہ ہو، دراصل اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے گناہ اور نیکی کرنے کی صلاحیت رکھی ہے، اگر اللہ کو یہ منظور ہوتا کہ اس سے گناہ ہی نہ ہو، تو گناہ کرنے کی صلاحیت رکھی ہی نہ جاتی، اور پھر تو انسان کو پیدا کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی، ایسی مخلوق فرشتوں کی شکل میں پہلے سے پیدا شدہ موجود تھی کہ جن کے اندر گناہ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ فرشتے اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا بھی چاہیں تب بھی نہیں کرسکتے، ان میں نافرمانی کا مادہ ہی نہیں ہے، اور انسان میں اللہ تعالیٰ نے دونوں چیزیں رکھی ہیں۔ اس کے بعد انسان کو حکم دیا کہ گناہ مت کرنا، اگر گناہ کروگے تو میں ناراض ہوجاؤں گا۔ تو گناہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور فقط صلاحیت ہی نہیں بلکہ گناہ کا تقاضا موجود ہے، نفس یہ کہہ

رہا ہے کہ ایسا کرو، صلاحیت اور تقاضہ دونوں باتیں ہیں اس کے باوجود انسان یہ سوچ کر کہ میرا اللہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا، اس نے مجھے منع کیا ہے کہ یہ کام مت کرنا، اب چاہے نفس تقاضہ کرتا ہے اور مجھ میں ایسا کرنے کی طاقت بھی ہے لیکن اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے گا، تو اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے کے لئے وہ انسان اپنے آپ کو اس معصیت و نافرمانی اور گناہ کے کام سے روکے، تو آپ اندازہ لگائیے کہ اللہ تعالیٰ کتنا خوش ہوں گے۔

یہ کمال نہیں

دیکھو! دو باتیں الگ الگ ہیں، ایک تو یہ کہ کسی کام کی صلاحیت ہو اور نہ کرے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ کسی کام کی صلاحیت ہی نہ ہو۔ جیسے ایک آدمی اندھا ہے، اب اگر وہ کسی نامحرم اور اجنبی عورت کی طرف نظر نہیں کرتا، سنیما نہیں دیکھتا، ٹی وی نہیں دیکھتا اور لوگوں سے کہتا ہے کہ میں نے کبھی ٹی وی نہیں دیکھا، کبھی کسی اجنبی عورت کی طرف نگاہ نہیں اُٹھائی؛ تو کیا کہیں گے کہ اللہ کے بندے! تو تو اگر چاہے تب بھی نظر نہیں اُٹھا سکتا، تیرے اندر صلاحیت ہی کہاں ہے؟ اس لیے یہ کوئی کمال کی بات نہیں۔

اور ایک آدمی بینا ہے، اس میں اجنبی عورت کو دیکھنے کی صلاحیت موجود ہے، اور طبیعت میں تقاضہ بھی موجود ہے، نفس کہہ رہا ہے اس کے باوجود وہ آدمی یہ سوچ کر نگاہ نہیں اٹھاتا کہ اللہ تعالیٰ نگاہوں کی خیانت کو جانتا ہے، وہ مجھے پوچھے گا تو میں کیا جواب دوں گا۔ تو اب اندازہ لگائیے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کتنا خوش ہوں گے۔ اور یہی تقویٰ کا نور ہے۔

تو شانِ غفاری کا ظہور کیسے ہوتا؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب اللہ کو بندے سے گناہ کروانے ہی نہیں تھے تو پھر انسان میں گناہ کی صلاحیت ہی کیوں رکھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں صلاحیت بھی

رکھی اور تقاضہ بھی رکھا اور پھر اللہ نے حکم دیا کہ مت کرو۔ اب جب نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں تقویٰ کا نور ڈالیں گے۔ اور پھر بھی اگر کسی سے گناہ ہو گیا تو اس کے لئے راستہ بند نہیں کیا، بلکہ کہا کہ دل سے معافی مانگو تو ہم خوش ہوں گے اور معاف کردیں گے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت معاف کرنے کی بھی ہے۔ اگر گناہ کرنے والے نہ ہوتے اور گناہ کر کے اللہ سے معافی نہ مانگتے تو پھر اللہ کی اس صفت اور شانِ غفاری کا ظہور کیسے ہوتا؟ اس لئے جب انسان گناہ کرے گا اور پھر توبہ واستغفار کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی ان صفات کے ظہور کا ذریعہ بنے گا۔

سالہا سال کی عبادت وہ کام نہیں کرتی......

بلکہ بعض کتابوں میں یہاں تک لکھا ہے کہ عبادت کرنے کے بعد طبیعت کے اندر جو غرور پیدا ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں کسی جرم کرنے کے بعد طبیعت میں جو انکساری پیدا ہوتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں زیادہ قابلِ قدر ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ظاہر ہے کہ غرور کی وجہ سے عبادت کا معاملہ تو ختم ہو گیا اور عبادت کا تو ستیا ناس ہی ہو گیا لیکن گناہ کرنے کے بعد جو انکساری اور ندامت پیدا ہوئی، تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سالہا سال کی عبادت وہ کام نہیں کرتی جو کام گناہ کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ندامت کر جاتی ہے اور اس کی وجہ سے اس کا کام بن جاتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

زاہد غرور داشت، سلامت نہ برد راہ رِند از راہ نیاز بدارالسلام رفت

زاہد کو تو اپنی عبادت کے اوپر غرور تھا اس لئے وہ پھنس گیا، اور گنہگار کو اپنے گناہ کے اوپر نیاز؛ تو وہ اپنی اسی ندامت سے جنت کے اندر پہنچ گیا۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ گناہ کے نتیجے میں بندہ اللہ کے سامنے معافی مانگتا ہے

اوراس طرح اللہ کی صفتِ غفاریت اور صفتِ رحمت کا ظہور ہوتا ہے، اوراس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں۔ اسی کو بتلایا گیا کہ انسان کو اسی لئے پیدا کیا گیا کہ وہ گناہ کریں گے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرے گا اوراس طرح اللہ تعالیٰ کی صفتِ مغفرت کا ظہور ہوگا۔

اس لیے اس حدیث کا مطلب سمجھنے میں کسی کو غلط فہمی نہ ہو، اس کا مطلب یہ نہیں کہ دیدہ ودانستہ کسی گناہ کا ارتکاب کیا جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں یہ مادے تو رکھے ہیں لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کا حکم یہی ہے کہ آدمی گناہوں کا ارتکاب نہ کرے، اور اگر ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں، اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

بَابُ الرَّجَآءِ

اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کا بیان

﴿ مجلس ۵ ﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۲۱ / جمادی الاخریٰ ۱۴۲۰ھ ۲ / اکتوبر ۱۹۹۹ء

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے امید رکھنے کا بیان چل رہا ہے، اسی سلسلہ میں پچھلی دو تین مجلسوں میں چند حدیثیں آئی تھی۔ آگے ایک راویت لاتے ہیں۔

کلمہ پر جنت کی خوشخبری

۴۲۴ - وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ: كُنَّا قُعُوداً مَعَ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مَعَنَا أَبُوْبَكْرٍ وَ عُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا فِيْ نَفَرٍ، فَقَامَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مِنْ بَيْنَ أَظْهُرِنَا، فَأَبْطَأَ عَلَيْنَا فَخَشِيْنَا أَنْ يُقْتَطَعَ دُوْنَنَا فَفَزِعْنَا فَكُنْتُ أَوَّلَ مَنْ فَزِعَ فَخَرَجْتُ أَبْتَغِيْ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حَتّٰى أَتَيْتُ حَائِطاً لِلأَنْصَارِ وَذَكَرَ الْحَدِيْثَ بِطُوْلِهِ إِلٰى قَوْلِهِ: فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: اِذْهَبْ فَمَنْ لَقِيْتَ وَرَآءَ هٰذَا الْحَائِطِ يَشْهَدُ أَنْ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ، مُسْتَيْقِناً بِهَا قَلْبُهُ، فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ: - حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی کچھ صحابہ کے ساتھ موجود تھے کہ اچانک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے درمیان سے اٹھے اور آبادی سے باہر تشریف لے گئے ہم یہ سمجھے کہ آپ اپنی کسی ضرورت سے تشریف لے گئے ہیں، جب سب نے تھوڑی دیر انتظار کیا لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس تشریف نہیں لائے تو سب کو فکر لاحق ہوئی کہ پتہ نہیں کیا بات ہوئی، اس لیے سب آپ کی تلاش اور جستجو میں نکلے۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں سب سے پہلے میں ہی آپ کو تلاش کرنے کے لئے نکلا۔ یہاں تک کہ ایک انصاری صحابی کے باغ کے متعلق مجھے خیال ہوا کہ آپ شاید اندر ہوں گے تو میں نے اندر جانے کا راستہ ڈھونڈا لیکن مجھے راستہ نہیں ملا، اس باغ کے پانی کے باہر نکلنے کی جو نالی تھی اس میں سے ہو کر میں اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس

باغ میں تشریف فرما ہیں، مَیں نے جا کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے درمیان سے اچانک اٹھ کر چلے آئے اور دیر ہوگئی تو سب پریشان ہو گئے، اور سب ہی آپ کی تلاش اور جستجو میں نکلے ہوئے ہیں، میں بھی اسی لئے نکلا تھا اور اس باغ میں آنے کا کوئی راستہ نہیں ملا تو مَیں پانی نکلنے کی نالی میں سے اندر گُھسا ہوں اور آپ یہاں تشریف فرما ہیں۔ جب نبی کریم ﷺ کو یہ معلوم ہوا کہ حضراتِ صحابہ پر یہ کیفیت گذری تو حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اپنے نعلین مبارک دے کر فرمایا کہ جاؤ اور جو بھی تمہیں راستہ میں ملے، جو اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور مَیں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں؛ اور اس بات پر وہ دل سے پورا یقین رکھتا ہو اس کو جنت کی خوشخبری سنا دو۔

اس روایت کی تشریح پہلے گذر چکی ہے۔

ہم آپ کو راضی کر دیں گے

۴۲۵- وعن عَبْدِ اللهِ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تلاَ قَوْلَ اللهِ فِيْ إِبْرَاهِيْمَ علیہ السلام: ﴿رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَإِنَّهُ مِنِّيْ﴾ [ابراھیم:۳۶] الآية. وقَوْلَ عِيْسَىٰ علیہ السلام: ﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ [المائدة:۱۱۸] فَرَفَعَ يَدَيْهِ وَقَالَ: أَللّٰهُمَّ أُمَّتِيْ أُمَّتِيْ. وبَكَىٰ. فَقَالَ اللهُ تَعَالىٰ: يَاجِبْرِيْلُ! اِذْهَبْ إِلىٰ مُحَمَّدٍ، وَرَبُّكَ أَعْلَمُ، فَسَلْهُ مَا يُبْكِيْهِ؟ فَأَتَاهُ جِبْرِيْلُ، فَأَخْبَرَهُ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بِمَا قَالَ. وَهُوَ أَعْلَمُ. فَقَالَ اللهُ تَعَالىٰ: يَاجِبْرِيْلُ! اِذْهَبْ إِلىٰ مُحَمَّدٍ، فَقُلْ: إِنَّا سَنُرْضِيْكَ فِيْ أُمَّتِكَ وَلاَ نَسُوْءُكَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے باری تعالیٰ کا وہ ارشاد تلاوت کیا جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے کہ اے میرے پروردگار! ان بتوں نے بہت سارے لوگوں کو گمراہ کیا (یعنی بہت سے لوگ ان بتوں

کی تاثیر کے قائل ہو کر اور یہ سمجھ کر کہ یہ بھی کچھ نفع نقصان پہنچانے کے مالک ہیں گمراہی میں مبتلا ہیں، گویا ان کی گمراہی کا ذریعہ یہ بت بنے۔ اسی کو تعبیر کیا گیا کہ ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام دعا فرما رہے ہیں کہ) اے باری تعالیٰ! پس جو میری پیروی کرے گا وہ تو مجھ سے ہے (یعنی جو میرے اوپر ایمان لائے گا اور میں تیرے جن احکام کو ان تک پہنچا رہا ہوں ان احکام پر عمل کرنے کے معاملہ میں میری پیروی کرے گا تو اس کا تعلق مجھ سے ہے) اور جو میری نافرمانی کرے گا؛ تو تو بخشنے والا اور مہربان ہے (گویا ان نافرمانوں کے متعلق بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کر رہے ہیں کہ آپ تو مغفرت کرنے والے، رحمت کرنے والے، معاف کرنے والے اور مہربانی کرنے والے ہیں، اگر آپ چاہیں تو ان کی بھی بخشش کر سکتے ہیں)

اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک دعا جو قرآنِ پاک میں ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ آیت بھی پڑھی: اے اللہ! تو اگر ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں (تو ان کا مالک ہے اور مالک کو اختیار ہوتا ہے کہ اپنی چیز میں جو چاہے کرے اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں، یا دم مارنے کی کوئی گنجائش نہیں) اور اگر تو ان کو معاف کر دے تو بے شک تو قوت والا اور حکمت والا ہے (معاف کرنے پر قدرت رکھتا ہے، اور حکمت والا بھی ہے کہ کس کو کس طرح معاف کیا جائے وہ بخوبی جانتا ہے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو اپنی امت کے نافرمانوں اور فرمانبرداروں کے سلسلہ کی دعا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا جو نافرمانوں کے سلسلہ میں ہے؛ ان دونوں دعاؤں کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلاوت فرمائی) اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے اور باری تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا کہ اے اللہ! میری امت، میری امت (اے اللہ! تو میری امت کو معاف کر دے، ان کو بخش دے۔ گویا ان دونوں جلیل القدر انبیاء نے اپنی امت کے گنہگاروں کے

لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور رحمت کی جو دعا فرمائی، اس کا تذکرہ کرنے کے بعد نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت کے واسطے دعا کر رہے ہیں: اے اللہ! تو میری امت کو معاف کردے) تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے کہا کہ اے جبرئیل! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جاؤ (ویسے تو اللہ تعالیٰ خوب جانتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا دعا کر رہے تھے اور کیوں رو رہے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس رونے پر جو انعام دینے والے ہیں اس کو ظاہر کرنے کے لیے پوچھا جا رہا ہے۔ جیسے کوئی بچہ کسی چیز کے لئے جب روتا ہے تو باپ جانتا ہے کہ وہ کیوں رو رہا ہے، پھر بھی پوچھتا ہے کہ بیٹا! کیوں روتا ہے؟ فلاں چیز چاہیے، چلو دے دی، تا کہ اس کا رونا بند ہو جائے۔ ایسے ہی یہاں اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے اس کے باوجود حضرت جبرئیل علیہ السلام کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا اور کہا کہ جا کر ان سے پوچھو کہ کون سی چیز ان کو رُلا رہی ہے؟ میرے حبیب! آپ کیوں روتے ہیں؟)

چناں چہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر حضرت جبرئیل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتلایا کہ میری امت کی معافی اور مغفرت کا سوال کرتا ہوں۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ بخوبی جانتے تھے، آپ کی اس دعا سے واقف تھے۔ پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جا کر باری تعالیٰ کو خبر دی کہ آپ کے حبیب یہ مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اے جبرئیل! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جاؤ، اور ان سے کہو کہ ہم آپ کی امت کے سلسلہ میں آپ کو راضی کر دیں گے، اور آپ کو امت کے سلسلہ میں ذرا بھی ناراض نہیں کریں گے۔

میں راضی ہونے والا نہیں......

افادات:- حضرت امام شافعیؒ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ یہ بہت زیادہ امید دلانے والی روایت ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے

ہیں کہ جب تک میری امت کا ایک آدمی بھی جہنم میں رہے گا، میں راضی ہونے والا نہیں ہوں، میں تو سب کو جہنم سے نجات دلا کر ہی راضی ہوؤں گا۔

دیکھو! حضور ﷺ کو امت کا کتنا درد ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے اپنی امت کی مغفرت کے لئے رو رو کر دعا مانگ رہے ہیں۔ اس لئے اب ہمیں بھی آپ ﷺ کا حق سمجھنا چاہیے۔ جب ہمارے لئے آپ ﷺ رو رہے ہیں تو کیا اب ہماری ذمہ داری نہیں بنتی کہ ہم نبی کریم ﷺ کی پیروی کریں اور آپ کے طریقوں کو اپنی زندگی میں اپنائیں۔ اور کوئی بھی ایسا کام نہ کریں جو نبی کریم ﷺ کو ناراض کرنے والا ہو، اور آپ ﷺ کی ناراضگی کا باعث ہو۔ روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ ہر ہفتہ قبر مبارک کے اندر حضور ﷺ کے سامنے امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں، جب کوئی امتی اچھے عمل کرتا ہے اور آپ کو بتلایا جاتا ہے کہ آپ کے امتی نے یہ اعمال کئے ہیں، تو آپ ﷺ خوش ہوتے ہیں۔ اور جب بتلایا جاتا ہے کہ برے اعمال کئے ہیں، تو اس سے آپ ﷺ کو تکلیف ہوتی ہے۔ (مسند البزار، ۱۹۲۵)

بڑی بے مروتی کی بات

اس لیے ہر امتی کے اوپر حضورِ اکرم ﷺ کا یہ حق ہے کہ جب آپ ہمارے لئے روتے ہیں اور ہماری مغفرت اور رحمت کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور میں درخواست کرتے ہیں، تو ہمیں بھی چاہیے کہ نبی کریم ﷺ کی اتباع و پیروی اور آپ کی سنتوں کو اپنی زندگی میں اپنانے کا پورا پورا اہتمام کریں۔ ہر حال میں ہماری طرف سے یہی کوشش ہو، اس کے بعد بھی خدانخواستہ نادانستہ طور پر بے خبری میں کہیں غفلت ہوگئی تو اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے، لیکن دانستہ طور پر نبی کریم ﷺ کے طریقوں کو چھوڑنا

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں اور غیروں کے طریقوں کو اختیار کرنا کتنی بڑی بے غیرتی اور بے مروتی کی بات ہوگی۔ یہ محبت کا تقاضہ نہیں ہے۔

اللہ کا اور بندوں کا کیا حق ہے؟

۴۲۶- وعن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ قَالَ: كُنْتُ ردفَ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عَلٰى حِمَارٍ، فَقَالَ يَامُعَاذُ! هَلْ تَدْرِيْ مَا حَقُّ اللهِ عَلٰى عِبَادِهٖ؟ وَمَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللهِ؟ قُلْتُ: أَللهُ وَرَسُوْلُهٗ أَعْلَمُ. قَالَ: فَإِنَّ حَقَّ اللهِ عَلَى الْعِبَادِ أَنْ يَعْبُدُوْهُ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئاً وحَقَّ الْعِبَادِ عَلَى اللهِ أَنْ لَا يُعَذِّبَ مَنْ لَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئاً. فَقُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللهِ. أَفَلَا أُبَشِّرُ النَّاسَ؟ قَالَ: لَا تُبَشِّرْهُمْ فَيَتَّكِلُوْا۔ (متفق عليه)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک گدھے پر سوار ہو کر تشریف لے جا رہے تھے، اور میں اسی گدھے پر آپ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے معاذ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس کے بندوں پر کیا حق ہے؟ اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں (آپ ہی بتلایئے) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا بندوں کے اوپر یہ حق ہے کہ بندے اللہ ہی کی عبادت کریں اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور بندوں کا حق اللہ تعالیٰ پر یہ ہے کہ وہ اس آدمی کو عذاب نہ دے جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا میں اور لوگوں کو اس بات کی بشارت نہ سنادوں؟ (یہ تو بہت آسان چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنا بڑا وعدہ ہے۔ اس لئے یہ چیز لوگوں کے لئے بڑی خوشخبری اور مسرت افزا ہے۔ تو میں لوگوں کو اس چیز کی اطلاع کردوں؛ تاکہ یہ سن کر سب ہی خوش ہو جائیں؟)

توحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: ابھی نہ بتانا، ورنہ لوگ بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔

افادات:- ایک بات یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کے اوپر کوئی چیز واجب نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ اس کا وعدہ فرمالیا ہے، اس لئے گویا اللہ تعالیٰ یہ چیز اپنے بندوں کو ضرور عطا فرمائیں گے، اسی معنیٰ کو حدیثِ پاک میں یوں تعبیر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے اوپر بندوں کا حق یہ ہے کہ اس آدمی کو عذاب نہیں دے گا جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔

اور میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جنت کے اندر بڑے بڑے درجات ہیں جو آدمی کو مختلف اعمال پر دیئے جائیں گے۔ اگر بشارت سنادی جائے تو انسان کا مزاج ہے کہ صرف اس چیز کو لے کر اس بات پر کفایت کر لے گا کہ اتنی چیز جہنم سے حفاظت کے لیے کافی ہے۔ اس لئے مصلحت کا تقاضہ یہ تھا کہ اس وقت لوگوں کو اس بات کی اطلاع نہ دی جائے۔ اور جیسا کہ پہلے بھی میں بتلا چکا ہوں کہ مختلف طبیعتیں اور مختلف مزاج ہوتے ہیں ایک ہی بات پر ہر ایک کا تأثر الگ الگ ہوتا ہے، ایک ہی بات دو آدمیوں کو کہی جاتی ہے لیکن ایک آدمی کچھ اور اثر لیتا ہے، اور دوسرا آدمی دوسرا اثر لیتا ہے۔ اور یہ بھی سوال نہیں ہوسکتا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیوں بتلایا؟ اس لئے کہ ان کے متعلق یہ اندیشہ نہیں تھا۔ ہمارے جیسے سست و کاہل اور کم عملوں کے متعلق ہوسکتا ہے کہ اس بات کو سننے کے بعد اطمینان کی سانس لے کر بیٹھ جاتے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ’’ان کو عمل کرنے دو، جنت کے اندر بڑے درجات ہیں‘‘۔

وہ ثابت قدم رہیں گے

۴۲۷- وعن البرآء بن عازب رضی اللہ عنہ عن النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: اَلْمُسْلِمُ إِذَا سُئِلَ

فِي الْقَبْرِ يَشْهَدُ أَنْ لَاإِلٰهَ إِلَّا اللهَ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللهِ، فَذَالِكَ قَوْلُهُ تَعَالىٰ: يُثَبِّتُ اللهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ. (ابراھیم:۲۷)

ترجمہ:- حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کو جب قبر کے اندر سوال کیا جائے گا (کہ تمہارا رب کون ہے؟ تمہارا دین کیا ہے؟ اور اس شخصیت یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق کیا کہتے ہو؟) اس وقت وہ گواہی دے گا اور کلمہ پڑھے گا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ (گویا مومن قبر میں جواب دے گا) اور قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا یہی مطلب ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو دنیا اور آخرت میں جمائے گا، مضبوط وثابت قدم رکھے گا۔

افادات: جو لوگ دنیا کی زندگی میں کلمہ کے اوپر جمے رہے، اور ان کا عقیدہ پختگی کے ساتھ رہا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور اپنے اسی عقیدہ کے مطابق زندگی گذاری کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا، اسی کی عبادت کرتے رہے۔ اور جس کا یہ عقیدہ رہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور انہی تعلیمات کو اپنی زندگی کی اندر مشعلِ راہ بنایا اور انہی کے مطابق زندگی گذاری، تو جیسے زندگی میں اس پر جما رہا، قبر میں اللہ تعالیٰ اس کی مدد کریں گے۔ ایمان والوں کے لئے یہ چیز بڑی امید کی ہے۔ جو لوگ دنیا میں ایمان کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور قبر کی ہولناکیوں سے ڈرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی مدد ان کے شاملِ حال رہے گی۔ یہ بڑے اطمینان وتسکین کی چیز ہے۔

نیکیوں کا بدلہ دنیا اور آخرت میں

۴۲۸۔ وعن أنس رضی اللہ عنہ عن رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: إِنَّ الْكَافِرَ إِذَا عَمِلَ حَسَنَةً أُطْعِمَ بِهَا طُعْمَةً مِنَ الدُّنْيَا۔ أَمَّا الْمُؤْمِنُ فَإِنَّ اللهَ تَعَالىٰ يَدَّخِرُ لَهُ حَسَنَاتِهِ فِي الْآخِرَةِ

وَيُعْقِبُهُ رِزْقاً فِي الدُّنْيَا عَلٰى طَاعَتِهِ.

وفِي رِوَايَةٍ: إِنَّ اللهَ لَا يَظْلِمُ مُؤْمِنًا حَسَنَةً يُعْطِي بِهَا فِي الدُّنْيَا وَيَجْزِي بِهَا فِي الْآخِرَةِ وَأَمَّا الْكَافِرُ فَيُطْعَمُ بِحَسَنَاتِ مَا عَمِلَ لِلّٰهِ تَعَالٰى فِي الدُّنْيَا حَتّٰى إِذَا أُفْضِيَ إِلَى الْآخِرَةِ لَمْ يَكُنْ لَهُ حَسَنَةٌ يُجْزٰى بِهَا. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دنیا کے اندر جب کوئی کافر کوئی نیکی کا کام کرتا ہے، اس کو اس کی نیکی کا بدلہ دیا جاتا ہے۔ رہا مومن؛ تو اللہ تعالیٰ اس کی نیکیوں کو آخرت کے لئے محفوظ رکھتے ہیں، اور دنیا میں بھی اس کی طاعت ونیکی پر کچھ دیتے ہیں لیکن بڑا بدلہ آخرت کے اندر عطا فرمائیں گے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ذرا بھی کمی نہیں کرتے، مومن کی نیکی کا بدلہ دنیا میں بھی دیا جاتا ہے اور اس کا پورا بدلہ آخرت کے اندر ملے گا۔ اور رہا کافر تو اس کی نیکیوں کا بدلہ دنیا میں ہی دیدیا جاتا ہے، یہاں تک کہ جب آخرت کے اندر جاتا ہے تو اس کی کوئی نیکی باقی نہیں رہتی۔

نظام خداوندی

افادات:- اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ ایک نظام ہے کہ کافر کی عبادت کا تو اسلام نہ ہونے کی وجہ سے سوال ہی نہیں ہوتا، اگر وہ کوئی نیکی کا کام کرتا بھی ہے تو ایمان نہ ہونے کی وجہ سے وہ کام قابلِ قبول نہیں ہوتے، اس لئے کہ عبادت کے لئے نیت شرط ہے۔ کوئی غیر مسلم نماز پڑھے تو وہ نماز نہیں کہلائے گی۔ روزہ رکھے تو وہ روزہ نہیں کہلائے گا۔ لیکن دوسرے نیکی کے کام جو لوگوں کو فائدہ پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں، جیسے کسی کو کھانا کھلا دیا، کسی کو کپڑا پہنا دیا، کسی کی مدد کردی، کسی پریشان حال کی پریشانی دور کی؛ تو یہ سب کام مسلمان کرے تب بھی نیکی اور کافر کرے تب بھی نیکی ہیں، اس میں نیت کا سوال نہیں آتا۔ تو نیکی کا ایسا کوئی بھی کام جب کافر دنیا کے اندر کرتا ہے تو نبی

کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ دنیا ہی میں عطا فرما دیتے ہیں، گویا اس کی نیکی کا معاوضہ باقی نہیں رکھا جاتا، دنیا ہی میں سب دید یا جاتا ہے۔ اور ایمان والوں کی جتنی بھی نیکیاں ہیں ان کو اس کا بدلہ دنیا میں نہیں دیا جاتا، دنیا میں ایسی کوئی چیز ہے ہی نہیں جو ان کی نیکیوں کا پورا پورا بدلہ بن سکے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایمان کے نتیجہ میں کی گئی نیکیوں کے بدلہ کو آخرت کے اندر رکھا ہے۔ البتہ دنیا میں بھی تھوڑا بہت اس کو اس کی ان نیکیوں کا بدلہ دیا جاتا ہے، لیکن حقیقی بدلہ تو آخرت ہی میں دیا جائے گا۔

اسی لئے دوسری روایتوں میں اس بات کی صراحت ہے کہ عام طور پر اللہ تعالیٰ دنیا کے اندر مؤمن کو اس کے گناہوں کی سزا مختلف شکلوں میں دے کر اس کی برائیوں کو ختم کر دیتے ہیں اور اس گناہ سے پاک صاف کر دیتے ہیں (شعب الایمان، ۹۸۱۹) جیسے بیماریوں کی شکل میں، مصیبت کی شکل میں، روزی کی تنگی کی شکل میں، اور لوگوں کی ایذا رسانی کی شکل میں، یہاں تک کہ بہت سے ایمان والے وہ ہوتے ہیں کہ ان کی کوئی برائی باقی ہی نہیں رہتی جس کا بدلہ نہ لیا گیا ہو، اور جس کی سزا اس کو نہ دیدی ہو، اور آخرت کے اندر اس کی نیکیوں کی وجہ سے اس کو جنت میں بھیجا جائے گا۔ اور کافر کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس لئے حضرات صحابہ کرامؓ کا مزاج اور طبیعت یہ تھی کہ جب دنیا کی کوئی دولت یا اور کوئی نعمت ان کے پاس آتی تھی تو وہ ڈر جاتے تھے کہ یہ چیز کہیں ہماری نیکیوں کا بدلہ تو نہیں۔

نعمتیں ملنے پر صحابہ کرامؓ کی سوچ

حضرت خباب بن اَرت رضی اللہ عنہ کی روایت بخاری شریف کے اندر ہے (بخاری شریف ۷۰۴۷) وہ بیمار تھے جب لوگ ان کی خبر پرسی کے لئے گئے تو وہ فرمانے لگے کہ ہم لوگ اللہ کے نبی پر ایمان لائے اور ایمان کے راستہ میں ہم نے مشقتیں اور تکلیفیں

اُٹھائیں اور ہم میں سے بہت سے وہ ہیں جنہوں نے اپنی ان تکلیفوں کا ذرہ برابر بھی بدلہ دنیا میں نہیں پایا بلکہ ان کی ساری نیکیاں آخرت کے لئے جمع ہیں، انہیں میں سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت مصعب بن عمیر وغیرہ ہیں۔ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے تو ان کو کفن پہنانے کے لئے صرف ایک ہی چادر تھی اور اس وقت ان کا حال بھی یہ تھا اگر ان کے چہرہ اور سر کو ڈھانپا جاتا تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں ڈھانپے جاتے تو سر کھل جاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سر اور چہرہ کو ڈھانپ دو اور پاؤں کے اوپر گھاس ڈال دو وہ حضرات تو دنیا سے اسی طرح چلے گئے اور ہم اپنے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں پا رہے ہیں۔ مال کے آنے پر وہ لوگ ڈرتے تھے۔

قابلِ اصلاح تعبیر

آج کے زمانہ میں ہم یوں سمجھتے ہیں کہ جتنا زیادہ مال و دولت آئے وہی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اور اس کے نہ ملنے پر ہم بہت زیادہ ناراض ہوجاتے ہیں، اور ملنے پر یوں سمجھتے ہیں کہ اب اللہ تعالیٰ کی عنایت ہورہی ہے۔ بعض لوگ تو اس کو یوں تعبیر کیا کرتے ہیں کہ اب اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیکھا، گویا اب تک تو دیکھا نہیں تھا۔ جب تک دو پیسے نہیں ملے، وہاں تک اللہ تعالیٰ نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ عجیب تعبیر ہے۔ جب کوئی ایسا بولتا ہے تو میرے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے کہ بولنے والا کچھ خیال کیوں نہیں کرتا۔

اللہ کے مقبول بندوں کا حال

کسی جگہ ایک بزرگ رہتے تھے، ایک مرتبہ بارش آئی تو وہ کہنے لگے کہ کیا ہی موقع سے بارش آئی ہے۔ اللہ والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً تنبیہ ہوتی ہے۔ غیب سے آواز آئی کہ کیا ہم کبھی بے موقع بھی برساتے ہیں؟ یہ اللہ کے مقبول بندوں کا حال ہوتا

ہے، اور ہم تو معلوم نہیں ایسی کیا کیا بکواس کر جاتے ہیں جس پر ہمیں تردّد بھی نہیں ہوتا۔

وجود ہی گناہ

بعض مرتبہ لوگ بولتے ہیں کہ میں نے ایسا کون سا گناہ کیا کہ یہ مصیبت آئی، بعض اللہ والے فرماتے ہیں: ’’وُجُوْدُكَ ذَنْبٌ لَا يُقَاسُ بِهٖ ذَنْبٌ‘‘ تمہارا وجود ہی گناہ ہے، کسی دوسرے گناہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لئے حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارا کوئی لمحہ غفلت سے خالی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ جو نعمتیں ہمیں مل رہی ہیں وہ ساری بلا استحقاق مل رہی ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کو سامنے رکھتے ہوئے زبان سے ایسا جملہ نکالنے سے ڈرنے اور بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، اس لئے ہم پر تو اللہ تعالیٰ کا کرم ہی کرم ہے، جتنی نعمتیں ہمیں دے رکھی ہیں، وہ اس کا احسان ہے، ہم اس کے احسان اور اس کی ان نعمتوں کا بدلہ کہاں ادا کر سکتے ہیں، جب اس کا حق ہی ادا نہیں کر سکتے تو پھر آگے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔

پانچ نمازوں کی مثال

۴۲۹۔ وعن جابر رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مَثَلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ كَمَثَلِ نَهْرٍ جَارٍ غَمْرٍ عَلٰى بَابِ أَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ مِنْهُ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسَ مَرَّاتٍ. (الغمر) الكَثِيْرُ۔

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پانچ نمازوں کی مثال ایسی ہے جیسے تم میں سے کسی کے دروازہ پر بہت زیادہ پانی والی نہر بہہ رہی ہو اور وہ ہر دن اس میں پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو۔

افادات:- جو آدمی پانچ وقتہ نمازوں کا اہتمام کرتا ہے اس کے لئے اس

حدیث میں بڑی امید ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے مکان کے سامنے نہر ہو اور وہ بھی زیادہ پانی والی ہو جس کا پانی صاف شفاف ہو، اور وہ اس میں پانچ وقت نہائے تو کیا اس کے بدن پر میل کچیل رہے گا؟ نہیں رہے گا۔ اسی طریقہ سے جو آدمی پانچ وقت کی نماز ادا کرتا ہے وہ ان نمازوں کے ذریعہ سے گناہوں سے ایسا ہی پاک صاف ہو جاتا ہے جیسا کہ نہر میں پانچ وقت نہانے والا جسمانی میل کچیل سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔ اس حدیث میں بہت بڑی امید ہے۔

حضرت شیخ کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد

اگرچہ علماء نے یہ لکھا ہے اور آگے علامہ نوویؒ بھی فرماتے ہیں کہ یہاں جن گناہوں کا تذکرہ ہے کہ نمازوں سے معاف ہو جاتے ہیں وہ سب صغیرہ گناہ ہیں۔ اور کبیرہ گناہ تو جب تک آدمی توبہ نہ کرے وہاں تک معاف نہیں ہوتے۔ اور اس سلسلہ میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فضائلِ نماز میں اپنے والدِ محترم مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کے حوالہ سے جو بات ذکر فرمائی ہے اس کو میں پہلے بھی کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں۔ قرآن وحدیث کی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو گناہ عبادتوں اور دوسری نیکیوں کی وجہ سے معاف ہوتے ہیں؛ وہ صغیرہ گناہ ہیں، کبیرہ گناہ نہیں۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مسلمان کے اعمال نامہ میں کبیرہ گناہ تو ہوتا ہی نہیں ہے، ہاں کبھی اس سے نادانستہ طور پر صغیرہ گناہ ہو جاتا ہے، تو وہ ان عبادتوں کی وجہ سے معاف ہو جاتا ہے۔ اور اگر کبھی کبیرہ گناہ ہو گیا تو جب تک وہ توبہ کر کے اللہ تعالیٰ سے معاف نہ کروا لے وہاں تک اس کو چین وسکون نہیں ہوتا۔ جیسے اگر کسی کو کسی کے ساتھ محبت ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی کوئی

بڑی نافرمانی تو وہ کرتا ہی نہیں۔ ہاں! بے خبری میں کوئی چھوٹی موٹی غلطی اس سے ہو جاتی ہے تو وہ اس کی خدمت کے صلہ میں معاف کردی جاتی ہے۔

جنازہ میں چالیس مؤمنوں کی شرکت کی فضیلت

۴۳۰۔وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قَالَ:سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَقُوْلُ:مَا مِنْ رَجُلٍ مُسْلِمٍ يَمُوْتُ، فَيَقُوْمُ عَلىٰ جَنَازَتِهِ أَرْبَعُوْنَ رَجُلاً لاَيُشْرِكُوْنَ بِاللهِ شَيْئاً إِلاَّ شَفَّعَهُمُ اللهُ فِيْهِ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوفرماتے ہوئے سنا کہ جو مسلمان انتقال کر جاتا ہے اور اس کے جنازہ کے اوپر ایسے چالیس آدمی نماز پڑھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرتے ہیں (یعنی مؤمن) تو اللہ تعالیٰ ان کی سفارش کو اس مرنے والے کے حق میں قبول کر لیتے ہیں۔

افادات:-اس لئے کہ جنازہ کی نماز جو پڑھی جاتی ہے وہ درحقیقت نماز پڑھنے والے مرنے والے کے لئے دعاءِ مغفرت کرتے ہیں۔اور دعاء کے آداب میں سے یہ ہے کہ اس میں پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف کرو، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجو، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجنا آدمی کی اس دعاء کو قبولیت کے قریب کر دیتا ہے اور جنازہ کی نماز میں پہلی تکبیر کے بعد ثناء پڑھی جاتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی تعریف ہوئی۔ دوسری تکبیر کے بعد درود پڑھا جاتا ہے۔اور تیسری تکبیر کے بعد دعاء مغفرت پڑھی جاتی ہے:
"أَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِيْرِنَا وَ كَبِيْرِنَا وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا"
جس میں آدمی یہ مانگتا ہے کہ اے اللہ! جو ہمارے زندے ہیں ان کی بھی مغفرت فرما، اور جو مر چکے ہیں ان کی بھی مغفرت فرما، اور جو موجود ہیں اور جو موجود نہیں ہیں ان کی بھی

مغفرت فرما چھوٹوں اور بڑوں کی بھی مغفرت فرما، مردوں اور عورتوں کی بھی مغفرت فرما گویا جو لوگ نمازِ جنازہ پڑھ رہے ہیں وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور سفارش اور درخواست کرتے ہیں کہ اے اللہ! اسے معاف کر دے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس مسلمان کا انتقال ہو جاتا ہے اور چالیس مسلمان اس کی جنازہ کی نماز پڑھتے ہیں گویا چالیس مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے دربار میں اس مردے کے لئے سفارش کی کہ اے اللہ! اس کو معاف کر دے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان چالیس مسلمانوں کی سفارش کو اللہ تعالیٰ قبول کر لیتے ہیں۔ جب چالیس مسلمان اللہ کی بارگاہ میں یوں کہہ رہے ہیں کہ باری تعالیٰ! اس کو معاف کر دیجئے تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جاؤ! میں نے اس کو معاف کر دیا۔

یہ بھی بہت بڑی امید دلانے والی روایت ہے کہ جس کے جنازہ میں چالیس یا اس سے زیادہ مسلمان شریک ہوتے ہیں تو اس کی مغفرت کی امید بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے علامہ نوویؒ نے اس روایت کو اس باب میں نقل کیا ہے۔ ان ساری روایتوں میں یہی مضمون مشترک ہے کہ ان کے پڑھنے سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات سے بڑی امیدیں وابستہ ہو جاتی ہیں، اس لئے ان تمام روایتوں کو اس باب میں نقل کر رہے ہیں۔

جنت میں امتِ محمدیہ کا حصہ

۴۳۱ - وعن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قَالَ: كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فِيْ قُبَّةٍ نَحْوًا مِنْ أَرْبَعِيْنَ . فَقَالَ: أَتَرْضَوْنَ أَنْ تَكُوْنُوْا رُبُعَ أَهْلِ الْجَنَّةِ؟ قُلْنَا: نَعَمْ . قَالَ: أَتَرْضَوْنَ أَنْ تَكُوْنُوْا ثُلُثَ أَهْلِ الْجَنَّةِ؟ قُلْنَا: نَعَمْ. قَالَ: وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، إِنِّيْ لَأَرْجُوْا أَنْ تَكُوْنُوْا نِصْفَ أَهْلِ الْجَنَّةِ. وَذَالِكَ أَنَّ الْجَنَّةَ لَا يَدْخُلُهَا إِلَّا نَفْسٌ مُسْلِمَةٌ، وَمَا أَنْتُمْ فِيْ أَهْلِ الشِّرْكِ إِلَّا كَالشَّعَرَةِ الْبَيْضَاءِ فِيْ جِلْدِ الثَّوْرِ الْأَسْوَدِ،

أَوْ كَالشَّعَرَةِ السَّوْدَآءِ فِيْ جِلْدِ الثَّوْرِ الأَحْمَرِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم چالیس کے قریب صحابہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کیا تم اس بات پر خوش اور راضی ہو کہ جنتیوں میں چوتھائی حصہ تمہارا (یعنی امتِ محمدیہ کا) ہو؟ (جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے وہاں سے لے کر قیامت تک جتنے لوگ آئیں گے، ان میں سے جنت میں جتنے جائیں گے، ان جنت میں جانے والوں میں چوتھائی حصہ تمہارا ہو، کیا تم اس پر خوش ہو؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں) ہم نے جواب میں عرض کیا: جی ہاں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اس بات پر راضی ہو کہ جتنے لوگ جنت میں جائیں گے ان میں سے ایک تہائی تمہارا (یعنی امتِ محمدیہ کا) ہو؟ ہم نے عرض کیا: جی ہاں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید رکھتا ہوں کہ تم لوگ جنتیوں میں آدھے ہو گے، اور یہ اس لیے کہ جنت میں امتِ مسلمہ ہی داخل ہوگی۔ اور تم لوگ شرک والوں کے اندر ایسے ہی ہو جیسے سیاہ بیل کے جسم پر سفید بال ہوتا ہے، یا سفید بیل کے جسم پر سیاہ بال ہوتا ہے۔

افادات:- یعنی جتنے لوگ جنت میں جائیں گے ان میں آدھی تعداد تو امتِ محمدیہ کی ہوگی اور باقی امتیں جو حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک گذری ہیں، وہ تمام مل کر آدھی تعداد ہوگی۔

ایک اور روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو ثلث فرمایا ہے۔ جن لوگوں کا جنت میں جانا طے ہے ان کی ۱۲۰ر صفیں ہوں گی، اس میں ۸۰ر صفیں امتِ محمدیہ کی اور چالیس صفیں باقی امتوں کی ہوں گی۔ (مسند احمد، ۴۳۲۸) دیکھو! جنت میں جانے والوں میں امتِ محمدیہ کا کتنا بڑا حصہ آیا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جنت کے اندر اہلِ ایمان ہی جائیں گے،

کافر تو جانے والے نہیں، تو جتنے اہلِ ایمان حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک ہوں گے، ان میں دو تہائی تعداد امتِ محمدیہ کی ہوگی، اور ایک تہائی باقی امتوں کی ہوگی۔

کالے بالوں میں ایک سفید بال

اب کسی کو خیال آسکتا ہے کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ دنیا کی اتنی بڑی آبادی میں ایک بڑی تعداد تو غیروں کی ہے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ شرک والوں کے اندر ایسے ہی ہو جیسے سیاہ بیل کے جسم پر سفید بال ہوتا ہے۔ یا سفید بیل کے جسم پر سیاہ بال ہوتا ہے۔ جسم کے تمام سفید بالوں کے مقابلہ میں کالے بال کی کیا اہمیت وحیثیت ہے؟ یا تمام کالے بالوں میں ایک سفید بال کی کیا حیثیت ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ دنیا کے اندر جو مشرک اور غیر مسلم ہیں ان کے مقابلہ میں تعداد کے اعتبار سے ایمان والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ بلکہ یاجوج ماجوج کو ملایا جائے تو جیسا کہ ایک روایت میں آتا ہے: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ حضرت آدم کو خطاب کریں گے: اے آدم! تو حضرت آدم علیہ السلام حاضر ہو کر عرض کریں گے کہ باری تعالیٰ! حاضر ہوں۔ تو کہا جائے گا کہ ان میں سے جن کو جہنم بھیجنا ہے ان کو الگ کرو۔ وہ کہیں گے کہ کتنے؟ کہا جائے گا کہ ہزار میں نوسو ننانوے۔ حضراتِ صحابہ کرامؓ نے جب یہ راویت سنی تو وہ سب ڈر گئے اور سب کے چہرے خوف سے پیلے پڑ گئے کہ ایک ہزار میں نوسو ننانوے تو جہنم میں جائیں گے اور صرف ایک جنت میں جائے گا، اب پتہ نہیں کہ ان ہزار میں سے ایک قسمت والا کون ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب صحابہ کا یہ حال دیکھا تو پھر فرمایا کہ کیا تم اس بات پر خوش ہو کہ جنت میں جانے والوں میں چوتھائی تعداد تمہاری ہو؟ پھر فرمایا کہ تہائی تعداد تمہاری ہو؟ پھر فرمایا کہ آدھی تعداد تمہاری ہو؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ گھبرانے کی ضرورت

نہیں ہے، یہ ایک ہزار میں سے نوسوننانوے والی گنتی ان کافروں کے ذریعہ سے پوری کی جائے گی، اور ایمان والوں کی تعداد کافروں کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے سفید بیل کے جسم میں ایک کالا بال ہو۔

جہنم میں مؤمن کا فدیہ

۴۳۲ - وعن أبي موسیٰ الأشعری رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ دَفَعَ اللّٰهُ إِلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ يَهُوْدِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا، فَيَقُوْلُ هٰذَا فِكَاكُكَ مِنَ النَّارِ۔

وفِيْ روايةٍ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: يَجِيْءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ نَاسٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ بِذُنُوْبٍ أَمْثَالَ الْجِبَالِ يَغْفِرُهَا اللّٰهُ لَهُمْ۔ (رواہ مسلم)

وقوله: (دَفَعَ إِلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ يَهُوْدِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا فَيَقُوْلُ: هٰذَا فِكَاكُكَ مِنَ النَّارِ) مَعْنَاهُ مَا جَاءَ فِيْ حَدِيْثِ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ (لِكُلِّ أَحَدٍ مَنْزِلٌ فِي الْجَنَّةِ، وَمَنْزِلٌ فِي النَّارِ. فَالْمُؤْمِنُ إِذَا دَخَلَ الْجَنَّةَ خَلَفَهُ الْكَافِرُ فِي النَّارِ، لِأَنَّهُ مُسْتَحِقٌّ لِذٰلِكَ بِكُفْرِهِ) ومَعْنٰى (فِكَاكُكَ) أَنَّكَ كُنْتَ مُعَرَّضًا لِدُخُوْلِ النَّارِ، وَهٰذَا فِكَاكُكَ، لِأَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدَّرَ لَنَا عَدَدًا يَمْلَؤُهَا، فَإِذَا دَخَلَهَا الْكُفَّارُ بِذُنُوْبِهِمْ وَ كُفْرِهِمْ، صَارُوْا فِيْ مَعْنَى الْفِكَاكِ لِلْمُسْلِمِيْنَ. وَاللّٰهُ أَعْلَمُ.

ترجمہ:- حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ایک یہودی یا ایک نصرانی دے کر یوں فرمائیں گے کہ جہنم میں یہ تیرا فدیہ ہے (یعنی تیری جگہ پر جہنم کے اندر یہ جائے گا) ایک اور روایت میں ہے کہ قیامت کے روز بعض مسلمان پہاڑوں کے برابر گناہ لے کر آئیں گے تب بھی باری تعالیٰ ایمان کی وجہ سے معاف کردیں گے۔

افادات:- اس کو آپ اس طرح سمجھئے کہ آسمان سے بجلی گری اور کسی ایک کو ختم کر دیا تو سب لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم سب کی طرف سے کفارہ ہو گیا، ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میرا بدلہ ہو گیا، چونکہ اس کو کسی ایک کو تو شکار کرنا ہی تھا، یہ ایک اس کا شکار بن گیا، اور باقی سب بچ گئے، تو اس کو ان الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یا جیسے فیکٹری والوں کا جائزہ لینے اور سروے کرنے کے لیے انکم ٹیکس والے نکلے، اور سورت کی تین سو فیکٹریوں میں سے دس پر چھاپہ مار کر ان کے خلاف چالان کر دیا تو دوسری تمام فیکٹری والے اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چلو یہ دس ہماری طرف سے کفارہ بن گئے۔ ان انکم ٹیکس والوں کو تو دس کو ہی پکڑنا تھا اور وہ دس انہوں نے پکڑ لئے۔ تو یہ ایک طرح کی تعبیر ہے۔

میں یہ مثال اس لئے دے رہا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہنم کے لیے ایک تعداد مقرر کی ہے کہ اتنے آدمیوں کو جہنم میں بھیجنا ہے، اب جہنم کی یہ تعداد ان یہود و نصاریٰ سے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کے بعد بھی اسی مذہب پر قائم رہے، اور غیر مسلموں سے پوری کی جائے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کے بعد کسی یہودی کی یہودیت اور نصرانی کی نصرانیت قابلِ قبول نہیں ہے جب تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان نہ لے آئے۔ ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت سے پہلے جو یہود و نصاریٰ صحیح طریقہ پر تھے؛ وہ نجات پائیں گے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم کے لیے ایک تعداد مقرر کی ہے، وہ تعداد تو جہنم میں بھیجنی ہی ہے اور وہ ان یہود و نصاریٰ سے پوری کی جائے گی تو اب اہلِ ایمان کو اطمینان ہو گیا کہ جہنم کے اندر ہماری طرف سے کفارہ ہو جائے گا۔ اسی کو ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا: "هٰذَا فِكَاكُكَ مِنَ النَّارِ" جہنم کے اندر تمہاری طرف سے یہ بدلہ اور فدیہ و کفارہ ہو گیا۔

ہر ایک کے لیے دو دو جگہیں

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تشریح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی انسان پیدا کئے ہیں ہر ایک کے لئے جنت میں ایک مقام ہے، اور جہنم میں ایک مقام ہے۔ گویا ہر ایک کے لیے دو دو جگہیں مقرر کی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کو یہ بھی معلوم ہے کہ کون جنت والے عمل کر کے جنت میں جائے گا، اور کون جہنم والے عمل کر کے جہنم میں جائے گا، لیکن اس کے باوجود قدرت کا ایک نظام اور قانون ہے، اسی کے تحت ہر ایک کے لئے ایک ٹھکانہ جنت میں اور ایک ٹھکانہ جہنم میں طے ہے۔ اب جو ایمان لائیں گے اور نیک اعمال کریں گے وہ نجات پا کر جنت میں جائیں گے۔ اور جو ایمان سے محروم رہیں گے وہ جہنم میں جائیں گے۔ اب جو جنت میں گئے ان کے لئے جہنم میں جو ٹھکانہ مقرر تھا وہ خالی رہے گا۔ اور جو جہنم میں گئے ان کے لیے جنت میں جو ٹھکانہ طے کیا گیا تھا وہ خالی رہے گا۔ تو اب یہ ہوگا کہ جو جنت میں گئے ان کو اپنا مقام جو ان کے لئے جنت میں طے تھا وہ تو ملا ہی، لیکن جو جہنم میں گئے ان کے جنت میں جو فلیٹ خالی رہ گئے تھے وہ اِن کے درمیان تقسیم کر دیئے جائیں گے اور اُدھر جو جہنم میں گئے، ان کو ان کا مقام تو ملا، اور جنت والوں کے حصہ کی جو کوٹھریاں جہنم میں خالی رہ گئیں، وہ اِن جہنمیوں میں تقسیم کی جائیں گی۔ اسی کو قرآنِ کریم میں "تَغَابُن" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ "تَغَابُن" کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ جنت کا سودا اور معاملہ جہنمیوں کے ساتھ ہوا، اور وہ سودا ایسا ہوا جس میں جنت والے نفع میں رہے اور جہنم والے گھاٹے میں رہے۔ جہنم والوں کو جنت والوں کے حصہ کے جو درکات تھے وہ ملے۔ اور جنت والوں کو جہنم والوں کے جو درجات تھے وہ ملے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ جنت والوں کے درجات بلند فرمائیں گے۔

درجات اور درکات

جنت کے اندر جو مقامات ہوتے ہیں ان کو ’’درجات‘‘ کہا جاتا ہے۔ اور جہنم میں جو مقامات ہوتے ہیں ان کو ’’درکات‘‘ کہا جاتا ہے۔ تو جنتیوں کے حصہ کے درکات یعنی کال کوٹھریاں؛ جہنمیوں کو دیدی جائیں گی اور جہنم والوں کے جو درجات جنت میں ہیں وہ جنتیوں کو دے دیئے جائیں گے۔ یعنی ان کے نام کے جو فلیٹ تھے وہ ان کو دیے جائیں گے، تو جہنم والوں کے حق میں یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہوا۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ اسی کو حضور ﷺ نے یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مؤمن کو یوں کہے گا کہ یہ تمہارا بدلہ ہے یعنی تمہیں اس جگہ پر جانا تھا، لیکن اس کال کوٹھری میں اس کو فٹ کر دیا جائے گا، اسی کو ’’فِكَاكُ‘‘ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بات سمجھ میں آ گئی؟ اس روایت میں بھی اہلِ ایمان کے واسطے بڑی امید کی چیز ہے، اس لئے اس روایت کو یہاں بیان کیا ہے۔

بَابُ الرَّجَآءِ

اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کا بیان

﴿مجلس ۶﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۲۸؍جمادی الاخریٰ ۱۴۲۰ھ ۹؍اکتوبر ۱۹۹۹ء

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے اُمید رکھنی چاہیے، اس عنوان پر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ روایتیں پیش کی ہیں جو پچھلی پانچ مجلسوں سے چل رہی ہیں، اس سلسلہ کی روایتیں آج بھی پیش کی جارہی ہیں۔

جا! آج بھی تجھے معاف کردیا

۴۳۳ - وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَقُوْلُ: يُدْنَى الْمُؤْمِنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ رَبِّهِ حَتّٰى يَضَعَ كَنَفَهُ عَلَيْهِ، فَيُقَرِّرُهُ بِذُنُوْبِهِ، فَيَقُوْلُ: أَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا؟ أَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا؟ فَيَقُوْلُ: رَبِّ أَعْرِفُ. قَالَ: فَإِنِّي قَدْ سَتَرْتُهَا عَلَيْكَ فِي الدُّنْيَا، وَأَنَا أَغْفِرُهَا لَكَ الْيَوْمَ، فَيُعْطٰى صَحِيْفَةَ حَسَنَاتِهِ.

(كَنَفَهُ): سَتْرُهُ وَرَحْمَتُهُ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے روز بندے کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ اتنا قریب کیا جائے گا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت کی چادر اس پر ڈالیں گے (یعنی اس کے اوپر پردہ ڈالیں گے تاکہ دوسرے لوگ دیکھ نہ سکیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ کیا معاملہ کررہے ہیں۔) پھر اللہ تعالیٰ اس بندے سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائیں گے، جیسے باری تعالیٰ اس سے پوچھیں گے تو فلاں گناہ جانتا ہے؟ تجھے یاد ہے تو نے فلاں روز فلاں جگہ پر یہ گناہ کیا تھا؟ (اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوسرے گناہ بھی اس کو یاد دلائے جائیں گے وہ جواب میں انکار تو نہیں کرسکے گا اس لئے) وہ عرض کرے گا کہ اے باری تعالیٰ! مجھے معلوم ہے۔ (گویا وہ اقرار و تسلیم کرلے گا کہ میں نے ان گناہوں کا ارتکاب کیا ہے۔) تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا

جائے گا کہ ہم نے دنیا میں تیری پردہ پوشی کی تھی، جا! آج بھی تجھے معاف کردیا پھر اس کی نیکیوں کا دفتر اسے دے دیا جائے گا۔

باری تعالیٰ بھی ہنس دیں گے

افادات:- دوسری روایتوں میں یہ بھی ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ چھوٹے چھوٹے گناہ اس کے سامنے پیش کریں گے اور اس سے ان کا اقرار لیا جائے گا، اب وہ ڈرے گا کہ ان کے علاوہ میرے بڑے بڑے گناہ بھی ہیں، دیکھو! ان سب کا کیا ہوتا ہے۔ جب وہ ان چھوٹے چھوٹے گناہوں کا اقرار کرلے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا کہ ہم نے دنیا میں تیری پردہ پوشی کی تھی، جا! آج بھی تجھے معاف کردیا، اور ہر گناہ کے بدلہ میں تجھے نیکی دی۔ اُس پر وہ عرض کرے گا کہ باری تعالیٰ! میرے کچھ اور گناہ بھی ہیں جو یہاں نظر نہیں آرہے ہیں۔ اس کے اس جواب پر اللہ تعالیٰ بھی ہنس دیں گے (مسلم شریف، ۴۸۷) یعنی ابھی تو یہ حال تھا کہ وہ اپنے گناہوں سے ڈر رہا تھا کہ ابھی اگر بڑے گناہوں کا تذکرہ آئے گا تو میرا کیا حال ہوگا، اور جب دیکھا کہ یہاں تو بہت کچھ مل رہا ہے تو اب خود ہی یاد دلا رہا ہے کہ ان گناہوں کا تو یہاں کچھ ذکر ہی نہیں ہو رہا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت

لیکن یہاں بخاری و مسلم کی روایت دوسرے انداز سے ہے جس میں یہ ہے کہ جب وہ اپنے گناہوں کا اقرار کرے گا تو باری تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ میں نے تیرے ان گناہوں پر دنیا کے اندر پردہ پوشی کی تھی، اور لوگوں کو تیرے ان گناہوں سے واقف نہیں ہونے دیا تھا، آج بھی کسی کو واقف نہیں ہونے دیا جائے گا۔ ہر آدمی اپنے حالات اور اپنی کوتاہیوں سے بخوبی واقف ہے، ان گناہوں کی اطلاع اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور

کو نہیں ہے، اللہ تعالیٰ سب جانتے ہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا اس امت پر بہت بڑا احسان و انعام ہے۔ اگلی امتوں پر بڑی پابندیاں تھیں، قرآنِ پاک میں نبی کریم ﷺ کی شان یہ بتلائی گئی ہے کہ آپ ﷺ کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے وہ ساری سختیاں اس اُمت پر سے اُٹھالیں۔ مثلاً بنی اسرائیل کے اندر یہ ہوتا تھا کہ کوئی آدمی رات میں کوئی گناہ کرتا تو صبح اس کے دروازہ پر لکھا ہوتا کہ آج اس نے یہ کام کیا ہے، لیکن اس امت کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ چھپا رہے ہیں، بے شمار گناہ ایسے ہوتے ہیں جو دنیا میں کسی کو بھی پتہ نہیں چلتے، یہاں تک کہ اس کی بیوی، اس کا بیٹا، اس کا بھائی، اس کا باپ، اور گھر میں ساتھ رہنے والے افراد، بلکہ اس کا ایسا دوست جو چوبیس گھنٹے ساتھ رہتا ہے، لیکن آدمی ان سے بھی چھپاتا ہے اور جانتا ہے کہ میرے اس گناہ کا اس کو علم نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے ان سارے گناہوں پر پردہ پوشی فرما رکھی ہے۔ تو باری تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ دنیا میں مَیں نے تیرے ان گناہوں کی پردہ پوشی کی اور ان کو چھپایا، لوگوں کے سامنے ان کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب دنیا میں ایمان کی وجہ سے یہ معاملہ کیا گیا تو آخرت میں تو اس ایمان پر مزید انعام دیا جاتا ہے، اس لئے آج یہاں معاف کر دیتے ہیں۔

ایمان والے مطمئن ہیں

اور دوسری بات یہ ہے کہ آدمی کو دنیا میں اپنے کرتوت چھپانے کے بعد بھی ہر وقت یہ ڈر تو لگا ہی رہتا ہے کہ وہ کہیں کھل گئے تو میرا کیا ہوگا۔ لیکن یہاں اللہ تعالیٰ اس کو اطمینان دلاتے ہیں کہ یہ سارے گناہ جو دنیا میں چھپائے گئے تھے، آج بھی چھپا کر معاف کئے جائیں گے اور معافی بھی لوگوں سے چھپا کر ہی عطا ہوگی۔ دنیا والوں کا حال تو یہ ہے کہ کسی کو معاف کر دیں کہ تو نے ایسا کیا تھا، لیکن جا! ہم نے تجھے چھوڑ دیا، تب بھی لوگوں

کے سامنے کم سے کم اس کا اظہار تو کیا جاتا ہے کہ اس نے یہ حرکت کی تھی لیکن اس کو معاف کر دیا جاتا ہے۔ اور قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے یہاں سے جو معافی دی جائے گی تو وہاں لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا، چپکے چپکے ہی معاملہ نمٹ جائے گا۔ اور نیکیوں کا جو اعمال نامہ تھا وہ اس کے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اب ظاہر ہے کہ گناہ تو معاف کر دیئے گئے تھے اور نیکیاں ہی نیکیاں رہی ہیں تو اس کا نتیجہ یہی نکلنے والا ہے کہ وہ خوشی خوشی اپنی نیکیوں کا صحیفہ اور کامیابی کا پروانہ لے کر جنت میں جائے گا۔

بخاری شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی کی روایت ہے جس میں یہ بھی اضافہ ہے کہ اہلِ ایمان کے ساتھ تو یہ معاملہ کیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کا اقرار کرا کر معاف کر دیں گے اور اس معافی کا دوسروں کو پتہ بھی نہیں چلے گا، چپکے چپکے ہی سب معاملہ نمٹا دیا جائے گا۔ باقی جو ایمان والے نہیں ہیں ان کو تو لوگوں کے سامنے کہا جائے گا کہ تم نے ہمارے بھیجے ہوئے رسولوں کو جھٹلایا تھا اور ان پر تم ایمان نہیں لائے (بخاری شریف، ۲۴۴۱) گویا حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک جتنے پیدا ہوئے پوری انسانیت میدانِ حشر میں جمع ہوگی، تمام لوگوں کے سامنے اُن کو رسوا کیا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ بات ایک مؤمن کے لئے بڑی اُمید کی ہے۔

نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں

۴۳۴- وعن ابن مسعود رضی اللہ عنہ أَنَّ رَجُلاً أَصَابَ مِنَ امْرَأَةٍ قُبْلَةً، فَأَتَى النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَأَخْبَرَهُ، فَأَنْزَلَ اللهُ تَعَالىٰ: وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّأٰتِ [هود:۱۱۴] فَقَالَ الرَجُل: أَلِيَ هٰذَا يَا رَسُوْلَ اللهِ؟ قَالَ: لِجَمِيْعِ أُمَّتِيْ كُلِّهِمْ

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے ایک عورت کو بوسہ دے دیا، پھر فوراً نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اطلاع دی (کہ مجھ سے ایسا ہو گیا ہے) اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی جس میں ہے کہ نماز قائم کیجئے دن کے دونوں حصوں میں (یعنی صبح وشام۔ فجر اور عصر کی نماز مراد ہے) اور رات کی کچھ گھڑیوں میں (مغرب اور عشاء کی نماز مراد ہے) نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں۔ اس آدمی نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! یہ میرے لئے خاص ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نہیں! بلکہ میری پوری اُمت کے لئے ہے۔

افادات:- روایتوں میں ہے (سنن ترمذی۔ ۳۱۱۵) ایک عورت ان کے یہاں کھجور خریدنے کے لئے آئی تھی، انہوں نے کہا کہ اندر اچھی کھجوریں رکھی ہوئی ہیں، جب وہ اندر پہنچی تو اس عورت کا بوسہ لے لیا۔ بس ان سے یہ حرکت ہوگئی۔ حضراتِ صحابہ کرامؓ کا معاملہ تو ایسا تھا کہ عام طور پر تو وہ اپنے آپ کو گناہوں سے بچاتے تھے لیکن خدانخواستہ کوئی بات ہوگئی تو پھر ان کے دل کو چین وسکون نہیں ہوتا تھا جب تک کہ وہ گناہ کی سیاہی کو دھو کر صاف نہ کرلیں اور اس کے بوجھ کو اپنے اوپر سے اُتار نہ لیں۔ اس لیے وہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اطلاع دی کہ یارسول اللہ! مجھ سے ایسا گناہ ہو گیا ہے، مجھے پاک کیجئے، یعنی مجھے سزا دیجئے تا کہ میرا گناہ دور ہو جائے اور میرے سر سے بوجھ اتر جائے، مَیں پاک صاف ہو جاؤں، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفاً مِّنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ (هود: ۱۱۴)

بس! تمہارا گناہ معاف ہو گیا

۴۳۵- وعن أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلىٰ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فَقَالَ: يَارَسُولَ

اللهِ! أَصَبْتُ حَدّاً، فَأَقِمْهُ عَلَيَّ. وَحَضَرَتِ الصَّلَاةُ، فَصَلَّى مَعَ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فَلَمَّا قَضَى الصَّلَاةَ. قَالَ: يَارَسُوْلَ اللهِ! إِنِّي أَصَبْتُ حَدّاً فَأَقِمْ فِيَّ كِتَابَ اللهِ. قَالَ: هَلْ حَضَرْتَ مَعَنَا الصَّلَاةَ؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: قَدْ غُفِرَ لَكَ۔ (متفق علیه)

وقوله: (أَصَبْتُ حَدّاً) مَعْنَاهُ: مَعْصِيَةً تُوْجِبُ التَّعْزِيْرَ. وَلَيْسَ الْمُرَادُ الْحَدَّ الشَّرْعِيَّ الْحَقِيْقِيَّ؛ كَحَدِّ الزِّنَا وَالْخَمْرِ وَغَيْرِهِمَا، فَإِنَّ هٰذِهِ الْحُدُوْدَ لَاتَسْقُطُ بِالصَّلَاةِ، وَلَا يَجُوْزُ لِلْإِمَامِ تَرْكُهَا۔

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اللہ کے رسول! میں نے ایک ایسا جرم کیا ہے جس کی وجہ سے مجھ پر حد واجب ہوگئی۔ اتنے میں نماز کا وقت آگیا، تو اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کی، جب نماز پوری ہوچکی تو اس نے پھر وہی بات کہی کہ اللہ کے رسول! مجھے سزا دیجئے اور اللہ کا جو حکم ہے وہ میرے اوپر جاری کرکے مجھے پاک کیجئے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارے ساتھ نماز میں تو تم شریک تھے نا؟ اس نے کہا: جی ہاں تو آپ نے فرمایا کہ بس! تمہارا گناہ معاف ہوگیا۔

کیا اسلامی سزائیں وحشیت ہے؟

افادات:- ''حد'' مخصوص قسم کی سزا ہوا کرتی ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مخصوص گناہوں کے اوپر ضروری قرار دی گئی ہے، مثلاً کوئی آدمی شراب پئے تو اسّی (۸۰) کوڑے اس کو لگائے جاتے ہیں۔ یا کوئی آدمی اگر زنا کا ارتکاب کرے اور وہ غیر شادی شدہ ہے تو سو (۱۰۰) کوڑے، اور شادی شدہ ہے تو اس کو سنگسار کردیا جاتا ہے، اگر کوئی آدمی چوری کرے تو دایاں ہاتھ پہنچوں کے اوپر سے کاٹ دیا جاتا ہے۔ یہ بعض مخصوص گناہوں کے اوپر مخصوص سزائیں ہیں؛ اس کو ''حد'' کہتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کی ہوئی ہے۔ جب کوئی آدمی اس قسم کے گناہ کا ارتکاب

کرے اور حاکم کے سامنے یہ چیز ثابت بھی ہو جائے تو پھر حاکم کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کو معاف کرے، بلکہ اس کو سزا دینا ضروری ہے۔

آج کل کی دنیا میں تو نعوذ باللہ اسلام کی ان سزاؤں کو بڑے خطرناک لفظوں میں وحشیانہ عمل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایسی تعبیر سے ہر مسلمان کو اللہ بچائے۔ اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیئے ہیں اور جو سزائیں مقرر کی ہیں، ان کے متعلق ایسے جملے استعمال کئے جاتے ہیں، حالاں کہ اسلام کی نگاہوں میں انسان کی جان و مال، عزت و آبرو اور عقل و خرد اور نسب کی حفاظت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ کوئی آدمی جب شراب پیتا ہے تو آدمی کی عقل و خرد پر اثر انداز ہوتی ہے، اس لئے شریعت نے اس کے لئے سزا مقرر کی ہے۔ صرف چار پانچ ہی گناہ ایسے ہیں جن کے بارے میں مخصوص قسم کی سزائیں بطورِ حد مقرر کی گئی ہیں؛ ان میں ایک شراب نوشی بھی ہے۔ حدیثِ پاک میں شراب کو ''اُم الخبائث'' تمام گناہوں کی ماں قرار دیا گیا ہے۔ شراب نوشی کی وجہ سے آدمی کی عقل سلامت نہیں رہے گی تو وہ کچھ بھی کر گزرے گا۔ بہت سے لوگ نشہ کی حالت میں زنا کرتے ہیں، قتل کرتے ہیں اور دوسرے گناہوں کا ارتکاب بھی کرتے ہیں، کوئی بھی اقدام کر گزرنا ان سے بعید نہیں ہے؛ اس سے حفاظت کے لئے ایک سزا مقرر کی گئی ہے کہ شراب نوشی پر اسّی (۸۰) کوڑے لگائے جائیں۔

یا کوئی آدمی اگر چوری کرے تو وہ دوسرے کے مال کی حفاظت کو ختم کرتا ہے، اور شریعت کی طرف سے دوسرے کے مال کی حفاظت کی گارنٹی دی گئی ہے، اور جو شخص اس گارنٹی کو ختم کرتا ہے، اس کے لئے سزا مقرر کی گئی ہے۔

اسی طرح کوئی آدمی اگر زنا کا ارتکاب کرتا ہے، تو وہ دوسرے کی عزت و آبرو پر ڈاکہ تو ڈال ہی رہا ہے، ساتھ ہی ساتھ زنا کی وجہ سے نسب مخلوط ہو جائے گا۔ کسی کی بیوی کے

ساتھ زنا کیا تو اب جو بچہ پیدا ہوگا تو پتہ نہیں چل سکتا کہ وہ شوہر کا ہے، یا زانی کا؟ اور اسلام کی نگاہ میں نسب کی حفاظت بھی بنیادی چیزوں میں سے ہے، اس لئے یہ سزا رکھی ہے کہ زنا کے اوپر کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ اور اگر شادی شدہ ایسی حرکت کرے تو چوں کہ زنا سے بچنے کے اسباب مہیا ہو چکے ہیں پھر بھی زنا میں مبتلا ہو رہا ہے، اس لئے اس کی سزا سنگساری رکھی گئی۔ اور کوئی آدمی اگر کسی کی جان پر ڈاکہ ڈالے اور اس کی جان کو ختم کردے تو اس کے بدلہ میں قتل کیا جاتا ہے۔ تو یہ سب سزائیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کی ہوئی ہیں۔

جہاں اسلامی احکام جاری کئے جاتے ہیں اور اسلامی قوانین کا عمل دخل ہے، وہاں کتنی چوریاں ہوتی ہیں؟ کتنے قتل ہوتے ہیں؟ کتنی شراب نوشی ہوتی ہے؟ اس کے اعداد وشمار جمع کر لئے جائیں۔ اس کے مقابلہ میں جو لوگ اسلامی سزاؤں کو غلط قرار دیتے ہیں ان کے یہاں ان جرائم کا کتنا ارتکاب ہوتا ہے، وہاں گناہوں کا کتنا بازار گرم ہو رہا ہے؛ وہ دیکھ لو، اور آج کل کی دنیا ان سزاؤں کو غلط عنوان دے کر اپنے آپ کو ان میں سے کون سے گناہوں سے بچا پا رہی ہے؟ حضراتِ صحابہؓ کی تربیت اس انداز سے کی گئی تھی کہ وہاں اگر کسی سے نادانستہ طور پر کوئی جرم ہو جاتا تو پکڑنے کیلئے پولیس نہیں بھیجنی پڑتی تھی، بلکہ مجرم خود کہہ رہا ہے کہ مجھ سے یہ گناہ ہو گیا ہے، مجھے پاک کردیجئے۔ اس روایت میں بھی اس امت کے لئے بڑی اُمید کی بات آئی ہے کہ جو لوگ نیکیوں کے کام کرتے رہتے ہیں، اگر ان سے کچھ گناہ صادر بھی ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ ان نیکیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف کردیں گے۔

ہم خُرما و ہم ثواب

۴۳۶ - وعنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: إِنَّ اللهَ لَيَرْضَى عَنِ الْعَبْدِ أَنْ

يَأْكُلَ الْأَكْلَةَ فَيَحْمَدُهُ عَلَيْهَا ، أَوْ يَشْرَبَ الشَّرْبَةَ فَيَحْمَدُهُ عَلَيْهَا . (رواہ مسلم)

(اَلْأَكْلَةَ): بِفَتْحِ الْهَمْزَةِ وَهِيَ الْمَرَّةُ الْوَاحِدَةُ مِنَ الْأَكْلِ كَالْغَدْوَةِ وَالْعَشْوَةِ.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اس بات پر راضی ہوتا ہے کہ وہ کھانا کھائیں تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کریں، یا کوئی چیز پئیں تو اس پر اللہ کی حمد وثنا بیان کریں۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ کھا کر جب آدمی دُعا پڑھتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مُسْلِمِيْنَ . اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان اور اس کی تعریف ہے کہ اس نے ہم کو کھلایا پلایا اور ہمیں مسلمان بنایا؛ تو اللہ تعالیٰ اس بندے سے خوش اور راضی ہوجاتا ہے، گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کر کے کھانے پینے کا حق ادا کیا۔

توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے

۴۳۷ - وعن أبي موسىٰ رضی اللہ عنہ عن النبي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: إِنَّ اللهَ تَعَالىٰ يَبْسُطُ يَدَهُ بِاللَّيْلِ لِيَتُوْبَ مُسِيءُ النَّهَارِ ، وَيَبْسُطُ يَدَهُ بِالنَّهَارِ لِيَتُوْبَ مُسِيءُ اللَّيْلِ ، حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا . (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

ترجمہ:- حضرت اَبوموسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ رات کو اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے تاکہ دن کا گنہگار توبہ کرلے۔ اور دن کو اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے تاکہ رات کا گنہگار توبہ کرلے، یہاں تک کہ سورج مغرب کی جانب سے طلوع ہو۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے دن میں گناہ کئے تو رات کو توبہ کرلے؛ اللہ تعالیٰ معاف کردیتے ہیں۔ رات میں گناہ کئے تو دن میں توبہ کرلے؛ اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے۔ البتہ آخری زمانہ میں جب قیامت

قریب ہوگی اور سورج مغرب کی طرف سے طلوع ہوگا، اس کے بعد توبہ قبول نہیں ہوگی۔

یہ بھی بڑی امید کی چیز ہے۔ آدمی کتنا ہی گنہ گار کیوں نہ ہو، اسلام میں اس کے لئے مایوسی کی کوئی بات نہیں ہے، بس! توبہ کرلے۔ اور توبہ کے لئے بھی کوئی قید وشرط نہیں ہے۔ وہ جہاں ہے وہیں اپنی جگہ پر اُسی حالت میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوجائے اور اپنے گناہ پر پچھتائے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور یہ عہد کرے کہ آئندہ نہیں کروں گا؛ بس! توبہ ہوگئی۔

صلوۃ الوضوء کی فضیلت

۴۳۸- وعَنْ أَبِي نَجِيْح عمرِو بْنِ عَبَسَةَ السُّلَمِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: كُنْتُ وَأَنَا فِيْ الْجَاهِلِيَّةِ أَظُنُّ أَنَّ النَّاسَ عَلىٰ ضَلاَلَةٍ، وَأَنَّهُمْ لَيْسُوْا عَلىٰ شَيْءٍ، وَهُمْ يَعْبُدُوْنَ الْأَوْثَانَ فَسَمِعْتُ بِرَجُلٍ بِمَكَّةَ يُخْبِرُ أَخْبَاراً، فَقَعَدْتُ عَلىٰ رَاحِلَتِيْ، فَقَدِمْتُ عَلَيْهِ، فَإِذَا رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مُسْتَخْفِياً، جَرَاءٌ عَلَيْهِ قَوْمُهُ، فَتَلَطَّفْتُ حَتَّى دَخَلْتُ عَلَيْهِ بِمَكَّةَ، فَقُلْتُ لَهُ: مَا أَنْتَ؟ قَالَ: أَنَا نَبِيٌّ۔ قُلْتُ: وَمَا نَبِيٌّ؟ قَالَ: أَرْسَلَنِيَ اللهُ۔ قُلْتُ: وَبِأَيِّ شَيْءٍ أَرْسَلَكَ؟ قَالَ: أَرْسَلَنِيْ بِصِلَةِ الْأَرْحَامِ، وَكَسْرِ الْأَوْثَانِ، وَأَنْ يُوَحَّدَ اللهُ لاَ يُشْرَكُ بِهِ شَيْءٌ. قُلْتُ: فَمَنْ مَعَكَ عَلىٰ هٰذَا؟ قَالَ: حُرٌّ وَعَبْدٌ۔ وَمَعَهُ يَوْمَئِذٍ أَبُوْبَكْرٍ وَبِلاَلٌ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا۔ قُلْتُ: إِنِّي مُتَّبِعُكَ. قَالَ: إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ ذَالِكَ يَوْمَكَ هٰذَا، أَلاَ تَرَى حَالِيْ وَحَالَ النَّاسِ؟ وَلٰكِن ارْجِعْ إِلىٰ أَهْلِكَ، فَإِذَا سَمِعْتَ بِيْ قَدْ ظَهَرْتُ فَأْتِنِيْ۔ قَالَ: فَذَهَبْتُ إِلىٰ أَهْلِيْ وَقَدِمَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الْمَدِيْنَةَ حَتَّى قَدِمَ نَفَرٌ مِنْ أَهْلِيْ الْمَدِيْنَةَ۔ فَقُلْتُ: مَا فَعَلَ هٰذَا الرَجُلُ الَّذِيْ قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ؟ فَقَالُوْا: النَّاسُ إِلَيْهِ سِرَاعٌ، وَقَدْ أَرَادَ قَوْمُهُ قَتْلَهُ، فَلَمْ يَسْتَطِيْعُوا ذَالِكَ. فَقَدِمْتُ

الْمَدِيْنَةَ، فَدَخَلْتُ عَلَيْهِ،فَقُلْتُ:يَارَسُوْلَ اللهِ! أَتَعْرِفُنِيْ؟قَالَ:نَعَمْ،أَنْتَ الَّذِيْ لَقِيْتَنِيْ بِمَكَّةَ.قَالَ:فَقُلْتُ:يَارَسُوْلَ اللهِ!أَخْبِرْنِيْ عَمَّا عَلَّمَكَ اللهُ وَأَجْهَلُهُ. أَخْبِرْنِيْ عَنِ الصَّلاَةِ؟قَالَ:صَلِّ صَلاَةَالصُّبْحِ ثُمَّ اقْصُرْ عَنِ الصَّلاَةِ حَتّٰى تَرْتَفِعَ الشَّمْسُ قِيْدَرُمْحٍ،فَإِنَّهَاتَطْلُعُ بَيْنَ قَرْنَيْ شَيْطَانٍ وَحِيْنَئِذٍيَسْجُدُ لَهَا الْكُفَّارُ.ثُمَّ صَلِّ، فَإِنَّ الصَّلاَةَ مَشْهُوْدَةٌ مَحْضُوْرَةٌ حَتّٰى يَسْتَقِلَّ الظِّلُّ بِالرُّمْحِ، ثُمَّ اقْصُرْ عَنِ الصَّلاَةِ، فَإِنَّهُ حِيْنَئِذٍ تُسْجَرُ جَهَنَّمُ . فَإِذَا أَقْبَلَ الْفَيْئُ فَصَلِّ، فَإِنَّ الصَّلاَةَ مَشْهُوْدَةٌ مَحْضُوْرَةٌحَتّٰى تُصَلِّيَ الْعَصْرَ،ثُمَّ اقْصُرْ عَنِ الصَّلاَةِحَتّٰى تَغْرُبَ الشَّمْسُ، فَإِنَّهَا تَغْرُبُ بَيْنَ قَرْنَيْ شَيْطَانٍ،وحِيْنَئِذٍيَسْجُدُ لَهَاالْكُفَّارُ.قَالَ:فَقُلْتُ:يَانَبِيَّ اللهِ! فَالْوُضُوْءَ حَدِّثْنِيْ عِنْهُ؟فَقَالَ:مَامِنْكُمْ رَجُلٌ يُقَرِّبُ وَضُوْئَهُ فَيَتَمَضْمَضُ وَيَسْتَنْشِقُ فَيَسْتَنْثِرُ، إِلاَّ خَرَّتْ خَطَايَاوَجْهِهِ،وَفِيْهِ،وَخَيَاشِيْمِهِ. ثُمَّ إِذَاغَسَلَ وَجْهَهُ كَمَا أَمَرَهُ اللهُ، إِلاَّ خَرَّتْ خَطَايَاوَجْهِهِ مِنْ أَطْرَافِ لِحْيَتِهِ مَعَ الْمَاءِ. ثُمَّ يَغْسِلُ يَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ إِلاَّ خَرَّتْ خَطَايَا يَدَيْهِ مِنْ أَنَامِلِهِ مَعَ الْمَاءِ. ثُمَّ يَمْسَحُ رَأْسَهُ مِنْ أَطْرَافِ شَعْرِهِ مَعَ الْمَاءِ ثُمَّ يَغْسِلُ قَدَمَيْهِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ إِلاَّ خَرَّتْ خَطَايَارِجْلَيْهِ مِنْ أَنَامِلِهِ مَعَ الْمَاءِ. فَإِنْ هُوَ قَامَ فَصَلَّى، فَحَمِدَ اللهَ تَعَالىٰ،وَأَثْنَىٰ عَلَيْهِ وَمَجَّدَهُ بِالَّذِيْ هُوَ لَهُ أَهْلٌ، وَفَرَّغَ قَلْبَهُ لِلّٰهِ تَعَالىٰ إِلاَّ انْصَرَفَ مِنْ خَطِيْئَتِهِ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ.

فَحَدَّثَ عَمْرُو بْنُ عَبَسَةَ بِهٰذَا الْحَدِيْثَ أَبَاأُمَامَةَ صَاحِبَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَقَالَ لَهُ أَبُو أُمَامَةَ:يَاعَمْرُو بْنُ عَبَسَةَ!أُنْظُرْ مَاتَقُوْلُ!فِيْ مَقَامٍ وَاحِدٍ يُعْطَى هٰذَا الرَّجُلُ؟ فَقَالَ عَمْرٌو: يَاأَبَاأُمَامَةَ !لَقَدْ كَبُرَتْ سِنِّيْ،وَرَقَّ عَظْمِيْ،وَاقْتَرَبَ أَجَلِيْ، وَمَابِيْ حَاجَةٌ أَنْ أَكْذِبَ عَلَى اللهِ تَعَالىٰ وَلاَ عَلىٰ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ لَوْلَمْ أَسْمَعْهُ مِنْ

رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم إِلاَّ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلاَثاً حَتّٰى عَدَّ سَبْعَ مَرَّاتٍ، مَا حَدَّثْتُ أَبَدًا بِهِ، وَلٰكِنِّيْ سَمِعْتُهُ أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں جب کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت نہیں ہوئی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا سلسلہ جاری نہیں ہوا تھا اس وقت بھی میں یہ سمجھتا تھا کہ لوگ گمراہی پر ہیں، بتوں کی پوجا کرتے ہیں، اور کسی دین کے پابند نہیں ہیں (مطلب یہ ہے کہ اس وقت بھی مَیں بت پرستی کو برا سمجھتا تھا) پھر مجھے پتہ چلا کہ مکہ مکرمہ میں ایک آدمی ظاہر ہوئے ہیں اور وہ کچھ غیب کی خبریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ باتیں لوگوں کو بتلا رہے ہیں، تو مَیں اپنے اونٹ پر سوار ہوا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، جس وقت مَیں پہنچا تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ والوں کی ایذاءرسانیوں کی وجہ سے چھپے ہوئے تھے، آپ کی قوم آپ کو بڑی تکلیفیں پہنچا رہی تھی (ایسے وقت میں حضور کی خدمت میں کیسے حاضر ہونا جبکہ کوئی بتاتا بھی نہیں تھا کہ حضور کہاں ہیں جیسے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ وہ پہنچے تھے، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بتلایا کہ میرے پیچھے پیچھے اس طرح آنا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ تم میرے پیچھے آرہے ہو) اسی طرح مَیں نے بھی مکہ پہنچ کر تدبیر کی اور کسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گیا وہاں پہنچ کر مَیں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ سوال کیا: آپ کون ہیں اور کیا ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا میں نبی ہوں۔ میں نے پوچھا: نبی کیا ہوتا ہے (اس لئے کہ آج تک نبی کا لفظ سنا نہیں تھا) تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنا پیغام لے کر بھیجا ہے (اور جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنا پیغام بندوں تک پہنچائیں اس کو نبی کہتے ہیں) میں نے پوچھا: کیا پیغام اور کیا تعلیمات دے کر آپ کو بھیجا ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جن احکام کو لے کر بھیجا ہے ان میں ایک تو صلہ رحمی ہے (یعنی رشتہ داری کے حقوق کو ادا کرنا۔ صلہ رحمی اسلام کی بالکل ابتدائی تعلیمات میں سے ہے،

جبکہ ابھی نماز روزہ اور دیگر عبادتیں فرض نہیں ہوئی تھیں۔ گویا صلہ رحمی کا خوبی کی چیز ہونا ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے) اور بتوں کے توڑنے کا حکم لے کر بھیجا ہے۔ اور یہ حکم دیا ہے کہ اللہ کو ایک مانا جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ میں نے پوچھا: آپ جو پیغام اور حکم لے کر آئے ہیں، اس میں آپ کا ساتھ کون دے رہا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک غلام اور ایک آزاد۔ اس دن نبی کریم ﷺ کے اوپر ایمان لانے والوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے جو آزاد تھے، اور غلاموں میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ تھے۔

عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں بھی آپ کی پیروی کروں گا، اور میں بھی آپ پر ایمان لاتا ہوں۔ تو جواب میں حضور نے فرمایا کہ آج اس حالت میں تم وہ نہیں کر سکو گے (دیکھو! نبی کریم ﷺ نے ایمان لانے سے منع نہیں فرمایا، ان کے ایمان کو تو آپ ﷺ نے قبول کر لیا لیکن مکہ میں رہ کر اپنے ایمان کے اظہار اور اعلان سے آپ نے منع فرمایا کہ بھائی تم سے یہ نہیں ہو سکے گا، تم اگر اپنے ایمان کا اعلان کر دو گے تو پھر وہ لوگ تم پر ٹوٹ پڑیں گے اور تمہیں بہت تکلیفیں پہنچائیں گے۔ ہم تو یہاں کے رہنے والے ہیں اور یہ تکلیفیں پہنچانے والے بھی ہمارے اپنے ہیں، پھر بھی یہ ہم کو نہیں چھوڑتے، تو تمہارا حال کیا ہوگا جبکہ تم تو اجنبی ہو، تمہارے ساتھ تو اور زیادتی ہوگی جو تم برداشت نہیں کر سکو گے) تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ میرا اور وہ لوگ جو میرے اوپر ایمان لائے ہیں ان کا کیا حال ہو رہا ہے۔ اس لئے میں تم کو مشورہ دیتا ہوں کہ اپنے گھر اپنے قبیلہ اور وطن میں واپس ہو جاؤ، جب تم کو پتہ چلے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے لوگوں پر غلبہ دیا تب میرے پاس آنا (دیکھو! حضور ﷺ کو اپنے غلبہ اور ظہور کا کتنا قوی یقین تھا کہ ایک وقت آئے گا اور تمہیں پتہ چلے گا اور یہ اطلاع ملے گی کہ مجھے اللہ نے سب لوگوں پر کامیابی عطا فرمائی ہے، اس وقت میرے پاس چلے آنا۔)

حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے وطن واپس لوٹ گیا، اس کے بعد تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے گئے، میں اپنے وطن اور اپنے قبیلہ ہی میں رہا اور میں لوگوں سے باقاعدہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبریں معلوم کرتا رہا اور لوگوں سے آپ کا حال پوچھتا رہا، یہاں تک کہ میرے قبیلہ کے کچھ لوگ مدینہ منورہ پہنچے اور جب واپس آئے تو میں نے پوچھا: بھائی! یہ صاحب جو ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تھے ان کا کیا حال ہے؟ اور ان کی کیا خبر ہے؟ ان آنے والوں نے مجھے بتلایا کہ لوگ اب ان کی دعوت کو بہت تیزی سے قبول کر رہے ہیں، اور مکہ والوں نے ان کو قتل کرنا چاہا لیکن نہیں کر سکے۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا تو میں مدینہ منورہ آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے پہلا سوال کیا: اللہ کے رسول! آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جی ہاں! تم وہی ہو جو مجھے مکہ مکرمہ میں ملے تھے۔

نماز کے اوقات کی تعلیم

پھر میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت سارے احکام بتلائے ہیں، وہ سب آپ مجھے بتلائیے اور مجھے نماز کا طریقہ بھی سکھلائیے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتلایا کہ فجر کی نماز ادا کرو اور پھر نماز پڑھنے سے رک جاؤ، یہاں تک کہ سورج طلوع ہونے کے بعد ایک نیزہ کے برابر اونچا ہو جائے، اس لئے کہ جس وقت سورج طلوع ہوتا ہے تو شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے، اور اس وقت کافر لوگ سورج کو سجدہ کرتے ہیں۔

شیطان کا عجیب تماشہ

(شیطان نے بھی عجیب تماشہ بنا رکھا ہے، سورج کی پوجا کرنے والوں کے اوقات مقرر ہیں، جس وقت سورج طلوع وغروب ہوتا ہے تو اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے

ہیں اور اس کی پوجا کرتے ہیں، تو شیطان کی عادت یہ ہے کہ جس وقت سورج طلوع ہوتا ہے تو شیطان سورج کے بالکل سامنے آ کر اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے کہ سورج اس کے پیچھے ایسا لگتا ہے کہ اس کے دو سینگ کے درمیان ہو، اسی کو تعبیر کیا گیا ہے کہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے بیچ میں طلوع ہوتا ہے، اور شیطان دیکھنے والوں کو یہ تأثر دیتا ہے کہ یہ لوگ میری پوجا کر رہے ہیں، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس وقت سورج طلوع ہونے لگے اس وقت عبادت مت کرو، اس لئے کہ یہ کافروں کی عبادت کا وقت ہے)۔

پھر اس کے بعد جب ایک نیزہ بلند ہو جائے تو نماز پڑھ لو، اس وقت اگر تم نماز پڑھو گے تو فرشتے تمہاری نماز کے اندر حاضر ہوں گے اور اس کا ثواب بھی لکھا جائے گا یہاں تک کہ نیزہ کا سایہ کم سے کم جتنا ہو سکتا ہے اتنا ہو جائے، اس وقت پھر نماز پڑھنا بند کر دو۔ (مطلب یہ ہے کہ سورج جب بالکل سر کے اوپر آ جائے گا تو ہر چیز کا سایہ بالکل کم ہو جائے گا، اس لئے کہ سورج جب اونچا ہونا شروع ہوتا ہے، تو ہر چیز کا سایہ گھٹنا شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ ذرا سا رہ جاتا ہے۔ بعض علاقے تو ایسے ہیں جہاں سورج بالکل سر کے اوپر تو نہیں آتا، لیکن آسمان کے بیچ میں آ جاتا ہے، اور ذرا جھکاؤ ہوتا ہے، کیوں کہ ہمارے علاقوں میں دوپہر کے وقت سردیوں میں سایہ ذرا لمبا ہوتا ہے، اور گرمیوں میں کم ہوتا ہے، پھر جب سورج دوسری طرف ڈھلنا شروع ہوگا تو سایہ پھر دوبارہ بڑھنا شروع ہوگا۔ صبح سے استوائے شمس تک تو سایہ مغرب کی طرف تھا اب مشرق کی جانب ہو جائے گا؛ اسی کو ''فے'' کہتے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ) جب سورج بالکل بیچ میں آ جائے تو نماز پڑھنا بند کر دو، اس لئے کہ اس وقت جہنم کو بھڑکایا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب سایہ مشرق کی طرف جانے لگے تو نماز شروع کرو (یعنی سورج ڈھل جائے تو نماز پڑھو) اس لئے کہ اس وقت نماز پڑھو گے تو فرشتے بھی آئیں گے اور اعمال نامہ میں نیکیاں بھی لکھی جائیں گی، یہاں تک کہ عصر کا

وقت آجائے تو عصر کی نماز پڑھ لو۔ جب عصر کی نماز پڑھ لی تو اب نماز پڑھنا بند کردو یہاں تک کہ سورج ڈوب جائے، اس لیے کہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ڈوبتا ہے اور اس وقت کافر لوگ اس کو سجدہ کرتے ہیں (اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو نماز کے اوقات بتائے)

وضو کا طریقہ

حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: آپ مجھے وضو کے متعلق بتائیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی آدمی اپنے وضو کا پانی اپنے قریب کرتا ہے، اور کلّی کرتا ہے، ناک میں پانی ڈالتا اور نکالتا ہے، تو اس کے مَنخُر وں اور منہ سے گناہ دُھل جاتے ہیں، پھر جب چہرہ دھوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تو چہرہ کے گناہ ڈاڑھی کی طرف سے دُھل جاتے ہیں۔ پھر جب ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوتا ہے تو دونوں ہاتھوں کے گناہ پوروں سے دُھل کر پانی کے ساتھ نیچے زمین پر گرتے ہیں، اور جب سر کا مسح کرتا ہے تو اس کے سر کے گناہ بالوں کی طرف سے پانی کے ساتھ گرتے ہیں۔ اور پھر جب دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوتا ہے تو اس کے پاؤں کے گناہ پوروں سے انگلیوں کے پانی سے نیچے گرتے ہیں۔ جب پوروں سے پانی ٹپکتا ہے تو گناہ بھی ٹپک جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد جب کھڑا ہو کر نماز پڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتا ہے (جیسے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ کہتا ہے) اور جیسا اللہ تعالیٰ کا حق ہے اس کی تعریف کرتا ہے، اور اپنے دل کو خالص اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے، تو وہ اپنے گناہوں سے ایسا پاک ہو جاتا ہے جیسے اس کی ماں نے اس کو جنا تھا۔

مَیں کیوں جھوٹ باندھوں

(راوی کہتے ہیں کہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے یہ روایت بیان کی تو ایک صحابی حضرت ابوأمامہ رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے۔ اب چوں کہ اس میں وضو کرنے کے

بعد دو رکعت پڑھنے پر یہ فضیلت بتلائی گی ہے کہ گناہوں سے ایسا پاک ہو جاتا ہے جیسا کہ ماں نے آج اس کو جنا ہو تو) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اے عمرو بن عبسہ! ذرا سوچ کر بولو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ایک ہی مرتبہ میں سارے گناہوں کو ختم کر دیا جائے گا۔ اس کے جواب میں عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اے ابوامامہ! میری عمر بڑی ہوگئی ہے، میری ہڈیاں کمزور پڑ گئی ہیں اور میری موت کا وقت قریب ہے، مجھے کوئی ضرورت نہیں پڑی کہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف کوئی جھوٹ باندھوں (اس میں میرا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے۔ جب آدمی موت کے قریب ہوتا ہے تو اس کی زیادہ سے زیادہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے تو اللہ کے نام پر میں ایسی جھوٹی بات کروں اور حضور کے حوالہ سے ایسی جھوٹی بات کہوں اس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔) اگر میں نے یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک مرتبہ، دو مرتبہ، تین مرتبہ، یہاں تک کہ سات مرتبہ نہ سنی ہوتی تو کبھی بھی میں یہ بات بیان نہ کرتا۔ گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد جو میں نے بیان کیا ہے وہ میں نے ایک مرتبہ نہیں، سات مرتبہ؛ بلکہ اس سے بھی زیادہ مرتبہ سنا ہے (یہ بڑی امید والی روایت ہے، اسی لئے یہاں پیش کی ہے)

جب رحم کرنا چاہتے ہیں

۴۳۹ - وعن أبي موسى الأشعري رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: إِذَا أَرَادَ اللهُ تَعَالىٰ رَحْمَةَ أُمَّةٍ، قَبَضَ نَبِيَّهَا قَبْلَهَا، فَجَعَلَهُ لَهَا فَرَطًا وَسَلَفاً بَيْنَ يَدَيْهَا وإِذَا أَرَادَ هَلَكَةَ أُمَّةٍ، عَذَّبَهَا، وَنَبِيُّهَا حَيٌّ، فَأَهْلَكَهَا وَهُوَ حَيٌّ يَنْظُرُ، فَأَقَرَّ عَيْنَهُ بِهَلاَكِهَا حِيْنَ كَذَّبُوهُ وَعَصَوْا أَمْرَهُ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی امت کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرنا چاہتے ہیں تو اس امت کے نبی کو اس سے پہلے

وفات دے دیتے ہیں (اُمت باقی رہتی ہے) اوراس نبی کوان کے لیے پیش رو بنا کر اُٹھا لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جب کسی امت یا قوم کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس اُمت کو نبی کی موجودگی اور زندگی میں ہی عذاب دیتے ہیں، وہ نبی زندہ ہوتے ہیں اور امت کی ہلاکت کو دیکھ رہے ہوتے ہیں اوراس طرح نبی کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں کہ انھوں نے مجھے جھٹلایا، اور میری نافرمانی کی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سزادی۔

پیش رو کا مطلب

افادات:- اُس زمانہ میں جب کوئی قافلہ یا لشکر سفر کرنے والا ہوتا تھا تو اس قافلہ یا لشکر کے کچھ لوگوں کو پہلے بھیج دیا جاتا تھا۔ مثلاً لشکر تو یہاں سے شام کو روانہ ہونے والا ہے، اور دس کلومیٹر دور جا کر پڑاوٗ ڈالنے کا ارادہ ہے تو جو جگہ قیام کے لئے طے ہوتی تھی وہاں پہلے سے چند آدمیوں کو بھیج دیا جاتا تھا، وہاں پہنچ کر یہ لوگ آنے والے قافلہ اور لشکر کے لئے پانی کا انتظام کرتے تھے، تاکہ جب قافلہ وہاں پہنچے تو تکلیف نہ ہو، پہنچتے ہی سب چیزیں تیار ملیں۔ تو پہلے جا کر انتظام کرنے والے کو عربی زبان میں ’’فَرَطٌ‘‘ کہتے ہیں، اردو میں اس کا ترجمہ ’’پیش رو‘‘ کرتے ہیں پہلے سے آگے جا کر انتظام کرنے والی جماعت۔ گویا اللہ تعالیٰ کسی قوم کی موجودگی میں اس قوم کے نبی کو وفات دیتے ہیں تو اس نبی کی ذات کو اس قوم کے لئے پیش رو بنا دیتے ہیں، وہ نبی اللہ تعالیٰ کے یہاں جا کر اس امت کے لئے سب تیار کرتا ہے۔ اسی لئے حضور ﷺ نے جو آخری خطبہ دیا تھا، اس میں حضراتِ صحابہ کرامؓ کو یہی فرمایا تھا کہ میں تمہارے لئے پیش رو ہوں، میرا تم سے حوضِ کوثر پر ملاقات کا وعدہ ہے۔

جب ہلاک کرنا چاہتے ہیں

اور اللہ تعالیٰ جب کسی امت یا قوم کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس اُمت کو نبی کی

موجودگی میں کوعذاب دیتے ہیں اور یہ اس امت کے لئے برائی کی چیز ہے۔اس امت کواللہ تعالیٰ ایسی حالت میں ہلاک کرتا ہے کہ وہ نبی موجود ہوتے ہیں اورامت کی ہلاکت کو دیکھ رہے ہوتے ہیں، گویا لوگوں نے نبی کو جھٹلایا یا تکلیفیں پہنچائی تو اللہ تعالیٰ اس نبی کے دیکھتے ہوئے اُن لوگوں کو ہلاک کرتے ہیں، تاکہ نبی کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں کہ انھوں نے مجھے جھٹلایا اور میری نافرمانی کی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سزادی۔

ظاہر ہے کہ ہم امتِ محمدیہ کے لئے اس روایت میں بہت ہی امید افزا بات ہے کہ اُمتِ محمدیہ کے موجود ہوتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا سے اُٹھالیا۔آپ کا دنیا سے تشریف لے جانا پوری امت کے لئے اس معنیٰ کر رحمت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے لئے پہلے سے جاکر پیش رو بنے ہوئے ہیں، اور وہاں جاکر ہمارے لئے سب تیاری کروارہے ہیں۔

فَضْلُ الرَّجَآءِ

اللہ تعالیٰ سے امید رکھنے کی فضیلت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَ نَسۡتَعِیۡنُہٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا کَثِیۡرًا. أما بعد:-

قال اللہُ تعالیٰ أخبارًا عن العبد الصالح: ﴿وَأُفَوِّضُ أَمۡرِیۡ إِلَی اللّٰہِ إِنَّ اللّٰہَ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ. فَوَقَاہُ اللّٰہُ سَیِّئَاتِ مَا مَکَرُوۡا﴾ (غافر:۴۴،۴۵)

تو اللہ تعالیٰ نے ان کو محفوظ رکھا

پہلے علامہ نووی ؒ نے اُمید اور خوف کے متعلق روایتیں پیش کی تھیں۔ اس سے پہلے باب میں صرف اُمید کا تذکرہ تھا، اب اس باب میں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ آدمی اللہ تبارک وتعالیٰ سے اُمید رکھتا ہے تو اس کے لئے کیا فضیلت ہے اور اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے پر کن کن انعامات سے نوازا جاتا ہے، اس پر کیا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔

سورۂ غافر میں اللہ تعالیٰ ایک بندے کا تذکرہ کرتے ہیں جس نے لوگوں کو ایمان کی دعوت دی تھی اور اُن کی طرف سے اس بندۂ صالح کو گزند اور تکلیف پہنچانے کی دھمکی دی گئی تھی، اس موقع پر اس بندے نے جواب میں ایک بات کہی جس کا یہاں تذکرہ ہے۔ اس نے جواب میں کہا: میں اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات سے بخوبی واقف ہے۔ یعنی بندہ کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اور بندہ اللہ تعالیٰ سے جس طرح کی اُمید قائم کرکے اپنے امور، معاملات اور

اپنی ضرورتوں کو اس کے حوالے کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس سے بخوبی واقف ہے۔ جب انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھتے ہوئے، اپنے مخالفین کی شرارتوں اور ان کی طرف سے جو تکلیفیں جو ایذائیں پہنچ سکتی تھیں، ان کی طرف سے جو سازش ان کے ساتھ کی جاسکتی تھی، اس کے جواب میں اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا تو باری تعالیٰ نے ان کے مخالفین کی سازشوں سے ان کو محفوظ رکھا۔

جب دشمن سازشیں کرے

اس آیت کے ذریعہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ہر آدمی کی زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جہاں دشمنوں اور مخالفین کی طرف سے اس کے ساتھ اس قسم کا معاملہ کیا جاسکتا ہے، اور وہ بلا وجہ اس کو گزند اور تکلیف پہنچا سکتے ہیں۔ خاص طور سے وہ اللہ کے بندے جو اللہ کے لئے کام کرتے ہیں، اور اللہ کی دعوت اور پیغام کو لوگوں تک پہنچاتے ہیں، دین کے کام میں لگے ہوئے ہیں، اور اس نسبت سے ان کے ساتھ مخالفت کا معاملہ کیا جاتا ہے، اور مخالفین ان کو گزند اور تکلیف پہنچانے کی تدبیریں کرتے ہیں ایسے مواقع پر جو آدمی اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کرتے ہوئے اور اللہ سے اُمید و اعتماد رکھتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ میں اپنے معاملات کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتا ہوں، وہ میری طرف سے فیصلہ کرے گا، تو ایسے مواقع پر اللہ تعالیٰ دشمن کی طرف سے کی جانے والی سازشوں سے اپنے اس بندے کو محفوظ رکھتے ہیں۔ فارسی کا مقولہ ہے کہ:-

دشمن اگر قوی است، محافظ قوی تر است

دشمن اگر مضبوط ہے تو حفاظت کرنے والی ذات اس سے زیادہ مضبوط ہے۔ آدمی کو ایسے مواقع پر دشمن کے پاس جو کچھ طاقت اور اسباب و وسائل ہیں، ان اسباب و وسائل

اور طاقت کو دیکھ کر گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید واعتماد رکھتے ہوئے اللہ کے حوالے کر دے، تو پھر بڑے سے بڑا دشمن بھی اس کو کوئی گزند و تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔ اللہ تعالیٰ حفاظت کرنے والے ہیں۔

جیسی امید ویسا معاملہ

۴۴۰-وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن رَسُوْل اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم أَنَّهُ قَالَ:قَالَ اللهُ: أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ،وَأَنَامَعَهُ حَيْثُ يَذْكُرُنِيْ.وَاللهِ!لَلّٰهُ أَفْرَحُ بِتَوْبَةِ عَبْدِهِ مِنْ أَحَدِكُمْ يَجِدُ ضَالَّتَهُ بِالْفَلَاةِ. وَمَنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ شِبْراً،تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ ذِرَاعاً.وَمَنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ ذِرَاعاً،تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ بَاعًا.وإِذَا أَقْبَلَ إِلَيَّ يَمْشِيْ، أَقْبَلْتُ إِلَيْهِ أُهَرْوِلُ.(متفق عليه)

ترجمہ:-حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول نقل کیا کہ میرا بندہ میرے ساتھ جو گمان رکھتا ہے، اس کے مطابق میں اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہوں۔ میں بندے کے ساتھ ہوتا ہوں، جب بھی وہ مجھے یاد کرے۔ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو اپنے گمشدہ جانور کو جنگل وصحرا اور رن کے اندر پالے۔ جو آدمی میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے، میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں۔ اور جب کوئی بندہ میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف چار ہاتھ بڑھتا ہوں۔ اور جو میری طرف چل کر آتا ہے، میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔

افادات:- پہلا جملہ اس باب کے عنوان کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ چوں کہ باب کا عنوان قائم کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے امید رکھنے کی کیا فضیلت ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ بندے کو اپنی زندگی میں جو بھی امور اور معاملات پیش آتے ہیں ان میں وہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے جس طرح کی اُمیدیں رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ اپنے معاملات کو اللہ کے حوالے کر دیتے ہیں، تو اللہ

تعالیٰ ان کے کام بغیر تدبیروں کے بنا دیتے ہیں۔ عام طور پر دوسرے لوگ ویسے امور میں جو کاوشیں اور مشقتیں اٹھاتے ہیں، ایسی مشقت اور تکلیف اُٹھائے بغیر ہی اللہ تعالیٰ اس کے کام بنا دیتے ہیں۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ روزی کے معاملہ میں بھی اور دوسرے معاملات کے اندر بھی آدمی اللہ تعالیٰ سے جیسی اُمید رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتے ہیں۔ باقی یہ ہے کہ اللہ کی ذات پر اعتماد اور اُمید کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ دل کا حال خوب جانتے ہیں۔ ایک آدمی کے دل میں تردد ہے، اور زبان سے اعتماد و توکل کا اظہار کرے تو پھر اس کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کیا جائے گا۔ سیدھی بات ہے۔

زبانی جمع خرچ نہیں چلے گا

آدمی کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو بھی معاملہ ہوتا ہے اس میں صرف زبانی جمع خرچ کام نہیں دیتا۔ بندے تو دھوکہ کھا سکتے ہیں، کسی بندے کے سامنے آپ اپنی وفاداری اور دلی محبت کا اظہار کریں اور آپ جو کہہ رہے ہیں، آپ کے دل میں وہ ساری باتیں نہیں ہیں، تو چونکہ آپ کے دل کے حال سے وہ واقف نہیں ہے، اس لیے وہ تو آپ کی باتوں کو سن کر متاثر ہوگا اور آپ کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرے گا۔ اور ایسا بندوں کے ساتھ ہو سکتا ہے اس لئے کہ بندے دل کے حال سے واقف نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ جب معاملہ ہوگا تو وہ تو دل کے بھید سے بخوبی واقف ہے، جیسا آدمی کے دل میں ہوگا ویسا ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاملہ کیا جائے گا، وہاں زبانی جمع خرچ کے طور پر آدمی لاکھ کہے کہ میں نے اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا ہے، مجھے تو اللہ کی ذات پر پورا اعتماد ہے، مجھے تو اس سے پوری اُمید ہے، یہ سب کچھ بولتا رہے، لیکن دل

میں اگر دوسری بات ہے، تو ظاہر ہے اللہ تعالیٰ تو دل کی حالت سے بخوبی واقف ہے جیسا دل میں ہے ویسا ہی اس کے ساتھ معاملہ ہوگا۔ آپ یوں سمجھیں کہ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مجھے روزی دیں گے، اگر محنت کروں گا تو ملے گی؛ تو اب محنت کرو گے تو ملے گی لیکن اگر آپ یوں کہتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتا ہوں کہ بغیر محنت کے مجھے کھلائے گا، تو اگر واقعتاً دل میں ایسا ہی ہے تو اللہ تعالیٰ ویسا ہی کریں گے، کوئی دوسری بات نہیں ہوسکتی، اللہ تعالیٰ گمان کے مطابق ہی معاملہ کریں گے۔

جیسے دودھ پیتا بچہ

جیسے میں مثال دیا کرتا ہوں کہ گھر میں بچے ہوتے ہیں، ان میں بڑی اولاد بھی ہوتی ہے اور ایک دم چھوٹا سا آٹھ، دس، پندرہ دن کا بچہ بھی ہوتا ہے جو ابھی چلنا پھرنا بھی نہیں سیکھا ہے۔ اس کے متعلق سب لوگ جانتے ہیں کہ اس کا سارا معاملہ ماں باپ ہی کے حوالے ہے، نہ اس کا کوئی اختیار ہے کہ میں اپنے کھانے پینے کا، سونے کا، اپنی حفاظت کا اور اپنے دوسرے امور کا انتظام کروں، ماں باپ ہی اس کی ان چیزوں کو سمجھتے ہیں، وہی اس کی ساری چیزوں کی خیر خبر رکھتے ہیں، وقت آنے پر وہی اس کے لئے سارا انتظام کرتے ہیں۔ جب دودھ پلانے کا وقت آئے گا تو وہ نہیں کہے گا کہ مجھے دودھ پلاؤ بلکہ خود ماں ہی اس کو دودھ پلائے گی۔ یہ بچہ اپنا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور اپنا سارا معاملہ ماں باپ کے حوالہ کردیتا ہے۔ نہلانا، سنوارنا، کپڑے پہنانا وغیرہ سب کام ماں باپ ہی کریں گے۔ پھر جوں جوں بڑا ہوتا جائے گا اور اپنے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیتا جائے گا، توں توں ماں باپ کے سلوک میں کمی آتی جائے گی۔ اور بڑے ہونے کے بعد وہ ماں باپ سے جو جو امید رکھتا ہے وہ اس کو پورا کرتے ہیں، باقی سب کام اسی

کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہ ایک مثال ہے۔ اسی طریقہ سے بندہ کا معاملہ اپنے تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے۔

ہم بہت سے امور میں اپنے متعلق یوں سمجھتے ہیں کہ بھائی! ہم یہ کام انجام دیتے ہیں۔ اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ بیوی بچوں کے متعلق آدمی فکر کرتا ہے کہ میرے بچوں کو کون کھلائے گا، اس لئے مَیں کماؤں اور محنت کروں، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ ٹھیک ہے؛ کرلو۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اپنے بچوں کو محنت کر کے کما کر کھلاتا ہوں؛ تو کرلو، اللہ تعالیٰ اسی کے مطابق آپ کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔ یہ سیدھی سادی بات ہے۔ حدیثِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ فرمایا ہے وہ بالکل سو فیصد بلکہ ایک سو ایک فیصد اپنی جگہ پر صحیح ہے، لیکن دل کا معاملہ اللہ تعالیٰ بخوبی جانتا ہے اور اسی کے مطابق معاملہ کرتا ہے۔ اب یہ ہے کہ آزمانے کے لئے تھوڑی بہت آزمائش بھی بھیجتے ہیں کہ دیکھیں! وہ اپنی اُمید پر کتنا باقی رہتا ہے۔

زندگی اسی دھوکہ میں گزرتی ہے

بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ فلاں بزرگ سے دُعا کرائیں گے تو یوں ہو جائے گا، فلاں مزار پر جائیں گے اور چڑھاوا چڑھائیں گے تو ہمارا فلاں کام ہو جائے گا؛ تو اللہ تعالیٰ ویسا ہی معاملہ کرتے ہیں، آدمی جیسا سوچتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیا جاتا ہے۔

بلکہ اکابر تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ بت پرستی کرنے والے اپنے بتوں سے جیسی توقع رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا کام ان سے بنتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کرتے ہیں، اور اسی دھوکہ میں وہ زندگی بھر رہتے ہیں۔ یہ ایک خاص چیز

ہے۔اس کو اگر آدمی سوچ لے اور اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لے، تو اس کے بہت سارے معاملات آسان ہو سکتے ہیں، اور کوئی دشواری نہیں ہوگی۔

جب بھی وہ مجھے یاد کرے

"وَأَنَا مَعَهُ حَيْثُ يَذْكُرُنِي" اور میں بندے کے ساتھ ہوتا ہوں، جب بھی وہ مجھے یاد کرے۔ بندہ اللہ تعالیٰ کو جس جگہ یاد کرے گا وہاں اللہ تعالیٰ اس کے پاس ہے۔ کسی کونے میں یاد کرے گا تو، کہیں ہوائی جہاز میں بیٹھ کر یاد کرے گا تو، سمندر کے اندر آبدوز (Submarine) میں بیٹھ کر پانی کے نیچے یاد کرے گا تو؛ غرضیکہ جہاں بھی یاد کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہے۔

اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں

اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اس سے بھی بہت زیادہ خوش ہوتا ہے جو اپنے گمشدہ جانور کو جنگل وصحرا اور رَن کے اندر پالے۔ یہ بات پہلے بھی تفصیل سے آچکی ہے۔ ایک آدمی سفر میں ہے، سواری کے اوپر اس کا توشہ، پانی ہے، وہ صحرا میں ایک جگہ کچھ آرام کرنے کے لئے اُترا اور اس نے اپنے اونٹ کو وہیں درخت کے ساتھ باندھ دیا اور سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ سواری کا جانور وہاں نہیں ہے۔ کھانے پینے کا سامان بھی اسی کے اوپر تھا، اس کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اب اس لق ودق صحرا میں آگے سفر جاری رکھنے کے لئے بھی اس کے پاس کوئی ذریعہ موجود نہیں۔ اس نے اپنے جانور کو خوب تلاش کیا، اس کے باوجود کامیابی نہیں ملی، اب اس کو یقین ہو گیا کہ میں زندہ رہنے والا نہیں ہوں۔ اس لئے کہ سواری کے لئے جانور بھی نہیں کہ منزل پر پہنچوں، اور کھانے پینے کا سامان بھی نہیں کہ کھا پی کر زندہ رہ سکوں۔ لہٰذا دوبارہ اپنی جگہ

پرآ کر یہ سوچ کر لیٹ گیا کہ اب تو مجھے موت ہی آ کر اس مصیبت سے نجات دے گی۔ اسی میں اس کی آنکھ لگ گئی، پھر جب سو کر اُٹھا تو دیکھا کہ سواری کا جانور وہیں موجود ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔

حدیثِ پاک میں اس کی خوشی سے بے قابو ہونے کو ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ خوشی میں آ کر شکرانہ کے طور پر اللہ تعالیٰ سے یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! تو میرا بندہ اور مَیں تیرا خدا۔ یعنی کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ تو میرا خدا وآقا، اور میں تیرا بندہ۔ لیکن خوشی میں بے قابو ہو کر اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی، وہ تو سمجھ چکا تھا کہ میری موت آنے والی ہے، اور یہ تو نئی زندگی ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کو بندوں سے کتنا تعلق ہے!

تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں وہ انسان اپنے اس گمشدہ جانور کے ملنے پر کتنا خوش ہوتا ہے! تو جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرتا ہے، اپنے گناہوں پر پچھتاتا ہے، اور یہ عہد و پیمان اور پختہ ارادہ کرتا ہے کہ اب دوبارہ میں اللہ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ تو گویا یہ بندہ جو اللہ سے بچھڑ چکا تھا، دور ہو چکا تھا، توبہ کر کے دوبارہ اللہ کے قریب ہوا اور اللہ کا بنا؛ تو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے اس بندے کی توبہ سے اس سے زیادہ خوش ہوتے ہیں جیسے وہ آدمی اپنی گمشدہ سواری کا جانور ملنے پر خوش ہوا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کے ساتھ کتنا زیادہ تعلق ہے۔

ہماری اولاد نافرمانی کرنے کے بعد جب دوبارہ معافی مانگنے آتی ہے، تو ہم اس کو اتنی جلدی معاف نہیں کرتے، اس کو کچھ نہ کچھ لتاڑتے ہیں، تھوڑی بہت معمولی سزا، یا کچھ بے رُخی کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن وہاں تو یہ سوال ہی نہیں، جیسے ہی بندے

نے توبہ کی، باری تعالیٰ کی طرف سے فوراً عنایتوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندوں کے ساتھ عجیب معاملہ ہے، یہ تو ہماری کوتاہی کی بات ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنی مہربانیاں، اتنا لطف وکرم ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اللہ سے دور رکھے ہوئے ہیں، یہی ہمارے لئے محرومی کی بات ہے، ورنہ وہاں تو کوئی رکاوٹ ہے ہی نہیں، اس کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے۔ اور پھر آپ اس دروازے پر جائیں گے تو وہاں کوئی ناراضی کا اظہار نہیں کیا جائے گا۔ آپ کو آپ کی سابقہ گناہوں پر لتاڑا نہیں جائے گا، شرم نہیں دلائی جائے گی، بلکہ وہاں تو خوشی کا اظہار کیا جائے گا۔

ایسے دروازے پر ہم کیوں نہ جائیں؟

اور پھر کوئی آدمی اللہ کی طرف بڑھنے اور تعلق قائم کرنے کے لئے کوشش کرتا ہے، اس کو اتنے عمدہ الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جو آدمی میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے، میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں۔ گویا بندے کی طرف سے اگر ذراسی حرکت ہوگئی تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو کھینچ لیا جاتا ہے۔

اور کوئی بندہ میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف چار ہاتھ بڑھتا ہوں۔ دونوں ہاتھوں کو دائیں بائیں پھیلا دو تو وہ ''باع'' کہلاتا ہے، جو چار ہاتھ کا ہوتا ہے۔ ایک ہاتھ کے دو بالشت ہوتے ہیں۔ آپ اپنی کہنی سے ہاتھ کی بڑی انگلی تک ناپ لیجئے، دو بالشت ہوں گے۔ اس طرح ایک باع کے آٹھ بالشت ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جوں جوں اس کی طرف سے حرکت میں تیزی آتی ہے، توں توں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی زیادہ بڑھ کر نوازا جاتا ہے۔

دیکھو! پہلے ایک بالشت کے جواب میں ایک ہاتھ یعنی ڈبل تھا۔ اور یہاں ایک ہاتھ کے جواب میں ایک باع یعنی چار ہاتھ کا تذکرہ ہے۔ گویا پہلے کے بعد آپ آگے بڑھے تو وہاں اور زیادہ خوشی ہوئی۔ اور جو میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ مجھ سے قریب ہونے کے لئے جو طریقہ اختیار کرتا ہے، میں اس کے طریقہ کی کئی گنا زیادہ پذیرائی کرتا ہوں۔

گویا بتلایا جارہا ہے کہ آپ جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں گے، اور آگے بڑھیں گے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس سے کئی گنا زیادہ آپ کی پذیرائی ہوگی اور آپ کو قبول کیا جائے گا۔ اس لیے بھائی! اب ایسے دروازے پر ہم کیوں نہ جائیں؟ دنیا کے دروازے تو ایسے ہیں کہ کوئی بھی ہو، ایک مرتبہ، دومرتبہ، تین مرتبہ جائیں گے تو ہمیں وہاں سے دھتکار دیا جائے گا کہ کیا بار بار ہمارے پاس آتا ہے؟ کچھ کام ہے یا نہیں؟ آپ کا کسی سے کیسا ہی تعلق ومحبت والا معاملہ کیوں نہ ہو، آپ اس کے یہاں ایک مرتبہ، دومرتبہ گئے، تو وہاں سے پھر معاملہ بے رُخی، نفرت اور تحقیر کا ہوتا ہے، اور یہاں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی پذیرائی ہوتی ہے۔

یہ حدیثِ قدسی ہے۔ اگر اسی ایک حدیث کو ہم بار بار سوچتے رہیں تو اسی میں ہماری زندگی کی ساری مشکلات کا حل موجود ہے۔ ایک تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ گمان رکھنے کے سلسلہ میں، اور پھر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے معاملہ میں مکمل رہنمائی موجود ہے۔

کسی کو موت نہ آئے مگر......

۴۴۱۔ وعن جابر بن عبد الله رضی اللہ عنہ: أَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَبْلَ مَوْتِهِ بِثَلَاثَةِ أَيَّامٍ، يَقُوْلُ: لَا يَمُوْتَنَّ أَحَدُكُمْ إِلَّا وَهُوَ يُحْسِنُ الظَّنَّ بِاللهِ۔

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے تین دن پہلے آپ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے میں نے سنا کہ تم میں سے کسی کو موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اچھا گمان رکھتا ہو۔

افادات:- حدیثِ پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ أَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهُ (بخاری شریف، ۶۱۴۲)'' جو آدمی اللہ تعالیٰ سے ملنے کو پسند کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو محبوب رکھتے ہیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم تو موت کو ناپسند کرتے ہیں۔ یعنی اگر چہ موت اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لئے واسطہ ہے کہ موت کے بعد ہی اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا مرحلہ آتا ہے، لیکن قدرتی طور پر آدمی کے دل میں موت سے ایک طرح کی دوری اور وحشت کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ تو یہ تو بڑا مشکل ہو جائے گا کہ ہر آدمی موت کو ناپسند کرتا ہے۔ تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بات نہیں ہے، جب مؤمن کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں آخرت کی طرف رُجحان کو بڑھا دیتے ہیں۔ اس لئے بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ موت کے قریب ان پر ایسے حالات ڈال دیئے جاتے ہیں کہ وہ لوگوں کی طرف سے مایوس ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ یہ سب قدرت کا ایک نظام ہے یہاں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھا گمان رکھتا ہو۔ اور حدیث کی خبر ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مؤمن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہی معاملہ کیا جاتا ہے کہ جب اس کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے اچھا گمان پیدا ہو ہی جاتا ہے۔

شیطانی حربہ کا توڑ

۴۴۲ - وعن أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَقُوْلُ: قَالَ اللهُ تَعَالىٰ: يَا ابْنَ آدَمَ! إِنَّكَ مَادَعَوْتَنِيْ وَرَجَوْتَنِيْ غَفَرْتُ لَكَ عَلىٰ مَاكَانَ مِنْكَ وَلَاأُبَالِيْ. يَا ابْنَ آدَمَ! لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوْبُكَ عَنَانَ السماءِ، ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِيْ، غَفَرْتُ لَكَ وَلَاأُبَالِيْ. يَا ابْنَ آدَمَ! إِنَّكَ لَوْ أَتَيْتَنِيْ بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا، ثُمَّ لَقِيْتَنِيْ لَاتُشْرِكُ بِيْ شَيْئًا، لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ باری تعالیٰ نے فرمایا اے انسان! جب تک تو مجھے پکارتا رہے گا، مجھ سے امید رکھے گا؛ تو میں تجھے معاف کردوں گا، چاہے کتنے ہی گناہ کیوں نہ کئے ہوں اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے اے انسان! اگر تیرے گناہ آسمان تک پہنچ جائیں اور پھر تو مجھ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگے، تو میں تیرے گناہ کو معاف کردوں گا اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اے انسان! اگر تو زمین بھر کر گناہ کرے اور پھر میرے یہاں اس حالت میں آئے کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو، تو میں زمین بھر مغفرت لے کر تیرے پاس آؤں گا۔

افادات:- یعنی بندہ یوں سوچتا ہے کہ میرے اتنے بڑے بڑے گناہ ہیں، میں نے اتنی ساری نافرمانیاں کی ہیں؛ بھلا میری کیسے مغفرت ہوسکتی ہے؟ یہ دراصل شیطانی حربہ ہے۔ شیطان بندے کو اللہ تعالیٰ سے دور کرنے اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے بدگمان کرنے کے لئے ایسی بات دل میں ڈالتا ہے کہ اتنے بڑے بڑے گناہ میں نے کئے ہیں، اب میری کیسے مغفرت ہوسکتی ہے؟

دریائے رحمت کا کیا عالم ہوگا!

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفیؒ جو حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے

اجل خلفاء میں سے گزرے ہیں۔ کراچی میں رہتے تھے۔ انہوں نے بڑی عجیب و غریب مثال دی ہے۔ جیسے کراچی ساحل سمندر پر واقع ہے اسی طرح بمبئی بھی ساحل سمندر پر ہے، اس لئے ہم بمبئی کی مثال لیتے ہیں۔ بمبئی اتنا بڑا شہر ہے کہ جس میں لاکھوں آدمی آباد ہیں، ان لاکھوں آدمیوں کا پیشاب پاخانہ اور ساری نجاستیں گٹر کے ذریعہ سمندر کے اندر پہنچتی ہیں؛ تو لاکھوں انسانوں کی ساری نجاستوں کی وجہ سے کیا وہ سمندر ناپاک ہو گیا؟ نہیں، بلکہ سمندر کی ایک موج آئے گی تو ان لاکھوں انسانوں کی ساری نجاستوں کو ختم کر دے گی۔ دنیا کا ایک سمندر تو دوسرے سمندروں کا معمولی سا حصہ ہوتا ہے، اس سمندر کی ایک معمولی سی موج لاکھوں انسانوں کے پیشاب پاخانہ کی نجاست کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے، اور لاکھوں انسانوں کا پیشاب پاخانہ سمندر کی ایک موج پر بھی غالب نہیں آسکتا، تو پھر باری تعالیٰ کے دریائے رحمت کا کیا عالم ہوگا!

مایوسی دور کرنے کا طریقہ

آدمی کو یہ سوچنا ہی نہیں چاہیے کہ میرے اتنے بڑے بڑے گناہ ہیں، میرا کیا ہوگا، یہ مایوسی والی بات ہوتی ہے، شیطان اس طرح انسان کے دل میں مایوسی پیدا کر کے اس کو اللہ تعالیٰ سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے موقعہ پر نبی کریم ﷺ کے ان ارشادات کو آدمی پڑھے اور سوچے تو اس سے دل کی مایوسی دور ہوتی ہے۔ اور اللہ والے جو نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو پیش کرتے ہیں ان سے ملیں، تو ان کی زبان سے ایسی چیزیں سننے کو ملیں گی۔ یہ مایوسی جو پیدا ہوتی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ان ارشادات سے اور اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت ہوتی ہے۔ اگر واقفیت ہوتی ہے تو پھر ایسی نوبت نہیں آتی۔

گویا یہ بڑی امید والی بات ہے۔ اصل تو یہاں باب کا جو عنوان تھا اس سے تعلق رکھنے والی بات شروع کا وہ جملہ ہے: ’’إِنَّكَ مَادَعَوْتَنِيْ وَرَجَوْتَنِيْ‘‘ آدمی جتنا اللہ تعالیٰ کو پکارتا رہے گا اور اللہ تعالیٰ سے جیسی امید رکھے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مغفرت کی جائے گی اور گناہ معاف ہوں گے۔

اَلْجَمْعُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَآءِ

خوف اور امید کو جمع کرنا

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَ نَسۡتَعِيۡنُهٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنۡ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَا شَرِيۡكَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسۡلِيۡمًا كَثِيۡرًا كَثِيۡرًا. أما بعد:-

اعلم أَنَّ الۡمُخۡتَارَ لِلۡعَبۡدِ فِيۡ حَالِ صِحَّتِهٖ أَنۡ يَكُوۡنَ خَائِفًا رَاجِيًا، وِيَكُوۡنَ خَوۡفُهُ وَرَجَاؤُهُ سَوَاءً. وَفِيۡ حَالِ الۡمَرَضِ يُمَحَّضُ الرَّجَاءُ. وَقَوَاعِدُ الشَّرۡعِ مِنۡ نُصُوۡصِ الۡكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَغَيۡرِ ذٰلِكَ مُتَظَاهِرَةٌ عَلٰى ذٰلِكَ.

قَالَ اللّٰه تعالىٰ: (فَلَا يَأۡمَنُ مَكۡرَ اللّٰهِ إِلَّا الۡقَوۡمُ الۡخَاسِرُوۡنَ) [الاعراف:۹۹]

وقَالَ تَعَالىٰ: (إِنَّهُ لَا يَيۡأَسُ مِنۡ رَوۡحِ اللّٰهِ إِلَّا الۡقَوۡمُ الۡكَافِرُوۡنَ) [يوسف:۸۷]

وقَالَ تعالى: (يَوۡمَ تَبۡيَضُّ وُجُوۡهٌ وَتَسۡوَدُّ وُجُوۡهٌ) [آل عمران:۱۰۶]

وقَالَ تعالى: (إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيۡعُ الۡعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُوۡرٌ الرَّحِيۡمُ) [الاعراف:۱۶۶]

وقَالَ تعالىٰ: (إِنَّ الۡأَبۡرَارَ لَفِيۡ نَعِيۡمٍ وَإِنَّ الۡفُجَّارَ لَفِيۡ جَحِيۡمٍ) [الانفطار:۱۳،۱۴]

وقَالَ تعالىٰ: فَأَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهُ فَهُوَ فِيۡ عِيۡشَةٍ رَاضِيَةٍ وَأَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهُ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ) [القارعة ۶-۹]

والآيات فِيۡ هٰذَا الۡمَعۡنٰى كَثِيۡرَةٌ، فَيَجۡتَمِعُ الۡخَوۡفُ وَ الرَّجَاءُ فِيۡ آيَتَيۡنِ مُقۡتَرِنَتَيۡنِ أَوۡ آيات أَوۡ آيَة.

دو بازو

علامہ نوویؒ اس باب میں بتلانا چاہتے ہیں کہ خوف اور رجاء؛ یہ دونوں حالتیں

اور کیفیتیں بیک وقت بندے کے دل میں ہونی چاہئیں، حضراتِ صوفیہ فرماتے ہیں کہ یہ دو بازو ہیں جن کے ذریعہ سے بندہ دین میں پرواز اور ترقی کرتا ہے۔ آدمی اپنے گناہوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا بھی رہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار بھی رہے۔ اور یہ دونوں کیفیتیں ہونی چاہئیں، اسی بات کو بتلانے کے لیے انہوں نے یہ عنوان قائم کیا ہے۔

تین زمانے؛ تین حالتیں

ایک چیز رجاء اور امید ہے، اور دوسری چیز خوف ہے۔ آدمی کو جو پسندیدہ اور ناپسندیدہ، محبوب اور مکروہ احوال پیش آتے ہیں، وہ زمانہ کے اعتبار سے اپنے وجود کی وجہ سے تین حالتوں پر منقسم ہیں۔ (۱) یا تو وہ فی الحال موجود ہیں (۲) یا زمانۂ ماضی میں وہ حالت اور کیفیت رہی تھی (۳) یا وہ حالت اور کیفیت ایسی ہے جس کا زمانۂ مستقبل کے اندر پیش آنے کا انتظار اور توقع ہے۔ اب اگر وہ کیفیت زمانۂ ماضی میں رہی تھی، اور آدمی کا دل اُس گزری ہوئی حالت اور کیفیت کا تصور کر رہا ہے؛ تو اسی کو تذکر اور یاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ پچھلے زمانے کی یادیں ہیں، چاہے وہ اچھی ہوں یا بری، وہ حالات جو گزر چکے ہیں، ان کے متعلق جب خیال آتا ہے، اور دل ان میں مشغول ہوتا ہے؛ اسی کو تذکر اور گزشتہ کی یادوں سے تعبیر کرتے ہیں۔

اور اگر وہ حالت اور کیفیت ایسی ہے جو اِسی وقت پائی جارہی ہے؛ تو اسی کو وجدان، ادراک وشعور سے تعبیر کرتے ہیں۔ جن حالات سے بندہ گزر رہا ہے اس کا دل اس کو محسوس کر رہا ہے، اور اِسی وقت یہ حالت پائی جارہی ہے؛ اس لیے اس کو وجدان اور ادراک کہتے ہیں۔

اور اگر وہ حالت ایسی ہے جس کی مستقبل میں پیش آنے کی توقع اور امید ہے، مستقبل میں پائے جانے کا انتظار ہے، تو اب اگر وہ حالت ناپسندیدہ ہے جس کے انتظار کی وجہ سے دل تکلیف کی کیفیت محسوس کر رہا ہے؛ تو اسی کو خوف سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اگر وہ حالت اور کیفیت -جو مستقبل سے تعلق رکھتی ہے- ایسی ہے جس کے تصور سے، اور جس کو سوچ کر دل مسرت اور راحت کی کیفیت محسوس کر رہا ہے؛ تو اسی کو رجاء اور امید سے تعبیر کرتے ہیں۔ گویا زمانۂ مستقبل میں پیش آنے والی مرغوب و پسندیدہ حالت کے خیال وتصور سے دل میں ایک طرح کی راحت اور لذت کی کیفیت محسوس ہوتی ہے؛ اسی کو رجاء سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

امید اور دھوکہ - فرق اور مثالیں

البتہ حالات اسباب کے تابع ہوتے ہیں اور اسباب کے نتیجہ میں ہی وجود میں آتے ہیں، تو اس حالت کے وجود میں آنے کے لیے اسباب کے درجے میں جو چیزیں مطلوب ہیں، اگر آدمی نے ان اسباب کو انجام دیا ہے، اور پھر مستقبل میں پسندیدہ اور مرغوب حالت کا اس کو انتظار اور توقع ہے؛ تو یہ حقیقی رجاء ہوئی۔ اور اگر اس کو پسندیدہ حالت کے پائے جانے کا انتظار تو ہے لیکن اس کے وجود میں لانے کے لیے قدرت کی طرف سے خارجی اعتبار سے جو اسباب مقرر کئے گئے ہیں، ان اسباب کو انجام نہیں دیا ہے، اور پھر مستقبل میں پسندیدہ اور مرغوب حالت کا اس کو انتظار اور توقع ہے؛ تو اس کو بجائے رجا و امید کے غرور اور دھوکے سے تعبیر کرتے ہیں۔

جیسے آدمی کے پاس زمین ہے، اس میں اس نے ہل چلایا، بیج ڈالا، پانی پلایا، اور کھیتی کو نقصان سے بچانے والی چیزوں سے حفاظت کا انتظام کیا، اور ایک انسان کو زمین

سے فائدہ اٹھانے کے لیے جو جو اسباب وجود میں لانے چاہئیں وہ سب کر ڈالے، پھر قدرت پر چھوڑا، اس کے بعد وہ آدمی اس بات کی تمنا اور خیال کرے کہ مجھے اس زمین سے پیداوار حاصل ہوگی؛ تو اس کو رجاء اور امید کہیں گے اور اگر اس نے نہ ہل چلایا، نہ بیج ڈالا، نہ پانی پلایا اور نہ کچھ کیا۔ اور جب موسم وسیزن آرہا ہے اور لوگ اپنے کھیتوں اور زمینوں سے پیداوار کی امید لگائے بیٹھے ہیں، تو یہ بھی امید لگاتا ہے تو اس کو دھوکے سے تعبیر کریں گے۔

امتحان کا زمانہ ہے، ایک طالب علم نے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے مطالعہ، سبق کی حاضری، اس کے بعد کی محنت؛ اول سے اخیر تک سارے اسباب پوری توجہ سے انجام دیئے، اور پھر امتحان دیا، اور اب یہ امید رکھتا ہے کہ میں کامیابی حاصل کروں گا؛ تو اس کو رجاء کہیں گے۔ لیکن کسی طالب علم نے کیا کچھ نہیں ہے اور کامیابی کی امید لگاتا ہے؛ تو اس کو غرور اور دھوکہ کہیں گے۔

اور اگر اس چیز کے پائے جانے کے اسباب نہ معلوم ہیں اور نہ معدوم ہیں، تو اس کو تمنا سے تعبیر کرتے ہیں۔

بہر حال! خوف اور رجاء اسی وقت کہا جائے گا جبکہ دونوں پہلو اس انداز پر ہوں کہ دونوں کے پائے جانے کی توقع وامید ہو۔ اور جو چیز آئندہ پیش آنے والی ہے وہ یقینی ہے؛ تو اس کو رجاء اور خوف سے تعبیر نہیں کریں گے۔ جیسے صبح میں سورج طلوع ہونے والا ہے، تو اب یہ نہیں کہیں گے کہ مجھے صبح سورج کے طلوع ہونے کی امید ہے۔ شام کو سورج غروب ہونے والا ہے تو یوں نہیں کہیں گے کہ مجھے شام کو سورج کے غروب ہونے کا اندیشہ ہے۔ ہاں! بارش ایسی چیز ہے کہ ہوسکتا ہے کہ برسے اور ہوسکتا ہے کہ نہ برسے، تو اس کے متعلق حالات کو دیکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ بارش کے ہونے کی امید ہے،

یا نہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ بتلانا یہ چاہتا ہوں کہ جہاں دونوں پہلو پائے جاتے ہیں، وہاں خوف ورجاء کہا جاسکتا ہے۔

تو رجاء کا خلاصہ یہ ہوا کہ کسی پسندیدہ اور مرغوب حالات یا امر کے مستقبل میں پائے جانے کا انتظار اور توقع ہو، اس کے لیے اسباب کو انجام دینے کا نام رجاء ہے۔ اب اگر کوئی آدمی ایمان بھی لایا، اعمالِ صالحہ کا اہتمام بھی کررہا ہے، گناہوں سے بھی بچ رہا ہے، اور پھر اللہ تعالیٰ سے یہ امید رکھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کریں گے اور جنت عطا کریں گے؛ تو اس کو رجاء کہہ سکتے ہیں۔ اور اگر یہ سب نہیں کررہا ہے، تو پھر اس کو غرور اور دھوکے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور خوف کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو اپنے گناہوں اور نافرمانیوں کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس پر پکڑیں گے۔

خوف اور امید یکساں ضروری

تو یہ دونوں کیفیتیں ضروری ہیں: أَلْإِيمَانُ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ. ان دونوں کے بیچ بیچ کی کیفیت کا نام ایمان ہے۔ اس لیے اگر کوئی آدمی صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت پر نگاہ کرتے ہوئے بالکل نڈر ہوجائے تو وہ مؤمن نہیں، یا اس پر خوف اتنا غالب آگیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہوگیا تو یہ بھی ایمان نہیں۔ ایمان ان دونوں کے بیچ کی کیفیت ہے۔ دونوں چیزیں ہونا ضروری ہے، اور یہ دونوں کیفیتیں یکساں پائی جانی چاہئیں۔

اور بعض حضرات نے اس میں تفصیل بیان کی ہے کہ آدمی کا جیسا مزاج ہو، اس کے مطابق حکم لگائیں گے۔ جیسے روٹی بھی ہے اور پانی بھی ہے، اب ان دونوں میں سے کیا چیز ضروری ہے؟ تو اگر کسی آدمی پر بھوک غالب ہے، پیاس نہیں لگی ہے تو اس کے لیے کہیں گے کہ روٹی کی ضرورت ہے، پانی کی نہیں۔ اور دوسرا آدمی ہے جس کو

بھوک نہیں لگی ہے لیکن پیاس غالب ہے، تو کہیں گے کہ اس کے لیے پانی کی ضرورت ہے۔ اور اگر کسی آدمی کے لیے دونوں باتیں یکساں ہیں کہ بھوک بھی لگی ہے اور پیاس بھی لگی ہے، تو کہیں گے کہ اس کو دونوں کی ضرورت ہے۔ بہر حال! سامنے والے کا جیسا جیسا حال ہوگا اس کے مطابق فیصلہ کریں گے۔

یہاں علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: آدمی کی تندرستی کے زمانہ میں دونوں باتیں پائی جانی چاہئیں، اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار بھی ہو، اور اپنے گناہوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب و پکڑ سے ڈرتا بھی ہو، گویا خوف اور امید کی کیفیت برابر برابر ہو۔ البتہ زندگی کے جو آخری ایام ہوتے ہیں، بیماری اور مرض الموت میں امید کو غالب کرنا چاہیے۔ ویسے اگر اس وقت بھی دونوں کیفیتیں پائی جاتی ہوں تو اس کے لیے کارآمد ہے، جیسا کہ روایتوں میں ہے کہ ایک آدمی بیمار تھا، مرض الوفات میں تھا نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے پاس تشریف لے گئے اور پوچھا کہ کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا: اپنے گناہوں کی وجہ سے ڈر رہا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار ہوں۔ تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس حالت میں آدمی اللہ تعالیٰ سے جس چیز کی امید رکھتا ہے اللہ تعالیٰ وہ چیز عطا فرما دیتے ہیں، اور جس سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی اس چیز سے حفاظت فرماتے ہیں۔ (سنن ترمذی، ۹۸۳۔ ابن ماجہ، کتاب الزہد، ۴۲۶۱)

"وَقَوَاعِدُ الشَّرْعِ مِنْ نُصُوْصِ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ مُتَظَاهِرَةٌ عَلٰى ذٰلِكَ"

شریعت کے قواعد اور قرآن و حدیث کے نصوص اس سلسلہ میں بہت زیادہ ہیں، چناں چہ قرآنِ پاک میں عام طور پر دونوں چیزوں کو ساتھ ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، یا کہیں دونوں طرح کی آیتیں یکے بعد دیگرے لاتے ہیں، اور کہیں ایک ہی آیت میں دونوں کو ذکر کرتے ہیں۔

چناں چہ باری تعالیٰ کا ارشاد لائے: ﴿فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُوْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے جو بے خوف ہو جائیں وہ وہی لوگ ہیں جو گھاٹے اور خسارے والے ہیں۔ یہ ایمان کے منافی حالت ہے۔

اور دوسری آیت لائے: ﴿إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ﴾ اللہ کی رحمت سے وہی لوگ مایوس ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔

دیکھو! پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بے خوف ہونے والوں کا تذکرہ تھا اور دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونے والوں کا تذکرہ ہے۔ گویا دونوں چیزیں ہونی چاہئیں۔

﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ﴾ یہاں ایک ہی آیت میں دونوں حالتیں بیان کی گئی ہیں، جو کامیاب ہیں ان کے چہرے اللہ تعالیٰ کے یہاں سفید اور روشن ہوں گے۔ اور جو ناکام ہیں ان کے چہرے اللہ تعالیٰ کے یہاں سیاہ ہوں گے۔ ان دونوں حالتوں کا استحضار رہنا چاہیے۔

﴿إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ اس ایک ہی آیت میں اللہ تعالیٰ کی دونوں صفتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ تیرا رب بہت تیزی کے ساتھ سزا دینے والا ہے، اور وہ گناہوں کو معاف کرنے والا، مہربان بھی ہے۔

﴿فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهُ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَاضِيَةٍ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ﴾ جس کے اعمال کے ترازو نیکیوں کی وجہ سے وزنی ہو جائیں گے، وہ پسندیدہ زندگی میں جنت میں رہیں گے، اور جس کے نیکیوں کے ترازو ہلکے رہیں گے، اس کا ٹھکانہ ہاویہ ہے۔ ہاویہ سے جہنم مراد ہے۔

اب اس سلسلہ میں تین روایتیں پیش کرتے ہیں۔

امید وخوف؛ معتدل تعلیم

۴۴۳-وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ: أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: لَوْ يَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ مَا عِنْدَ اللهِ مِنَ الْعُقُوْبَةِ، مَا طَمِعَ بِجَنَّتِهِ أَحَدٌ. وَلَوْ يَعْلَمُ الْكَافِرُ مَا عِنْدَ اللهِ مِنَ الرَّحْمَةِ مَا قَنَطَ مِنْ جَنَّتِهِ أَحَدٌ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے یہاں سزا کیسی سخت ہے؛ اگر ایمان والے کو اس کا پتہ چل جائے تو اس کی جنت کی کسی کو امید نہ رہے (یعنی جنت سے سب مایوس ہو جائیں) اور اللہ تعالیٰ کے یہاں رحمت کتنی زیادہ ہے؛ اس کا اگر کافر کو پتہ چل جائے تو وہ بھی جنت سے مایوس نہ رہے (یعنی اس کو بھی جنت کی امید ہو جائے کہ میں بھی جنت میں چلا جاؤں گا۔)

افادات:- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقولہ مشہور ہے: اگر یہ اعلان ہو جائے کہ سب لوگ جہنم میں جائیں گے سوائے ایک کے؛ تو مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ ایک میں ہی ہوؤں گا۔ اور یہ اعلان ہو جائے کہ سب لوگ جنت میں جائیں گے سوائے ایک کے؛ تو مجھے ڈر ہے وہ محروم میں ہی نہ ہوؤں۔ اعتدال کا تقاضہ یہی ہے۔ ویسے خوف کے مقابلہ میں امید والی روایتیں زیادہ آئی ہیں۔

اُمتِ محمدیہ کی سزا

روایتوں میں ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری امت کی عذاب وسزا زلزلے اور فتنے ہیں (المعجم الکبیر للطبرانی، ۱۵۹۶) دنیا کے اندر یہ جو خطرناک حالات پیش آتے ہیں زلزلے آتے ہیں، آدمی پریشانیوں، مصیبتوں اور فتنوں سے گزرتا ہے، وہی اس کے لیے اعمالِ بد کی سزا ہو جاتی ہے، پھر آخرت میں اللہ تعالیٰ اس کو سزا نہیں دیں گے۔

بڑوں کی باتیں

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جس کے گناہ کو چھپا یا تو اللہ تعالیٰ کے کرم ورحمت سے بعید ہے کہ آخرت میں اس کے گناہ کو نہ چھپائے۔ اور جس کو دنیا میں گناہ پر سزا دی ہے تو اللہ تعالیٰ کے عدل سے بعید ہے کہ اس کو دوبارہ سزا دے (سنن ترمذی، ۲۶۲۶) حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا حساب وکتاب میرے ماں باپ کے بجائے اللہ تعالیٰ لے؛ اس لیے کہ وہ میرے ماں باپ سے زیادہ میرے اوپر رحم کرنے والا ہے (احیاء العلوم ۴/۱۵۹) ایک بزرگ کا قول ہے کہ جب بندے گناہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے بھی چھپا لیتے ہیں، تا کہ فرشتوں کی نگاہ میں نہ آوے، ورنہ کل قیامت میں وہ گواہی دیں گے۔ اگر وہ دیکھ لیں تو ان کو گواہی دینی ہی ہے، اس لیے ان سے بھی اللہ تعالیٰ چھپاتے ہیں۔

سفید جسم میں ایک کالا بال

بخاری شریف میں روایت ہے: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمائیں گے کہ اپنی اولاد میں سے جہنم کا توشہ اور اس کی رسد نکالو۔ وہ پوچھیں گے کہ کتنی؟ تو ایک روایت میں ہے کہ سو میں سے ننانوے، اور دوسری روایت میں ہے کہ ہزار میں سے نوسوننانوے۔ یہ سن کر حضرات صحابہ کرام ؓ لرز گئے، اور ان کے اوپر مایوسی کی کیفیت طاری ہوگئی، سب کے سر جھک گئے، کوئی سر اُٹھانے کے لیے تیار نہیں، اور سب رونے لگے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا بات ہے؟ عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جب ہزار میں سے نوسوننانوے جہنم میں جائیں گے تو پھر کون بچے گا؟ تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دنیا میں کفار کے مقابلہ میں اہلِ ایمان کی

تعداد ایسی ہے جیسے سفید بیل کے جسم میں ایک کالا بال، یا کالے بیل کے جسم میں ایک سفید بال (بخاری شریف۔۶۵۲۹/ ۶۵۳۰) چناں چہ ہم دیکھیں گے کہ ہر زمانہ میں اہلِ ایمان کے مقابلہ میں اہلِ کفر کی تعداد زیادہ رہی ہے۔

اہلِ ایمان کا فدیہ

اسی لیے بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ قیامت کے روز اہلِ ایمان میں سے ہر ایک کو کوئی یہودی، کوئی نصرانی، کوئی مشرک حوالے کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اس کو پکڑو، اور اپنے فدیہ کے طور پر جہنم میں ڈالو کہ اے اللہ! میں اپنی جگہ پر اس کو جہنم میں دیتا ہوں۔ (احیاء العلوم۔ ۴/ ۱۵۵)

اُمید اُفزا روایتیں

بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم زمین بھر کر گناہ لے کر آ ؤ، میں تمہارے ساتھ زمین بھر کر مغفرت لے کر پیش آ ؤں گا۔ (احیاء العلوم۔ ۴/۱۵۶)

روایتوں میں آتا ہے کہ بندہ جب گناہ کرتا ہے، اور پھر اپنے گناہ سے مغفرت طلب کرتا ہے تو باری تعالیٰ فرشتوں سے کہتے ہیں کہ دیکھو! یہ میرا بندہ جانتا ہے کہ میرا کوئی رب ہے جو میرے گناہ کو معاف کرتا ہے اور میری گرفت کرسکتا ہے؛ تم گواہ رہو کہ میں نے اس کے گناہ کو معاف کر دیا۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اگر شرک سے پاک ہو کر آ ؤ گے، تو کچھ بھی کر کے آ ؤ، میں تمھیں جنت میں ہی بھیجوں گا، جہنم میں نہیں بھیجوں گا۔

پھر میں آپ کو رسوا نہیں کروں گا

ایک روایت میں ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے باری تعالیٰ نے فرمایا کہ کل قیامت

کو میں آپ کی اُمت کا حساب آپ کے حوالے کروں گا، تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: اے اللہ! آپ مجھ سے زیادہ اپنے بندوں پر مہربان ہیں، آپ ہی حساب لیں، میں نہیں لوں گا۔ تو اس پر باری تعالیٰ نے فرمایا کہ پھر میں آپ کو رسوا نہیں کروں گا۔ قرآنِ پاک میں بھی ہے: ﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَهُ﴾ اس آیت کی تفسیر میں ابن ابی الدنیا نے یہ روایت بیان کی ہے (تفسیر البحر المحیط، سورۂ تحریم)

سب سے زیادہ اُمید والی آیت

﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ کے بارے میں امام باقر ابو جعفرؒ فرماتے ہیں کہ تم لوگ یوں سمجھتے ہو کہ قرآنِ کریم میں سب سے زیادہ اُمید والی آیت ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا﴾ ہے، لیکن ہم اہلِ بیت کے نزدیک سب سے زیادہ اُمید والی آیت ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ ہے، اس لیے کہ جب تک پوری اُمت کو بخشا نہ جائے گا، وہاں تک اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راضی نہیں ہوں گے۔ (تفسیر روح المعانی، سورۃ الضحیٰ)

اسی لیے کہا گیا ہے کہ رحمت والی آیتیں اور روایتیں سزا والی آیتوں اور روایتوں کے مقابلہ میں زیادہ ہیں، اس طرح کی روایتیں اور آثار ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے قوی امید رکھنی چاہیے۔

اگر انسان سن لے......

۴۴۴ - وعن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وآله وسلم قَالَ: إِذَا وُضِعَتِ الْجَنَازَةُ واحْتَمَلَهَا النَّاسُ أَوِ الرِّجَالُ عَلٰى أَعْنَاقِهِمْ، فَإِنْ كَانَتْ صَالِحَةً، قَالَتْ: قَدِّمُوْنِيْ قَدِّمُوْنِيْ. وَإِنْ كَانَتْ غَيْرَ صَالِحَةٍ قَالَتْ: يَاوَيْلَهَا! أَيْنَ تَذْهَبُوْنَ بِهَا؟ يَسْمَعُ صَوْتَهَا كُلُّ شَيْءٍ إِلَّا الْإِنْسَانُ. وَلَوْ سَمِعَهُ صَعِقَ. (رواه البخاري)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشادفرمایا: جب جنازہ رکھا جاتا ہے (یعنی میت کو چارپائی پر رکھ کر قبرستان لے جانے کے لیے باہر لایا جاتا ہے) اور لوگ اس کو اپنی گردنوں اور کندھوں پر اُٹھاتے ہیں تو اگر مرنے والا نیک ہوتا ہے تو وہ ان لوگوں سے کہتا ہے ''قَدِّمُوْنِيْ قَدِّمُوْنِيْ'' مجھے جلدی سے لے چلو، مجھے جلدی سے لے چلو۔ اور اگر مرنے والا نیک نہیں ہوتا تو وہ کہتا ہے: ہائے افسوس! تم لوگ مجھے کہاں لے جارہے ہو؟ جب مردہ یہ بات بولتا ہے تو اس کی اس بات کو انسان کے علاوہ سب سنتے ہیں، اگر انسان سن لے تو وہ بے ہوش ہوجائے۔

اس روایت میں رجاء اور خوف دونوں کو بتلانا چاہتے ہیں۔

جوتے کے تسمے سے زیادہ قریب

۴۴۵ - وعن أبي مسعود رضی اللہ عنہ **قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: **اَلْجَنَّةُ أَقْرَبُ إِلٰى أَحَدِكُمْ مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ، وَالنَّارُ مِثْلُ ذٰلِكَ.** (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشادفرمایا: جنت آدمی کے جوتے کے تسمے زیادہ اس سے قریب ہے، اسی طریقہ سے جہنم بھی۔

افادات:- آدمی جو چپل پہنتا ہے تو اس کی پٹّی جسم سے بالکل لگی ہوئی ہوتی ہے، تو جنت اس سے بھی زیادہ قریب ہے، اس لیے کہ جنت آدمی کے اعمال کی وجہ سے ہے، اور اعمال تو اس کے اندر ہی موجود ہیں۔ اگر اچھے اعمال ہیں تو وہ جنت کا حقدار ہے اور برے اعمال ہیں تو جہنمی ہے۔ اس روایت میں بھی جنت اور جہنم دونوں کو ساتھ ساتھ بتایا گیا ہے، اس لیے اس روایت کو بھی اس باب میں پیش کیا ہے۔

فضل البکآءِ من خشیۃ اللہ تعالیٰ وشوقاً الیہ

اللہ تعالیٰ کی خشیت

اور

اس کی محبت میں رونے کی فضیلت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۴؍شوال المکرم ۱۴۲۰ھ ۲۲ جنوری ۲۰۰۰ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أما بعد:-

یہ اہل اللہ کی عادت رہی ہے

نیا عنوان قائم کیا ہے: اللہ تبارک وتعالیٰ کی خشیت وخوف اور اس کی محبت میں رونا۔ پہلے ابواب میں اللہ تعالیٰ کے خوف کا تذکرہ کیا تھا، اب اس کا ایک لازمی نتیجہ کہ جس دل میں اللہ تعالیٰ کی خوف وخشیت ہوتی ہے، اس سے کیا اثر مرتب ہوتا ہے، اور اس کی فضیلت بھی بتلانا چاہتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی خشیت اور خوف جس کے دل میں ہوگا وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت سے روئے گا، اس صفتِ خشیت کا ظہور رونے کی شکل میں ہوگا اور یہ بھی مطلوب ہے۔ اللہ کے خوف سے رونا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت اور اس کی رضا اور خوشنودی کا باعث ہے۔ جتنے بھی اللہ کے مقبول بندے گزرے ہیں، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام، حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اور ان کے بعد جتنے بھی اولیاء اللہ گزرے ہیں ان کی ایک خاص صفت اور عادت یہ بھی رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے روتے رہتے تھے۔ بعض حضرات وہ

تھے جن کا رونا لوگوں کے سامنے ظاہر ہوتا تھا۔ اور بعض ایسے تھے جو اس کو بھی چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔

اس کے بعد وہ نہیں ہنسے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے، اور مسند احمد میں یہ روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا: کیا بات ہے کہ میں نے میکائیل علیہ السلام کو کبھی بھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ جب سے اللہ تعالیٰ نے جہنم کو پیدا کیا ہے، تب سے وہ کبھی نہیں ہنسے۔

اور یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ فرشتوں کی ایک بڑی جماعت ایسی ہے جو کبھی نہیں ہنسی، صرف روتی ہی رہتی ہے، اس ڈر سے کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو کر ہمیں جہنم میں نہ ڈال دے۔ (احیاء العلوم۔ ۴/۱۹۱)

حضراتِ انبیاء کی کیفیتِ خشیت

مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب دامت برکاتہم نے اپنی تفسیر میں تذکرہ کیا ہے اور امام غزالیؒ نے بھی اس کو ذکر کیا ہے، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو اُن کے سینے میں سے ہانڈی میں سے جیسی آواز آتی ہے ایسی آواز آتی تھی اور وہ آواز ایک میل دور سے سنائی دیتی تھی (احیاء العلوم، ۴/۱۹۱) خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حال ایسا تھا کہ آپ کے سینے میں سے اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت کی وجہ سے ایسی آواز نکلتی تھی جیسے ہانڈی کو چولہے پر رکھنے اس کے پکنے اور اس میں جوش آنے سے نکلتی ہے (شمائل ترمذی، صفحہ ۲۱) حالاں کہ سب جانتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا مقام دیا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ

کی ذات وصفات سے متعلق جو چیزیں وہ جانتے ہیں اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی شانِ بے نیازی کا ان کو ایسا استحضار رہتا تھا کہ وہ ہمیشہ ڈرتے رہتے تھے۔ اگرچہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطمینان بھی دلایا جاتا ہے، لیکن (پہلے بھی میں ایک مرتبہ بتلا چکا ہوں کہ) اس ڈر کے سامنے وہ اطمینان اس وقت غائب ہو جاتا ہے اور اس کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے، اور وہ ڈر ایسا مسلط ہوتا ہے کہ ان پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

جو عالم اللہ کے خوف سے روتا نہ ہو......

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "وَاللهِ أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللهِ وَأَخْشَاكُمْ لَهُ" اللہ کی قسم! میں تم لوگوں میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا سب سے زیادہ جاننے والا ہوں (المسند الجامع) تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ خوف وخشیت بھی میرے اندر ہو۔ اسی لئے قرآن کریم میں کہا ہے: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَآءُ﴾ اللہ تعالیٰ کی خشیت اگر مخلوق کے کسی طبقہ میں سب سے زیادہ ہے تو وہ علماء کے اندر ہے یعنی وہ حضرات جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے پورے طور پر واقف ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی خشیت زیادہ ہوگی۔

حضرت سعیدؒ کا مقولہ صاحبِ روح المعانی نے نقل کیا ہے کہ جو عالم اللہ تعالیٰ کے خوف سے روتا نہ ہو، اس کا علم اس کے حق میں نافع نہیں۔ اور صاحبِ روح فرماتے ہیں کہ علماء کی شان یہ ہے کہ اللہ کے خوف سے روتے رہیں۔ حقیقی معنی میں علم اس کے دل میں آیا ہوا اسی وقت سمجھا جائے گا جب کہ وہ اللہ کے خوف سے روتا رہتا ہو۔

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا خوفِ خدا

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق روایتوں میں موجود ہے، اور آپ نے

فضائل کی کتابوں میں سنا بھی ہوگا کہ وہ پرندے کو دیکھ کر خطاب کرتے تھے: "لَيْتَنِيْ مِثْلُكَ يَاطَائِرُ، وَلَمْ أَكُنْ بَشَراً"(احیاء العلوم، ۴/ ۱۹۳) اے پرندے! کاش کہ میں تیری طرح ایک پرندہ ہوتا انسان نہ ہوتا۔ اس لئے کہ اس کا کوئی حساب کتاب نہیں۔ کل کو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو کوئی جواب نہیں دینا، ان جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے مکلّف نہیں بنایا ہے، کل کو ان کا حساب کتاب نہیں ہے، اور ہمیں تو اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ گویا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کے ڈر سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ جملہ کہا کرتے تھے، حالاں کہ یہ وہ شخصیت ہے جو انبیاء کرام کے گروہ کے بعد مخلوق میں سب سے زیادہ افضل ہے، جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنت کی بشارت سنائی، بلکہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنت کے دروازوں کا تذکرہ کیا کہ آٹھ دروازے ہیں اور فلاں دروازے سے فلاں طبقہ کو داخلہ ملے گا۔ کسی نے پوچھا کہ کوئی ایسا بھی ہے جس کو ہر دروازے سے پکارا جائے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں! ابوبکر ایسے ہیں (ترمذی شریف، ۸ ۲۲۳) ان کو زبانِ نبوت سے یہ بشارت ملی ہوئی ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کو صدیق سے بڑھ کر ماننے والا اور کون ہوسکتا ہے! لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے خوف سے ان کا یہ حال تھا کہ پرندے کو خطاب کر کے وہ کہا کرتے تھے: کاش! میں تیری طرح ایک پرندہ ہوتا، انسان نہ ہوتا۔

فاروقِ اعظم کا حال

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھا ہے کہ قرآنِ پاک کی آیت سن کر کبھی بے ہوش ہوجاتے اور ایسے بیمار ہوجاتے تھے کہ کئی روز تک ان کی عیادت کرنی پڑتی تھی۔

اور کبھی کبھی تنکے کو اُٹھا کر یوں کہتے تھے: کاش کہ میں تنکا ہوتا۔

کبھی فرماتے: "لَيْتَنِي كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا" کاش کہ میں بھولا بسرا ہوتا۔

کبھی فرماتے: "لَيْتَنِي لَمْ أَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا" کاش! میں ایسی چیز ہوتا جو پیدا نہیں ہوتی جس کا کوئی تذکرہ نہ ہوتا۔

کبھی یوں فرماتے: "لَيْتَنِي لَمْ تَلِدْنِي أُمِّي" کاش! میری ماں نے مجھے جنا ہی نہ ہوتا۔ رونے کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رخسار کے اوپر نالیوں کے دو نشان پڑ گئے تھے، یہ ان کی خشیت کا عالم تھا۔ (احیاء العلوم، ۴/ ۱۹۳)

دیگر صحابہ کی کیفیت

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق نقل کیا جاتا ہے، وہ فرماتے تھے: کاش مرنے کے بعد میں دوبارہ پیدا کیا نہ جاتا۔ اس لئے کہ پیدا ہونے کے بعد جواب دینا ہے، یہ کہہ کر روتے رہتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے متعلق نقل کیا گیا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے: کاش میں درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا، جلا دیا جاتا اور انسانوں کے کام آجاتا (احیاء العلوم، ۴/ ۱۹۳) یہ وہ حضرات ہیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کے اندر جنت کی بشارتیں سنائی اس کے باوجود جو خشیت ان کے قلب میں اللہ تعالیٰ کی تھی اس کے نتیجے میں یہ چیزیں ظاہر ہوتی تھیں۔

خشیت کیسے حاصل ہو؟

یہاں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اسی چیز کو بتلانا چاہتے ہیں اور یہ وہ چیز ہے جو حاصل کرنے کی ہے۔ دیکھو! قرآنِ پاک کے اندر خشیت کا تذکرہ تو ہے، اور خشیت کا معنیٰ بھی ہم لغت کے اعتبار سے سمجھتے ہیں، لیکن خشیت کیا چیز ہے؟ اور کیسے حاصل کی جائے گی؟ اور جتنی بھی قلبی صفات کا تذکرہ آتا ہے، جیسے تواضع، شکر، صبر اور اخلاص وغیرہ

ان کے معنیٰ لغت کے اعتبار سے ہم جانتے ہیں اوران کے اوپر تفصیلی بیان بھی کر سکتے ہیں، لیکن ان صفات کا حصول ان کتابوں سے نہیں ہوگا، بلکہ ضروری ہے کہ ان صفات کے جو حاملین ہیں ان کی صحبت اختیار کی جائے، اس کے نتیجے میں ہی یہ ساری چیزیں حاصل ہوں گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت سے صحابہ کرامؓ نے یہ صفات حاصل کیں، اور ان سے سلسلہ بہ سلسلہ یہ صفات آگے والوں نے حاصل کیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کے حاصل کرنے کے لئے صحبتوں کو اختیار کیا جاتا ہے، جب آدمی اہلِ خشیت کی صحبت میں بیٹھے گا؛ تب یہ چیز حاصل ہوگی۔

کثرت سے رونے والے دو بزرگ

حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہٗ کو مجلس کے اندر دیکھا کہ کبھی ایسی کوئی بات کا تذکرہ آتا تو اچانک ایک کیفیت طاری ہوجاتی تھی، جھٹکے میں پورا بدن بھاری ہوجاتا، بڑی قوت کے ساتھ اپنی اس کیفیت کو دبانے کی کوشش فرماتے تھے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ''اکابر کا رمضان'' میں لکھا ہے اور حضرت کی زبان سے میں نے بھی بارہا سنا کہ ویسے تو تمام اللہ والوں کی اللہ تعالیٰ کے سامنے رونے کی عادت ہوتی ہے، لیکن میرے والد حضرت مولانا یحییٰ صاحبؒ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو جتنی کثرت سے راتوں کو روتے ہوئے دیکھا، ویسا کسی کو نہیں دیکھا۔ وہ ایسے روتے تھے جیسے کسی بچے کی استاذ پٹائی کر رہا ہو اور وہ روتا ہے۔ ایسے بلبلا کر روتے تھے کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا تھا اور دیر تک اسی طرح روتے رہتے تھے۔

اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سنا کہ روتے ہوئے فارسی کا ایک شعر پڑھا کرتے تھے:-

چہ بودے کہ دوزخ زمَن پُر شُدے
مسگر دیگراں را رہائی شُدے

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ! جن لوگوں کو تو جہنم میں بھیجنا چاہتا ہے ان کی جگہ پر اگر تو مجھے عذاب دے کر اُن کو بچالے؛ تو یہ میری سعادت کی بات ہے۔ بہر حال! یہ چیز بھی مطلوب ہے، اس کو حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ اہم چیز ہے

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت پیش کی ہے: ﴿وَيَخِرُّوْنَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعاً﴾ اس آیت سے پہلے اہلِ کتاب میں جو مخلصین اہلِ علم تھے جو نبیٔ کریم ﷺ کی بعثت پر ایمان لے آئے اور آپ کی تصدیق کی ان کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ لوگ جب اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو سنتے ہیں تو وہ روتے ہوئے ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں اور اس سے ان کے خشوع، اللہ سے ڈرنے اور گڑگڑانے میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ڈر سے روتے رہتے ہیں۔

اور دوسرے موقع پر اللہ تعالیٰ نے کفارِ مکہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿أَفَمِنْ هَذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ. وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ﴾ قرآنِ پاک کی آیت کو سن کر تم انکار کے طور پر تعجب کرتے ہو، اور تم ہنستے ہو، روتے نہیں؟

اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو سن کر رونا؛ یہ اللہ والوں کی شان ہے۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ رات کو بے چینی سے کروٹ لیتے رہتے تھے اور روتے رہتے تھے، اہلیہ نے پوچھا: کیا بات ہے؟ کہا: میں یہ چاہتا ہوں کہ اور دو آنکھیں اللہ کے خوف سے رونے والی ہوجائیں۔

تو یہ بہت ضروری اور اہم چیز ہے، اس پر امامؒ نے چند روایتیں پیش کی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے

۴۴۶- وعن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ لِيَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: اقْرَأْ عَلَيَّ الْقُرْآنَ. قُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللهِ! أَقْرَأُ عَلَيْكَ، وَعَلَيْكَ أُنْزِلَ؟ قَالَ: إِنِّي أُحِبُّ أَنْ اَسْمَعَهُ مِنْ غَيْرِيْ. فَقَرَأْتُ عَلَيْهِ سُوْرَةَ النِّسَآءِ، حَتَّى جِئْتُ إِلىٰ هٰذِهِ الآية: فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلىٰ هٰؤُلَآءِ شَهِيْدًا [النسآء:۴۱] قَالَ: حَسْبُكَ الآنَ. فَالْتَفَتُّ، فَإِذَا عَيْنَاهُ تَذْرِفَانِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا: مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں آپ کو پڑھ کر سناؤں حالاں کہ آپ پر قرآن نازل کیا گیا ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں دوسرے سے سننا چاہتا ہوں۔ تو میں نے آپ کے سامنے سورۂ نساء پڑھنا شروع کی، یہاں تک کہ جب میں اس آیت پر پہنچا: ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلىٰ هٰؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ (جس کا ترجمہ ہے کہ) اس وقت کیا حال ہوگا جب کہ ہم ہر امت کے لئے ایک گواہ بلائیں گے اور اے نبی! ہم آپ کو ان تمام پر گواہ کے طور پر لائیں گے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بس کرو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ کے یہ فرمانے پر میں خاموش ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا، تو آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

افادات:- نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآنِ پاک سننے کی فرمائش کر کے گویا یہ بتلانا چاہتے تھے کہ کبھی آدمی کو دوسرے کی زبان سے بھی سننا چاہیے۔ علماء نے لکھا ہے کہ خود پڑھنے کے مقابلہ میں دوسرے سے سننے میں آدمی کو غور و فکر اور تدبر کا موقعہ زیادہ ملتا ہے اس لئے کہ خود پڑھنے میں الفاظ کو اپنی زبان سے ادا کرتے ہیں، ذہن کو اس کی طرف

متوجہ کرنے کی بھی ضرورت ہے، اور دوسرے سے سننے کی صورت میں جو تدبر اور غور وفکر ہوگا خود پڑھنے میں اس درجہ کا نہیں ہوگا۔ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُمت میں یہ طریقہ بھی جاری کرنا چاہتے تھے، اس لئے آپ نے ان سے سننے کی فرمائش کی۔

"حَسْبُكَ الآنَ" اس سے علماء نے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ کوئی آدمی کسی سے کلامِ پاک سن رہا ہو، اور سنتے سنتے جب طبیعت سیر ہو جائے تو وہ یوں کہہ سکتا ہے کہ بس ٹھہر جاؤ، حالاں کہ قرآنِ پاک پڑھا جارہا ہے، تو بس کہہ کر روکنا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ مسئلہ ثابت کرنے کے لئے مستقل عنوان قائم کیا ہے اور اسی روایت کے ذریعہ اس مسئلے کو ثابت کیا ہے۔

"فَالْتَفَتُّ، فَإِذَا عَيْنَاهُ تَذْرِفَانِ" حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ کے یہ فرمانے پر میں خاموش ہو گیا، اس کے بعد میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا، اس لیے کہ جب تک پڑھ رہے تھے، تب تک تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نگاہ نہیں تھی، نگاہیں نیچی کر کے پڑھ رہے ہوں گے، پھر دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور آگے پڑھنے سے روک دینے کی شاید یہ بھی وجہ ہو کہ آگے پڑھنے کی صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رونے کی کیفیت میں اضافہ ہو جاتا اور اس کا ظہور ہو جاتا۔ اور یہ چیز مطلوب ہے کہ اس طرح کی کوئی کیفیت کسی کے اوپر طاری ہو تو اس کو چھپانے کی کوشش کرے، اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو پڑھنے سے منع فرمایا۔ اس روایت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رونا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات بھر نماز میں ایک ہی آیت پڑھتے رہے: ﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (تفسیر ابن کثیر ۲/۱۲۱)

......ہنسو کم اور روؤ زیادہ

۴۴۷ - وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ خَطَبَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خُطْبَةً مَا سَمِعْتُ مِثْلَهَا قَطُّ. فَقَالَ: لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا أَعْلَمُ، لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلاً وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيْراً قَالَ: فَغَطّٰى أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وُجُوْهَهُمْ، وَلَهُمْ خَنِيْنٌ. (متفق علیه) وَسَبَقَ بَيَانُهُ فِيْ بَابِ الْخَوْفِ۔

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ ایسا وعظ فرمایا کہ ایسا وعظ میں نے کبھی نہیں سنا۔ اسی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی: اگر تم آخرت و قیامت کے احوال کے متعلق وہ باتیں جان لو جو میں جانتا ہوں (یعنی وہ تفصیل جو مجھے معلوم ہے، تمہیں معلوم ہو جائے) تو تم لوگ ہنسو کم اور روؤ زیادہ۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد سن کر اپنے چہروں کو چادروں سے ڈھانپ لیا اور اُن کے منہ کے اندر سے ناک کی آواز کے ساتھ رونے کی آواز آنے لگی۔

افادات:- ناک کی آواز کے ساتھ اُوں اُوں کر کے جو آدمی روتا ہے اس کو عربی میں "خَنِيْنٌ" کہتے ہیں۔ اس روایت کے ذریعہ سے حضراتِ صحابہ کرام کا رونا ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ حضرات بھی اس صفت سے متصف تھے۔

یہاں تک کہ دودھ تھنوں میں واپس جائے

۴۴۸ - وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لاَ يَلِجُ النَّارَ رَجُلٌ بَكَى مِنْ خَشْيَةِ اللهِ حَتَّى يَعُوْدَ اللَّبَنُ فِي الضَّرْعِ، وَلاَ يَجْتَمِعُ غُبَارٌ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَدُخَانُ جَهَنَّمَ۔

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو

آدمی اللہ تعالیٰ کے خوف سے رویا، وہ جہنم میں نہیں جائے گا یہاں تک کہ دودھ تھنوں میں واپس جائے۔ اور اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہوئے جو غبار آدمی کی ناک میں جاتا اور جسم پر لگتا ہے؛ وہ اور جہنم کی آگ ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے۔

افادات:- جانور کے تھنوں میں سے دودھ نکالا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اُسے واپس تھن میں نہیں ڈالا جاسکتا، گویا یہ ایک ناممکن اور محال چیز ہے، تو جیسے دودھ تھن میں واپس نہیں جاسکتا، اسی طریقہ سے جو آدمی اللہ تعالیٰ کے خوف سے روئے وہ بھی جہنم میں داخل نہیں ہوگا۔ بلکہ ایک روایت صاحبِ روح المعانی نے نقل کی ہے کہ جس قوم کے اندر ایک آدمی بھی ایسا ہو جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے والا ہو، تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو عذاب نہیں دیں گے۔

اُمت کی پریشانیوں کی ایک وجہ

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ آج اُمت کی پریشانیوں کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے والے کم ہوگئے۔ آج ہم اپنی مصیبتوں کی وجہ سے روتے ہیں، کوئی مصیبت آگئی، کوئی بیماری آگئی، کوئی انتقال کرگیا، کوئی آفت آگئی، کسی اور تکلیف میں مبتلا ہوگئے، مثلاً مال چوری ہوگیا، کاروبار میں گھاٹا ہوگیا تو خوب روئیں گے، لیکن ہمیں اس بات کی توفیق نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے روئیں؛ حالاں کہ رونے کی اصل چیز تو یہ ہے۔ دنیا کی جتنی بھی چیزیں ہیں، وہ آج نہیں تو کل؛ ہمارے ہاتھ سے چھوٹنے والی ہیں، کوئی چیز بھی باقی رہنے والی نہیں ہے، تو پھر ایسی چیز کے ہاتھ سے چلے جانے پر رونا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ اصل چیز تو یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے خوف سے روئے۔ ان روایتوں کو اسی لئے لائے ہیں کہ آدمی کو اس بات کی عادت ڈالنی چاہیے۔

کام سیکھنے کا طریقہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں رونا نہیں آتا۔ تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: "اِنْ لَّمْ تَبْکُوْا فَتَبَاکَوْا" اگر رونا نہ آئے تو رونے جیسی شکل بناؤ۔ اگر بہ تکلّف روئیں گے تو دھیرے دھیرے رونے کی عادت پڑ جائے گی۔ یہ بھی سیکھنے کی چیز ہے۔ جس چیز سے اللہ تعالیٰ راضی اور خوش ہو، اور جس کے متعلق ایسے وعدے ہوں کہ جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے رویا، وہ جہنم میں نہیں جائے گا، تو اس چیز کو حاصل کرنے اور ایسی صفت سیکھنے کے لئے چند دن بناوٹی بھی رونا پڑے، تو اس میں حرج کی کیا بات ہے۔ شروع میں کوئی بھی کام سیکھنے کے لئے تو بہ تکلف ہی کیا جاتا ہے، کوئی اچھی صفت یا عادت ہو، چند دن تک تو اس کو سیکھنے کے لئے بہ تکلف یعنی زبردستی کرنا ہی پڑے گا، جب زبردستی کریں گے تو کرتے کرتے عادت ہو جائے گی اور وہ چیز بھی خود بہ خود حاصل ہو جائے گی۔

رونے پر ہی ملتا ہے

اور رونے پر اللہ تعالیٰ کے طرف سے بہت کچھ دیا جاتا ہے۔ حضرت شیخؒ اپنی مجلس میں ایک قصہ سنایا کرتے تھے۔ ایک بزرگ کا انتقال ہونے لگا، وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے لوگوں سے قرض لیا کرتے تھے۔ جب قرض خواہوں کو معلوم ہوا کہ فلاں صاحب مرنے والے ہیں تو وہ سب جمع ہو گئے کہ ہمارے پیسے لاؤ۔ اب یہ اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے ہیں کہ اے اللہ جب تک زندگی تھی تب تک تو میرا یہ بدن رہن تھا (قرض خواہ کے پاس کوئی چیز گروی رکھی ہوتی ہے تو اس کو اطمینان ہوتا ہے کہ ہمارے پاس اس کی چیز ہے، اس کی وجہ سے وہ مطالبہ میں شدت اختیار نہیں کرتا۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب تک میں موجود تھا وہاں تک تو ان کو ایک طرح کا اطمینان

تھا) اے اللہ! اب میں تو مر رہا ہوں، اور یہ لوگ آئے بیٹھے ہیں، اب تو کچھ انتظام کر دے۔ وہ اس طرح دعا ہی کر رہے تھے کہ اسی درمیان باہر سے آواز آئی کہ کوئی بچہ مٹھائی بیچ رہا ہے۔ بزرگ نے کہا کہ اس کو بلاؤ۔ وہ آیا تو اس سے پوچھا کہ یہ پورا تھال کتنے میں دیا؟ اس نے کہا کہ اتنے میں۔ تو اس سے وہ خرید لیا اور کہا کہ جتنے یہاں بیٹھے ہیں، سب کو تقسیم کر دو۔ چنانچہ سب کو مٹھائی دی گئی۔ اب بچے نے کہا کہ پیسے لاؤ۔ تو انہوں نے کہا کہ تو بھی لائن میں بیٹھ جا۔ اب وہ تو بچہ تھا، جب اس کو پیسے نہیں ملے تو اس نے رونا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا کہ فلاں آدمی نے یہ تھیلی بھیجی ہے اور اس میں رقم ہے۔ جب شمار کیا گیا تو اس میں سے اتنی ہی رقم نکلی جتنا ان کا قرضہ تھا۔ کسی نے پوچھا: حضرت! آپ نے اس بچہ کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے میں نے دعا کی تو وہاں سے جواب ملا کہ کوئی رونے والا چاہیے، جب میں نے دیکھا کہ یہ جتنے بیٹھے ہیں ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جس کو رونا آئے، اور باہر سے اس بچے کی آواز آئی تو میں نے سوچا کہ ہاں یہ رونے والا ہے، تو میں نے کہا کہ اس کو بلاؤ اور مٹھائی خرید لی، اور اس سے کہا کہ تو بھی بیٹھ جا۔ یہ سن کر جب اس نے رونا شروع کیا تو میری شرط پوری ہوگئی۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ اس واقعہ کو سنا کر فرماتے تھے کہ پیارو! رونا تو بہت اچھی چیز ہے، اللہ تعالیٰ مجھے بھی نصیب فرمائے۔ رو کر تو بہت سارے مطالبے منوا لئے جاتے ہیں۔ جو چیز قوت سے نہیں منوائی جاتی، وہ رو کر حاصل کی جاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو منانے کے لیے سب سے آسان طریقہ رونا ہے۔ اس لئے حاصل کرنے کی چیز یہ ہے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ رونا نہ آئے تو رونے جیسی شکل بنائے۔ آدمی کو رونے کی عادت ڈالنی چاہیے، اور اپنے آپ کو اس کا عادی بنانا چاہیے۔ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ

کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول! دنیا اور آخرت میں نجات دینے والی کون سی چیز ہے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین باتیں ارشاد فرمائیں۔ اپنی زبان کو کنٹرول میں رکھو۔ بلاضرورت گھر سے نہ نکلو۔ اور اپنے گناہوں پر روتے رہو۔ (ترمذی شریف، ۲/۶۶)

یہ چیز ختم ہوگئی

رونا بہت پسندیدہ چیز ہے۔ جتنے بھی حضرات انبیاء کرام اور اہل اللہ گزرے ہیں، ان سب کے حالات کا جب آپ مطالعہ کریں گے تو اس میں یہ چیز (اللہ کے خوف سے رونا) قدرِ مشترک ملے گی۔ اور یہ بہت ضروری چیز ہے، اسی لئے یہ باب قائم کیا ہے کہ اس صفت کو حاصل کرو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں تو یہ چیز معدوم اور ختم ہی ہوگئی ہے، اس لئے آدمی اس چیز کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے۔

سات خوش نصیب

۴۴۹ - وعنه قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللهُ فِيْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَاظِلَّ إِلَّاظِلُّهٗ: إِمَامٌ عَادِلٌ. وَشَابٌّ نَشَأَ فِيْ عِبَادَةِ اللهِ تَعَالىٰ. وَرَجُلٌ قَلْبُهٗ مَعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ. وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللهِ، اجْتَمَعَا عَلَيْهِ وتَفَرَّقَا عَلَيْهِ. وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصَبٍ وَجَمَالٍ، فَقَالَ: إِنِّيْ أَخَافُ اللهَ. وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتّٰى لَاتَعْلَمَ شِمَالُهٗ مَا تُنْفِقُ يَمِيْنُهٗ. وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز عرش کے سائے میں جگہ دیں گے جس روز اس کے سایہ کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہوگا (۱) انصاف کرنے والا حاکم (۲) وہ

نوجوان جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں نشو ونما پائے۔ (گویا جوانی کے زمانہ میں کسی گناہ کا ارتکاب نہ کرے) (۳) وہ آدمی جس کا دل مسجد کے اندر اٹکا ہو (دوسری روایت میں ہے کہ نماز پڑھ کر واپس آتا ہے تو یہ سوچتا رہتا ہے کہ کب دوسری نماز کا وقت ہو اور میں نماز ادا کروں) (۴) وہ دو آدمی جن میں آپس میں اللہ کی نسبت پر محبت ہو (اپنے ذاتی مفاد کے لئے نہیں۔ اللہ کے احکام کو پورا کرنے کی نسبت پر جو لوگ آپس میں ملتے ہیں وہ سب اس میں داخل ہیں) اسی پر ان کا ملنا ہو اور اسی پر جدا ہوں (۵) وہ آدمی جس کو کسی منصب والی، خوبصورت عورت (یعنی دنیاوی اعتبار سے بھی گری پڑی نہیں، بلکہ اچھے گھر سے تعلق رکھنے والی، خوبصورت عورت) نے اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے بلایا اور اس نے جواب میں کہا: مَیں اللہ سے ڈرتا ہوں (۶) وہ آدمی جس نے اللہ کے واسطے صدقہ ایسے چھپا کر کیا کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوئی کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا (۷) ساتویں وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے (یعنی تنہائی میں اللہ کو یاد کر کے رویا)

اس روایت سے بھی رونے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو یہاں پیش کیا ہے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے رونے کی کیفیت

۴۵۰- وعن عبد الله بن الشِّخِّيرِ رضی اللہ عنہ قَالَ أَتَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وَهُوَ يُصَلِّي وَلِجَوْفِهِ أَزِيْزٌ كَأَزِيْزِ الْمِرْجَلِ مِنَ الْبُكَاءِ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن شخّیر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ میں ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نماز میں مشغول تھے اور آپ کے سینۂ مبارک سے رونے کی وجہ سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے ہنڈیا کے اندر سے پانی کے کھولنے کی وجہ سے آتی ہے۔

افادات:- ''مِرْجَل'' تانبے کی ہنڈیا ہوتی ہے جس کے اندر کھانا پکایا

جاتا ہے۔تو تانبے کی ہنڈیا کے اندر پانی ڈال کر اس کو آگ پر رکھا جائے اور آگ کی تپش سے اندر پانی کھولے تو اس سے جیسی آواز پیدا ہوتی ہے، ایسی آواز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینۂ مبارک سے آتی تھی۔

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ رونے لگے

۴۵۱ - وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لأبِي بْنِ كَعْبٍ رضی اللہ عنہ: إِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ أَمَرَنِي أَنْ أَقْرَأَ عَلَيْكَ "لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا ...... قَالَ: وَسَمَّانِي؟ قَالَ: نَعَمْ فَبَكَى أُبَيٌّ. (متفق علیہ) وفي رواية: فَجَعَلَ أُبَيٌّ يَبْكِي.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا کہ میں تمہیں سورۂ "لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا" پڑھ کر سناؤں۔ حضرت اُبی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اللہ کے رسول! کیا میرا نام لے کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ مجھے یہ سورت سنائیں؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جی ہاں۔ یہ سن کر حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ روئے۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت اُبی رضی اللہ عنہ روتے رہے۔

افادات:- حضرت اُبی رضی اللہ عنہ انصاری صحابی اور قراءِ صحابہ میں سے تھے، بلکہ ان کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "أَقْرَؤُهُمْ أُبَيٌّ" صحابہ میں علمِ قراءت کے سب سے زیادہ جاننے والے اُبی ہیں۔ حضرت اُبی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ اللہ کے رسول! کیا میرا نام لے کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے آپ یہ سورت سنائیں؟ اس لئے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو اختیار دیا گیا ہو کہ آپ اپنے صحابہ میں سے کسی ایک کو یہ سورت سنایئے، اور آپ نے اپنے طور پر ان کو تجویز کیا ہو۔ چناں چہ بخاری شریف کی روایت میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اختیار دیا ہے، یا

میرا نام لیا ہے؟ حالاں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اختیار دیا جاتا اور آپ ان کو پسند کرتے تو یہ بھی ایک فضیلت کی چیز تھی، لیکن اگر اللہ تعالیٰ کے طرف سے نام لیا جائے تو بہت ہی زیادہ فضیلت کی بات ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جی ہاں! تمہارا نام لیا ہے، یہ سن کر حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ روئے۔ (بخاری شریف، حدیث نمبر:۶۱، ۴۹۶۰)

ان کا یہ رونا یا تو محبت کی وجہ سے تھا جیسا کہ عنوان میں ''شوقاً الی اللہ'' کہا ہے، اس کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ مارے شوق کے روتے رہے:

ع ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

یا وہ یہ سوچ کر روئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر مَیں کہاں ادا کرسکتا ہوں، اس سے اپنے آپ کو عاجز پا کر روئے۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں

۴۵۲- وعنه قَالَ: قَالَ أَبُو بَكْرٍ لِعُمَرَ رضي الله عنهما بَعْدَ وَفَاةِ رَسُوْلِ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم: اِنْطَلِقْ بِنَا إِلَى أُمِّ أَيْمَنَ رضي الله عنها نَزُوْرُهَا كَمَا كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم يَزُوْرُهَا. فَلَمَّا انْتَهَيَا إِلَيْهَا بَكَتْ. فَقَالَا لَهَا: مَا يُبْكِيْكِ؟ أَمَا تَعْلَمِيْنَ أَنَّ مَا عِنْدَ اللهِ تَعَالَى خَيْرٌ لِرَسُوْلِ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم! قَالَتْ مَا أَبْكِي أَنْ لَا أَكُوْنَ أَعْلَمُ أَنَّ مَا عِنْدَ اللهِ خَيْرٌ لِرَسُوْلِ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم، وَلٰكِنِّيْ أَبْكِيْ أَنَّ الْوَحْيَ قَدِ انْقَطَعَ مِنَ السَّمَاءِ؛ فَهَيَّجَتْهُمَا عَلَى الْبُكَاءِ، فَجَعَلَا يَبْكِيَانِ مَعَهَا.

(رواه مسلم، وقد سبق في بابِ زِيارَةِ أهلِ الخَيرِ)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد ایک روز کہا کہ چلو! ہم حضرت اُمِ اَیمن رضی اللہ عنہا کے پاس ان کی زیارت اور ملاقات کے لئے جائیں جیسے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جایا کرتے تھے۔ جب یہ

حضرات حضرت اُمِّ ایمن رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے، تو ان دونوں کو دیکھ کر حضرت اُمِّ ایمن رضی اللہ عنہا رونے لگیں۔ انہوں نے (بطورِ تسلی ان سے) کہا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے جو کچھ نعمتیں اور مراتب ہیں؛ وہ یہاں سے بہتر ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایسا نہیں ہے کہ میں یہ بات نہیں جانتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں جو کچھ بھی ہے وہ دنیا کے مقابلے میں اچھا ہے، لیکن مَیں تو اس لئے رو رہی ہوں کہ آسمان سے وحی کا سلسلہ اب منقطع ہو گیا۔ ان کی اس بات نے ان دونوں کو بھی رونے پر اُبھارا، چناں چہ وہ دونوں حضرات بھی رونے لگے۔

افادات:- نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی حضرت اُمِّ اَیمن رضی اللہ عنہا کی زیارت کے لئے تشریف لے جاتے تھے، چوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بچپن میں انھوں نے کھلایا ہے۔ (''کھلانا'' کھانا کھلانے کے معنیٰ میں نہیں ہے، بلکہ بہلانے کے لئے لے جانا مراد ہے دودھ پلانے والی ''دائی'' کہلاتی ہے، اور بچوں کو سنبھالنے والی ''کھلائی'' کہلاتی ہے) تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بچپن میں انھوں نے کھلایا تھا (یعنی کھیل لگایا تھا) اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا بڑا احترام فرماتے تھے اور ان کو بڑی محبت سے رکھتے تھے۔ چناں چہ ان کی طرف سے کوئی بات ہوتی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برداشت فرماتے تھے۔

حضرت اُمِّ اَیمن رضی اللہ عنہا کا ناز

غزوۂ بنو قریظہ کے بعد جو باغات غنیمت میں آئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو حضراتِ مہاجرین کے درمیان تقسیم کیا۔ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ انصار اپنے باغات میں سے کچھ درخت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے الگ کر لیتے تھے کہ فلاں باغ کے اتنے درخت حضور کے لئے خاص ہیں، اور حضور کی خدمت میں جا کر عرض کرتے تھے: اے اللہ کے رسول! ہمارے باغ میں سے اتنے درخت آپ کے لئے ہیں یعنی ان میں جتنی

بھی کھجوریں پیدا ہوں گی وہ آپ کی خدمت میں ہدیہ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو اپنی ضرورتوں میں استعمال فرماتے تھے، جو حاجت مند صحابہ ہوتے تھے ان کو دیتے تھے، مہمان آتے تھے ان کی خدمت فرماتے تھے۔ تو کچھ درخت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اہلِ خاندان کی طرف سے دیئے گئے تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ حضرت اُمِّ اَیمن رضی اللہ عنہا کو دے رکھے تھے۔ جب بنو قریظہ والا غزوہ ہوا اور باغات آئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ سارے باغات مہاجرین میں تقسیم فرمادیئے، اور انصار کے جتنے بھی درخت تھے وہ سب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو واپس فرمادیئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے خاندان کی طرف سے جو درخت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو استعمال کے واسطے دیئے گئے تھے وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ام اَیمن رضی اللہ عنہا کو دے رکھے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے خاندان کی طرف سے لینے کے لئے حاضر ہوا تھا، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو بلایا اور فرمایا کہ یہ درخت ان کو واپس کردو۔ تو وہ کہنے لگیں کہ میں تو نہیں دوں گی۔ اور میرے گلے میں دُوپٹہ ڈال کر کھینچنے لگیں اور کہنے لگیں کہ میں نہیں دوں گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم دے دو، مَیں تم کو اس سے دوگنا دوں گا۔ تو کہنے لگیں کہ پھر بھی مَیں نہیں دوں گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا کہ تین گنا دوں گا، چار گنا دوں گا، یہاں تک کہ جب دس گُنا دینے کا کہا؛ تب وہ راضی ہوئیں۔ (بخاری شریف۔ ۴۱۲۰)

اپنے بڑوں کی نقل

خلاصہ یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا بڑا اکرام فرمایا کرتے تھے اور ان کی ملاقات وزیارت کے لئے جاتے تھے۔ اور جن کی زیارت کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود جاتے ہوں، تو بھلا حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کیوں نہ جائیں؟ اس سے پتہ چلا کہ جو کام اپنے

بڑے کیا کرتے ہوں، ان کے بعد بھی وہ سلسلہ آدمی کو جاری رکھنا چاہیے۔ جیسے آپ کے والدِ بزرگوار اللہ کے نیک بندے تھے، تو وہ جن لوگوں کی ملاقات کو جایا کرتے تھے، آپ کو بھی وہ سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ان کی ملاقات کے لئے جاتے رہنا چاہیے۔

فوائدِ حدیث

(۱) جب یہ حضرات حضرت اُمِّ ایمن رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے تو ان کو دیکھ کر حضرت اُمِّ اَیمن رونے لگیں، اس لئے بھی کہ یہ حضرات ہمیشہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے جیسے کسی کے باپ کا انتقال ہو گیا ہو، اور ان کا قریبی کوئی دوست آجائے تو ان کو دیکھ کر آدمی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے وہ روتا ہے۔ اسی طرح ان حضرات کو دیکھ کر بھی ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یاد آنا لازمی بات تھی۔

(۲) ''لیکن مَیں تو اس لئے روتی ہوں کہ آسمان سے وحی کا سلسلہ اب منقطع ہو گیا ہے'' یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی تھے، اور نبی کے پاس نبوت کی نسبت پر جو وحی آتی تھی اب وہ وحی دنیا میں آنے والی نہیں ہے، گویا دنیا وحی کی برکات سے محروم ہو گئی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے رونے کی کیفیت

۴۵۳ - وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قَالَ: لَمَّا اشْتَدَّ بِرَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَجَعُهُ، قِيلَ لَهُ فِيْ الصَّلاَةِ، فَقَالَ: مُرُوا أَبَابَكْرٍ فَلْيُصَلِّ بِالنَّاسِ. فَقَالَتْ عَائِشَةُ رضی اللہ عنہا: إِنَّ أَبَابَكْرٍ رَجُلٌ رَقِيْقٌ، إِذَا قَرَأَ الْقُرآنَ غَلَبَهُ الْبُكَآءُ، فَقَالَ: مُرُوْهُ فَلْيُصَلِّ.

وفی روایة عن عائشة رضی اللہ عنہا قَالَتْ: قُلْتُ: إِنَّ اَبَابَكْرٍ إِذَا قَامَ مَقَامَكَ لَمْ يُسْمِعِ النَّاسَ مِنَ الْبُكَآءِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری

بیماری جس میں حضور کی وفات ہوئی، جب نماز کا وقت آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بے ہوشی طاری ہوئی، پھر جب آپ ہوش میں آئے تو پوچھا کہ کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی؟ بتایا گیا کہ نہیں؛ اے اللہ کے رسول! آپ کا انتظار ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضو کے لئے پانی منگوایا، پھر بے ہوشی طاری ہوگئی، دوبارہ جب ہوش میں آئے تو پھر پوچھا تو بتایا گیا کہ لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا: ابوبکر سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے کے لئے تجویز فرمایا تو حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ ابوبکر نرم دل آدمی ہیں، جب قرآنِ پاک پڑھتے ہیں تو ان پر رونا غالب آجاتا ہے (یعنی وہ روتے رہتے ہیں) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ابوبکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول! ابوبکر جب آپ کی جگہ پر کھڑے ہوں گے تو ان پر بکاء کی ایسی کیفیت طاری ہو جائے گی کہ لوگوں کو آواز نہیں پہنچے گی۔

افادات: - حضرت ابوبکر صدیقؓ کی یہی تو بات تھی کہ ہجرت سے پہلے وہ اپنے گھر میں رات کو تہجد کے اندر قرآن پڑھتے تھے اور روتے تھے تو مشرکین کی عورتیں اور بچے جمع ہو جاتے تھے اور یہی چیز مشرکین پر بڑی شاق گذرتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو بڑا مشکل ہو جائے گا کہ ہماری عورتیں اور بچے ان کا قرآن سن سن کر ہمارے قابو میں نہیں رہیں گے۔ اس لئے انہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو تکلیف پہنچانا شروع کیا، اور اس کے نتیجے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ہجرت کرنے کا ارادہ فرمایا۔ ابن دغنہ نے جب یہ سنا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہا کہ آپ جیسا آدمی یہاں سے نہیں جا سکتا، آپ میں فلاں فلاں خوبیاں ہیں، میں آپ کو امان دیتا ہوں، اور اس نے مشرکینِ مکہ سے کہا کہ میں نے ان کو امان دی ہے، اب ان کو کوئی چھیڑے گا نہیں۔ ان لوگوں نے ابن دغنہ سے کہا کہ آپ جب ہم کو یہ کہہ رہے ہیں تو ان سے بھی ایک بات

کہیے کہ یہ نماز میں زور زور سے قرآن پڑھتے ہیں اور روتے ہیں جس کو سن کر ہماری عورتیں اور بچے جمع ہو جاتے ہیں، اس کی وجہ سے کہیں وہ فتنے میں مبتلا نہ ہو جائیں، اس لئے ان سے کہیے کہ یہ ایسا نہ کریں۔ (بخاری شریف۔۲۱۷۵)

بتلانا یہ چاہتا ہوں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یہ عادت تھی کہ قرآن مجید جب پڑھتے تھے تو رونا آہی جاتا تھا۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جب نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوں گے اور قرآنِ پاک کی تلاوت کریں گے، تو نرم دل ہونے کی وجہ سے رونے کا غلبہ ہوگا اور گویا نماز پوری نہیں کرا سکیں گے۔ اس لئے اللہ کے رسول! آپ کسی اور سے فرمائیں کہ وہ نماز پڑھائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انہی سے کہو۔ دو تین مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

یہاں اس روایت کو لانے کا مقصد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس صفتِ بکاء کو بیان کرنا ہے کہ وہ قرآنِ پاک کی تلاوت کے وقت رویا کرتے تھے، اور یہ رونا کبھی اللہ تعالیٰ کے خوف سے اور کبھی اللہ تعالیٰ کے شوق میں ہوتا تھا۔

دولت نیکیوں کا بدلہ تو نہیں؟

۴۵۴۔ عن إبراهيم بن عبد الرحمٰن بن عوف: أَنَّ عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ أُتِيَ بِطَعَامٍ وَكَانَ صَائِمًا۔ فَقَالَ: قُتِلَ مُصْعَبُ بن عُمَيْر رضی اللہ عنہ وَهُوَ خَيْرٌ مِنِّي، فَلَمْ يُوجَدْ لَهُ مَا يُكَفَّنُ فِيهِ إِلَّا بُرْدَةٌ، إِنْ غُطِّيَ بِهَا رَأْسُهُ بَدَتْ رِجْلَاهُ وَإِنْ غُطِّيَ بِهَا رِجْلَاهُ بَدَا رَأْسُهُ۔ ثُمَّ بُسِطَ لَنَا مِنَ الدُّنْيَا مَا بُسِطَ۔ أَوْ قَالَ: أُعْطِينَا مِنَ الدُّنْيَا مَا أُعْطِينَا۔ قَدْ خَشِينَا أَنْ تَكُونَ حَسَنَاتُنَا عُجِّلَتْ لَنَا، ثُمَّ جَعَلَ

يَبْكِيْ حَتّٰى تَرَكَ الطَّعَامَ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ابراہیم راوی ہیں کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ (جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) کے پاس کھانا لایا گیا اور وہ روزہ سے تھے (کھانا ذرا عمدہ قسم کا تھا اس کو دیکھ کر ان کو پہلے کا زمانہ یاد آ گیا) تو فرمانے لگے کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ شہید کئے گئے، وہ مجھ سے افضل تھے، جب وہ شہید ہوئے تو کفن دینے کے لئے اتنا کپڑا میسر نہیں آیا جس سے پورا کفن دیا جا سکے سوائے ایک چادر کے، اور وہ بھی اتنی مختصر تھی کہ اگر ان کا چہرہ چھپایا جاتا تو پاؤں کھل جاتے تھے اور پاؤں چھپائے جاتے تو چہرہ کھل جاتا تھا پھر دنیا کی دولت ہمارے پاس آئی تو ہمیں تو یہ ڈر ہے کہ کہیں ہماری نیکیوں کا بدلہ دنیا ہی میں نہ دیا گیا ہو۔ یہ فرما کر وہ روتے رہے، یہاں تک کہ کھانا نہیں کھایا۔

افادات:- (۱) بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ روزہ دار کے لئے جب افطار کرنے کا وقت آتا ہے تو وہ کھانے کا زیادہ محتاج ہوتا ہے، طبیعت میں بھی کھانے کا تقاضہ ہوتا ہے اس کے باوجود خوف وخشیت کی ایسی کیفیت ان پر غالب آئی کہ انھوں نے کھانا نہیں کھایا۔

(۲) حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مہاجرین اولین میں سے ہیں، غزوۂ اُحد کے موقع پر مسلمانوں کا جھنڈا ان ہی کے ہاتھ میں تھا اور وہ شہید کئے گئے اور چوں کہ ان کا چہرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ سے بہت مشابہت رکھتا تھا تو جس آدمی نے ان کو شہید کیا تھا اس نے یہ مشہور کر دیا کہ میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کر دیا اور اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کی افواہ پھیل گئی۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور تمام امت کا عقیدہ ہے کہ عشرہ مبشرہ باقی تمام صحابہ سے افضل ہیں اس کے باوجود وہ یہ فرما رہے ہیں ''حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مجھ سے افضل ہیں'' وہ یا تو بطورِ تواضع کے فرما رہے ہیں، یا جس وقت

یہ ارشاد فرمایا اس وقت تک حضور ﷺ نے ان کو یہ بشارت نہیں سنائی تھی۔

(۳) ''اگر ان کا چہرہ چھپایا جاتا تو پاؤں کھل جاتے تھے اور پاؤں چھپایا جاتا تو چہرہ کھل جاتا تھا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ فقر کا یہ عالم تھا، ایسی حالت میں وہ دنیا سے رُخصت ہوئے، اس کے بعد دنیا کی وہ دولت وثروت ملی جو کہ ملی۔ اس لئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں فتوحات کا سلسلہ پھیلا اور دوسرے ممالک فتح ہوئے تو دولت وثروت کی ریل پیل ہوئی۔ اور یہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ تو پہلے ہی سے مالدار صحابہ میں شمار کئے جاتے تھے۔

جلدی سے بدلہ دیئے جانے کا مطلب یہی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم نے نیکیوں کے جو کام کئے ہیں، یہ ان کا اجروثواب ہو، اور ان کا بدلہ دنیا ہی میں مل گیا ہو، اور کل کو آخرت میں ہم سے یوں کہا جاوے کہ تم کو تو بدلہ دنیا میں ہی دیا گیا تھا، یہاں کیا مانگنے آئے ہو۔ اس ڈر سے ان حضرات کے پاس جب دولت وثروت آتی تھی تو ڈرتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ کیا ارادہ کیا ہے۔ ان کو یہ خطرہ رہتا تھا۔ اور آج ہمارا حال یہ ہے کہ کسی کے پاس دولت ہو تو یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہاتھ پکڑا ہے۔ تو کیا نعوذ باللہ اس سے پہلے کوئی اور بات تھی؟ اللہ تعالیٰ کا فضل وعنایت نہیں تھی؟ ان حضرات کے یہاں تو یہ چیز خطرے کی سمجھی جاتی تھی۔

یہ فرما کر وہ روتے رہے، یہاں تک کہ کھانا نہیں کھایا۔ حالاں کہ روزے سے تھے، افطار کے وقت کھانا لایا گیا تھا، اور روزے کا تقاضا یہ تھا کہ کھاتے لیکن ان پر خشیت وبکا کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ کھانا چھوڑ دیا۔

دو قطرے اور دو نشان

۴۵۵- وَعَنْ اَبِي اُمَامَةَ صُدَيِّ بن عجلانَ الباهِلِي رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِي ﷺ

قَالَ: لَيْسَ شَيْئٌ أَحَبَّ إِلَى اللهِ تَعَالَىٰ مِنْ قَطْرَتَيْنِ وَأَثَرَتَيْنِ: قَطْرَةُ دُمُوعٍ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ، وَقَطْرَةُ دَمٍ تُهْرَاقُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ. وَأَمَّا الأَثَرَانِ: فَأَثَرٌ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ تَعَالَىٰ، أَثَرٌ فِيْ فَرِيْضَةٍ مِنْ فَرَائِضِ اللهِ تَعَالَىٰ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ حديثٌ حسنٌ)

ترجمہ:- حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کو دو قطروں اور دو نشانوں سے زیادہ محبوب اور کوئی چیز نہیں۔ ایک تو اللہ تعالیٰ کے خوف سے جو آنسو نکلے اس کا قطرہ۔ اور اللہ کے راستہ میں جہاد میں دشمن سے لڑتے ہوئے جو خون بہے اس کا قطرہ۔ اور جو دو نشان اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں ان میں سے ایک وہ نشان ہے جو اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے ہوئے دشمن کی تلوار یا نیزے سے لگا اور جسم پر نشان رہ گیا۔ اور دوسرا اللہ تعالیٰ کے کسی فریضے کی ادائیگی میں جو نشان لگا۔

افادات:- دوسری روایت میں ہے کہ کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کے خوف سے رویا اور اس کا آنسو نکلا، چاہے وہ مکھی کے سر کے برابر ہو، اور چہرے کے اوپر اتر آیا؛ تو اللہ تعالیٰ بدن کے اس حصے کو جہنم کے اندر نہیں ڈالے گا۔

''قطرۃ دموع'' اور ''قطرۃ دم'' شرّاح فرماتے ہیں کہ ''دموع'' جمع لائے اور ''دم'' واحد لائے۔ گویا خون کے ایک قطرہ پر بھی یہ فضیلت حاصل ہو جائے گی۔

''اللہ تعالیٰ کے کسی فریضے کی ادائیگی میں جو نشان لگا'' مثلاً نماز پڑھتے پڑھتے پیشانی کے اوپر جو نشان پڑ جاتا ہے یا وضو کا جو نشان چہرے پر رہتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ کے کسی بھی فریضے کی ادائیگی میں کوئی نشان پڑ جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے۔ یہاں اس روایت کو اسی لئے لائے ہیں کہ جو قطرہ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے وہ آنسو کا قطرہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نکلا ہو۔ اس لئے آدمی کو یہ کیفیت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس کی عادت ڈالنی چاہیے اور اہتمام کرنا چاہیے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں کی کیفیت

۴۵۶ - عن العرباض بن سارية رضی اللہ عنہ قال: وَعَظَنَا رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً، وَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْب، وَذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْن.

ترجمہ:- حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ ہم کو بہت مؤثر وعظ فرمایا جس کے نتیجے میں لوگوں کے دل دہل گئے اور آنکھیں بہہ پڑیں۔

افادات:- یہاں اس روایت کو اس لئے لائے ہیں کہ دیکھو! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وعظ سن کر صحابہ کرامؓ کے دلوں کی کیفیت اللہ کے خوف و خشیت سے ایسی ہو جاتی تھی کہ ان کے دل دہل جاتے تھے اور آنسو بہہ پڑتے تھے۔ یہی کیفیت اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے اور اس کا طریقہ پہلے بتلایا گیا کہ شروع میں بہ تکلّف رونے کی صورت بنائی جائے، پھر دھیرے دھیرے یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

(یہ روایت تفصیل سے باب المحافظة علیٰ السنة، حدیث نمبر ۱۵۷، حدیث کے اصلاحی مضامین، جلد ۳، صفحہ از ۲۰۸ تا ۲۱۰ پر گزر چکی ہے۔ ادارہ)

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق وسعادت عطا فرمائے

فَضۡلُ الزُّهۡدِ فِي الدُّنۡيَا وَالۡحَثُّ عَلَى التَّقَلُّلِ مِنۡهَا وَفَضۡلُ الۡفَقۡرِ

دنیا کے معاملہ میں زہد اختیار کرنے کی فضیلت اور ساز وسامان میں کمی رکھنے کی ترغیب اور فقر کی فضیلت

مجلس ۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۲۱/شوال المکرم ۱۴۲۰ھ ۲۹/جنوری ۲۰۰۰ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ. صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أما بعد:-

أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَیَاۃِ الدُّنْیَا کَمَآءٍ أَنزَلْنَاہُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِہِ نَبَاتُ الأَرْضِ مِمَّا یَأْکُلُ النَّاسُ وَالأَنْعَامُ حَتَّیَ إِذَا أَخَذَتِ الأَرْضُ زُخْرُفَھَا وَازَّیَّنَتْ وَظَنَّ أَھْلُھَا أَنَّھُمْ قَادِرُونَ عَلَیْھَا أَتَاھَا أَمْرُنَا لَیْلاً أَوْ نَھَاراً فَجَعَلْنَاھَا حَصِیْداً کَأَن لَّمْ تَغْنَ بِالأَمْسِ. کَذَلِکَ نُفَصِّلُ الآیَاتِ لِقَوْمٍ یَتَفَکَّرُونَ. (یونس ۲۴)

نیا عنوان قائم کیا ہے۔ دنیا کے معاملہ میں زہد اختیار کرنے کی فضیلت، اور دنیا کے ساز وسامان میں کمی رکھنے کی ترغیب، اور فقر کی فضیلت۔

حقیقی سکون وراحت کا راستہ

اس سے پہلے خوف ورجا کا بیان تھا۔ جس طرح خوف اور رجا؛ یہ دونوں باطنی اخلاق میں سے ہیں، اسی طریقہ سے زہد بھی دل سے تعلق رکھنے والی ایک صفت اور باطنی خُلُق ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی اگر اپنے باطنی اخلاق درست کرلے تو اس صورت میں اس کے لیے جہاں آخرت کی کامیابی ہے، وہاں اُس کو دنیاوی اعتبار سے بھی

راحت وسکون حاصل ہوگا۔ دنیا کا چین اور سکون بھی اُس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا، جب تک اخلاقِ باطنہ درست نہ کرلے۔ کوئی آدمی ظاہری اعتبار سے دنیوی اسباب ووسائل کتنے ہی جمع کیوں نہ کرلے، کئی فیکٹریاں قائم کرلے، بنگلے کھڑے کرلے، کئی گاڑیاں لاکر صحن میں کھڑی کردے، کتنا ہی بینک بیلنس جمع کرلے، اور دنیا کی زیب و زینت اور عیش وآرام کا ساز وسامان کتنا ہی جمع کیوں نہ کرلے؛ لیکن دل کا سکون وچین اور حقیقی راحت اسی وقت حاصل ہوگی جب اپنے اخلاقِ باطنہ اور اندرون کی خوبیوں کو حاصل کرے، جب تک یہ بات نہیں ہوگی، وہاں تک صرف ظاہری اسباب ووسائل اختیار کرنے سے دل کا سکون حاصل نہیں ہوسکتا۔ چناں چہ انہیں اخلاقِ باطنہ میں سے ایک خُلُق کو آج بیان کرنا چاہتے ہیں، اور وہ ''زہد'' ہے۔

زُہد کیا ہے؟

ہم عابد اور زاہد بولا کرتے ہیں۔ یہ زہد کیا چیز ہے؟ دنیا سے بے رغبتی، اور دل کا دنیا کی محبت سے خالی ہونا؛ زہد کہلاتا ہے۔ زاہد یعنی جس کے دل میں دنیا کی رغبت نہ ہو۔ جس کے دل میں دنیا کی محبت نہیں، جس کا دل دنیا کی محبت سے خالی ہے، ایسے آدمی کو ''زاہد'' کہتے ہیں۔ اور اس خوبی کو ''زُہد'' کہتے ہیں اور اس کی قرآن وحدیث میں بڑی ترغیب آئی ہے، اور آدمی کے لئے دینی اعتبار سے بنیادی وصف یہی ہے۔ اس لیے کہ سب سے بڑی خرابی اور سب سے برا وصف جو آدمی کے اندر ہے وہ دنیا کی محبت ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ كُلِّ خَطِیْئَةٍ'' (کشف الخفاء، ۱۰۹۹) دنیا کی محبت ہر برائی اور گناہ کی جڑ ہے۔ دنیا میں جتنے بھی جرائم، برائیاں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانیاں وجود میں آرہی ہیں، اُن سب کے پیچھے اگر آپ غور

کریں تو دنیا کی محبت ہی کارفرما نظر آئے گی۔ یہی دراصل ساری خرابیوں کی بنیاد ہے۔

ہر برائی کی جڑ

مثلاً ایک آدمی اگر چوری کرتا ہے تو اسی لیے کہ اُس کے دل میں مال کی محبت ہے۔ یا ایک آدمی زنا کرتا ہے، شراب پیتا ہے، تو یہ بھی دراصل دنیوی لذتیں ہیں جو اس وقت اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں، اور یہ تمام لذتیں وقتی اور ختم ہونے والی ہیں جس کے حاصل کرنے کے لئے آدمی زنا اور شراب کے ذریعہ سے مدد حاصل کرتا ہے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہوتا ہے۔ جتنے بھی جرائم اور گناہ ہیں اگر آپ اُن کی بنیاد دیکھیں گے؛ تو دنیا کی محبت ہی ہوگی۔ اسی لئے قرآن میں دنیا کی حقیقت کو مختلف انداز سے واضح کیا گیا ہے کہ دنیا کی کیا حقیقت ہے؟ بار بار بتایا گیا کہ جو تم اُس کے پیچھے پڑے ہو، رات دن ایک کر رہے ہو، اپنی ساری صلاحیت و قابلیت اور قوت جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطا فرمائی ہے اس کو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے اور آخرت کے واسطے استعمال کرنا چاہیے تھا، لیکن تم اس کو دنیا کے پیچھے ضائع اور برباد کر رہے ہو۔

رُخ صحیح کرلیں

اس دنیا کی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ کتنے دن کی ہے؟ اس کو مختلف مثالوں سے قرآنِ پاک کے اندر بیان کیا گیا ہے، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے دل ایسا بنایا ہے کہ اُس میں ایک وقت میں حقیقی اعتبار سے کئی محبتیں جمع نہیں ہوسکتیں، بلکہ صرف ایک ہی محبت رہ سکتی ہے۔ تعلقات تو مختلف اشخاص سے ہو سکتے ہیں، لیکن حقیقی محبت اگر دیکھی جائے تو ایک ہی سے ہوسکتی ہے۔ اور جس دل میں دنیا کی محبت ہو، اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں آسکتی، اور جب تک اللہ تعالیٰ کی محبت آدمی کے دل میں پیدا

نہ ہو جائے، وہاں تک اس کی زندگی کا رُخ صحیح نہیں ہو سکتا۔ اور اصل تو رخ کا صحیح کرنا ہی ہے۔ مثلاً آپ گاڑی چلاتے ہیں، تو اگر اُس کا رُخ غلط ہے تو اُس صورت میں آپ جتنی تیز سے تیز چلاتے جائیں گے اتنے ہی منزل سے دور ہوتے جائیں گے، کبھی بھی منزل تک پہنچنے والے نہیں۔ اور اگر ایک مرتبہ رُخ صحیح کر لیا، اس کے بعد آپ آہستہ بھی چلائیں گے تب بھی آج نہیں تو کل؛ منزل پر ضرور پہنچیں گے۔ تو حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں آجائے تو یوں سمجھئے کہ زندگی کا رُخ صحیح ہو گیا۔ اور جب رخ صحیح ہو جائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے واسطے، اُس کے احکام کو بجالانے کے واسطے جو بھی محنت ہو گی، آدمی آسانی سے اُس کو برداشت کرے گا۔ نہ نماز اس کے لئے بھاری رہے گی، نہ نماز کے لئے اُٹھنا اُس کے لئے مشکل رہے گا۔ نہ کسی قسم کی مالی قربانی دینا اُس کے لئے مشکل رہے گا۔

حُبِّ دنیا کے کرشمے

جو لوگ دوسروں کے حقوق مارتے ہیں جیسے باپ کا انتقال ہو گیا تو بھائی اپنی بہنوں کا حق نہیں دیتا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بہنوں کا بھی حق رکھا ہے۔ وراثت میں اُن کی ملکیت ہے، لیکن بھائی نہیں دیتا؛ آخر کیوں؟ اسی مال کی محبت کی وجہ سے نہیں دیتا۔

ایک آدمی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، وہ مال کی محبت کی وجہ سے۔ لوگوں کے ساتھ دھوکہ دہی کرتا ہے، وہ بھی مال کی محبت کی وجہ سے۔ جب تک کہ دنیا اور مال کی محبت دل کے اندر موجود ہے، وہاں تک شریعت کے احکام پر عمل کرنا اس کے لئے مشکل ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری میں قدم قدم پر دنیا کی محبت اس کے لئے رکاوٹ بنتی ہے۔ شریعت کے احکام کو بجالانے میں مشکلیں کیوں پیش آتی ہیں؟ اس لئے کہ دنیا کی

محبت ہے۔ اگر دل میں دنیا کی محبت نہ ہوتی اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت ہوتی تو اس کے لئے سب کچھ قربان کرنا آسان تھا۔

حقیقی محبت اگر کسی سے کرتا

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کا دل ایسا بنایا ہے کہ اُس میں ایک وقت میں حقیقی اعتبار سے ایک ہی محبت آسکتی ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فضائل میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا لَاتَّخَذْتُ أَبَابَكْرٍ خَلِيلًا" اگر میں دل سے کسی کو اپنا دوست بناتا اور حقیقی محبت اگر کسی سے کرتا؛ تو ابوبکر سے کرتا (بخاری شریف، ۳۴۵۷) لیکن حقیقی محبت اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی سے نہیں کی جاسکتی۔ حالاں کہ نبی کریم ﷺ کا جو تعلق حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ تھا وہ ساری دنیا جانتی ہے، سب کو معلوم ہے کہ کتنا زیادہ تعلق تھا۔ صحابہ کرامؓ میں سب سے زیادہ تعلق نبی کریم ﷺ کا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ تھا، اُس کے باوجود حضور اکرم ﷺ نے قلبی محبت کی حقیقت کو ظاہر کیا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور سے قلبی محبت نہیں ہوسکتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور سے حقیقی محبت ہوسکتی تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں ابوبکر سے کرتا۔

اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کو جو نسبت اور تعلق تھا اس کو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مثال سے بہت آسانی سے سمجھایا ہے کہ اگر ایک آئینہ ہو، اور اس آئینہ کے سامنے نبی کریم ﷺ کھڑے ہوں، تو اس آئینہ میں جو نظر آرہا ہے گویا وہ ابوبکر ہیں اور باہر حضور اکرم ﷺ ہیں۔ "من تو شدم تو من شدی" جیسا معاملہ تھا۔ اور تمام خوبیوں میں ایسی ہی یکسانیت تھی اور اس کے نمونے احادیث میں ملتے ہیں۔

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو نسبتِ اتحاد

غزوۂ حدیبیہ کے موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفارِ مکہ کے ساتھ صلح کی تھی۔ دراصل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرہ اور بیت اللہ کی زیارت کے ارادہ سے احرام باندھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ تشریف لائے تھے، مشرکین نے روکا کہ ہم نہیں جانے دیں گے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف لوگوں کے ذریعہ سے پیغام پہنچایا، اور سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ ہم لڑنے کے لیے نہیں آئے ہیں، ہم تو بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں، زیارت کر کے واپس چلے جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں جانے دیں گے، آخر میں صلح کی نوبت آئی۔ ان تک بات پہنچانے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا جب وہ وہاں گئے تو مکہ والوں نے اُن کو روک لیا۔ اور یہاں یہ بات مشہور ہوئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بیعت لی کہ ہم عثمان کے خون کا بدلہ لیں گے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لڑنے کے لیے بالکل تیار تھے، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں پر بیعت کر چکے تھے کہ ہم جان دیدیں گے لیکن میدان سے قدم نہیں ہٹائیں گے، لیکن پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتلایا گیا کہ صلح کر لیں۔ اس لیے صلح کی گفتگو شروع ہوئی۔ اس میں انہوں نے ایسی شرطیں رکھیں کہ کوئی مان ہی نہیں سکتا تھا۔ ایسی شرطیں تھیں جن کو ماننے میں بظاہر اپنی بات کو چھوڑنا پڑتا تھا، اور آدمی ایک طرح کی بے عزتی محسوس کرتا تھا۔ منجملہ شرائط کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ ابھی واپس جانا ہوگا، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ کے قریب پہنچ چکے تھے چند کلومیٹر ہی دور تھے، اور وہ کہنے لگے کہ ہم عمرہ کرنے نہیں دیں گے، اور بیت اللہ کی زیارت بھی کرنے نہیں دیں گے، ابھی تو واپس جانا پڑے گا۔ دوسرا یہ کہ دس سال کے

لیے ہمارے درمیان صلح رہے گی، اس درمیان ہمارے یہاں سے کوئی آدمی مسلمان ہوکر آپ کے وہاں آئے گا تو آپ کو واپس کرنا ہوگا۔ اور اگر آپ کا کوئی آدمی یہاں آئے گا تو ہم واپس نہیں کریں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی سب شرطیں مان لیں۔ صحابہ کرامؓ کو دیکھا جائے تو سب ایک دم سے خاموش تھے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ حضرت سہل بن حُنَیف ؓ فرماتے ہیں کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی حکم کو رد کیا جاسکتا، تو ہم اس کو رد کر دیتے۔ یعنی دل میں ایسے جذبات تھے، لیکن صحابہ کرامؓ جان دے سکتے تھے لیکن حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم رد نہیں کر سکتے تھے۔ وہ حضرات اس کا تصور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم اور آپ کی بات ٹالی جاسکتی ہے۔

اس موقع پر تمام صحابہ کرامؓ ایک دم سے خاموش تھے۔ جب حضرت عمرؓ سے بھی رہا نہیں گیا تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیوں نہیں۔ پھر پوچھا: کیا آپ اللہ کے سچے رسول نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیوں نہیں۔ پھر پوچھا: اگر ہماری ان کے ساتھ لڑائی ہو جائے اور ہمارے آدمی مارے جائیں، تو کیا جنت میں نہیں جائیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جائیں گے۔ پھر پوچھا: اُن کے آدمی جہنم میں نہیں جائیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جائیں گے۔ تو کہنے لگے: پھر کیوں ہم اتنا دب کر صلح کریں؟ پھر کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ نہیں فرمایا ہے؟ اور آپ نے خواب بھی دیکھا تھا کہ ہم بیت اللہ کی زیارت کر رہے ہیں۔ تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ٹھیک ہے، لیکن اُس میں وقت کی قید نہیں تھی کہ اسی سال کریں گے۔ حضرت عمرؓ کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں، میں جو بھی کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ کے حکم سے کرتا ہوں۔ اب وہ خاموش تو ہو گئے لیکن پھر بھی دل میں کھٹک ابھی باقی تھی۔

جس وقت حضرت عمرؓ کی حضورِ اکرم ﷺ سے یہ ساری بات ہو رہی تھی اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ وہاں موجود نہیں تھے، وہ لشکر کے کسی دوسرے حصے میں تھے تقریباً ڈیڑھ ہزار کا لشکر تھا۔ حضور ﷺ سے گفتگو کرنے کے بعد حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچے اور ان سے بھی یہی سارے سوالات کئے۔ کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں ہیں؟ اور حضرت ابوبکرؓ نے ہو بہو وہی سارے جوابات دیئے، جو نبی کریم ﷺ نے دیئے تھے۔

دوسرا واقعہ

ایک موقعہ پر حضرت ابوبکر صدیقؓ مشرکینِ مکہ کی ایذاء رسانیوں سے تنگ آ کر مکہ مکرمہ چھوڑنے کی تیاری کر رہے تھے، جب اپنا سامان لیکر نکلے تو ابن دغنہ جو مکہ کے بڑے لوگوں میں تھا اُس نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ ان مکہ والوں نے مجھے تنگ کر رکھا ہے، میرے لئے اب یہاں زندگی بسر کرنا مشکل ہو گیا ہے، اس لیے مَیں یہاں سے جا رہا ہوں۔ اُس نے کہا کہ آپ جیسا شخص یہاں سے چلا جائے، یہ نہیں ہو سکتا۔ اس وقت اس نے جو جملے کہے وہ یہ تھے: "إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ، وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ" (صحیح البخاری، الطبعة الهندية / حدیث نمبر ۲۲۹۷، ۳۹۰۵) آپ صلہ رحمی کرنے والے ہیں، جو نہیں کما سکتا اُس کو کما کر دینے والے ہیں، مہمانوں کی مہمان نوازی کرنے والے ہیں، اور مصیبت کے موقعہ پر لوگوں کی مدد کرنے والے ہیں۔ اس شخص نے یہ سارے اوصاف حضرت ابوبکرؓ کے گنوائے۔ اور ہو بہو یہی سارے اوصاف نبی کریم ﷺ کے تھے۔ جب نبی کریم ﷺ کے اوپر پہلی وحی آئی اور آپ غارِ حرا سے واپس مکان پر تشریف لائے،

چوں کہ پہلی وحی تھی، اس سے پہلے کبھی فرشتے سے ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی، اس لئے آپ سہم گئے تھے کہ پتہ نہیں اب کیا ہوگا، اور آپ کو اپنی جان کے متعلق خطرہ لاحق ہوا، تو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے سارے حالات بیان کرنے کے بعد عرض کیا: ''إِنِّيْ خَشِيْتُ عَلٰی نَفْسِيْ'' مجھے اپنی جان کا خطرہ معلوم ہوتا ہے۔ تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''كَلَّا! وَاللهِ لَا يُخْزِيْكَ اللهُ أَبَدًا'' اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو رسوا نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، مہمانوں کی میزبانی کرتے ہیں، جو کمانے کے قابل نہیں اُس کو کما کر دیتے ہیں، مصائب کے موقعہ پر لوگوں کی مدد کرتے ہیں (صحیح البخاری، الطبعۃ الھندیۃ / حدیث نمبر ۳، اور ۴۹۵۳، اور ۶۹۸۲) حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جو اوصاف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس موقعہ پر بیان کئے تھے، ہُو بہُو یہی اوصاف ابن دَغِنَہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بیان کئے تھے۔ اور پھر کہا تھا کہ میں تمہاری ذمہ داری لیتا ہوں، تم مکہ چھوڑ کر مت جاؤ۔

ایک وقت میں ایک ہی محبت

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ایسا یکسانیت کا تعلق تھا، اس کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر اللہ کے علاوہ کسی اور کو حقیقی معنیٰ میں دوست بنایا جاتا، اور اُس کی محبت دل میں رکھی جاتی تو میں ابوبکر کی محبت دل میں رکھتا، لیکن ان کی بھی محبت دل میں نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حقیقی محبت اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کی دل میں آنی ہی نہیں چاہیے۔ مؤمن کے دل میں حقیقی محبت اللہ تعالیٰ ہی کی ہوگی۔ باقی جتنے بھی تعلقات ہیں وہ سب اس کے حکم کی وجہ سے ہیں۔ اسی لیے جہاں کہیں بھی کوئی ایسی بات آئے جو اللہ کی محبت میں آڑ بننے والی ہو، تو اُس تعلق کو ختم کرنا چاہیے۔ اسی لئے شریعت نے قاعدہ بتایا ہے کہ جس کام

میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو، اس میں کسی کی بات مانی نہیں جائے گی، چاہے سامنے کوئی بھی ہو، ماں ہو، باپ ہو، بیوی ہو، بیٹا ہو، یا اور کوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی والی چیزوں میں کسی کی بات نہیں مانی جائے گی۔

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دنیا کی محبت ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ جس دل میں دنیا کی محبت ہوگی اُس دل میں اللہ کی محبت نہیں آسکتی۔ یہ سیدھی سادی بات ہے۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں — ایں خیال ست و محال ست و جنوں

تم اللہ تعالیٰ کے بھی طلب گار رہو اور کمینی دنیا کے بھی طلبگار رہو، اُس کے بھی خواہش مند ہو؟ یہ دونوں باتیں جمع نہیں ہوسکتیں، یہ خواب و خیال اور محال چیز ہے؛ بلکہ یہ تو پاگل پن ہے۔ یا یہ ہوگا یا وہ ہوگا۔ جس دل میں دنیا کی محبت ہوگی اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں آئے گی، اور جس دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت آئے گی اس میں دنیا کی محبت ہو ہی نہیں سکتی

ضرورت اور محبت

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولوی صاحب! آپ تو اتنی ساری باتیں کرتے ہیں، لیکن ہمیں رہنا تو دنیا ہی میں ہے۔ بھوکے ہوں گے تو کھانا کھائیں گے، پیاس لگے گی تو پانی پینا ہی پڑے گا، رہنے کے لئے مکان کی ضرورت ہوتی ہی ہے، پہننے کے لئے کپڑے کی ضرورت ہے، اگر دنیا کو ساتھ میں نہیں رکھیں گے تو یہ سب ضرورتیں آخر کہاں سے پوری کریں گے؟

تو بھائی دیکھو! یہ نہیں کہا جا رہا ہے کہ آپ اپنی ضرورتیں پوری نہ کیجئے۔ بھوک

لگے تو آپ کھانا کھایئے، بلکہ کھانا نہیں کھاؤ گے، اور ویسے ہی مرجاؤ گے تو گنہگار ہو گے، اگر بھوک لگی اور آدمی کے پاس کھانا ہے اور نہیں کھاتا یہاں تک کہ بھوک کی وجہ سے مرگیا تو گنہگار مرا، یہ تو ایک طرح کی خودکشی ہوگی، اُس نے حرام کام کیا، شریعت نے اس کا حکم نہیں دیا۔ شریعت تو یہ حکم دیتی ہے کہ اپنی جان بچاؤ بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو فرائض ہم پر عائد کئے ہیں، اُن کی ادائیگی کے قابل رہو، اتنا کھاؤ کہ طاقت حاصل ہو۔ تو کھانے کا حکم دیا، پینے کا حکم دیا، لباس کو ضروری قرار دیا۔ بلکہ نماز میں خاص مقدار لباس کی ایسی ہے جس کو پہننا ضروری ہوتا ہے، اس کے بغیر نماز ہی درست نہیں ہوتی۔ تو لباس کا حکم دیا، بلکہ قرآن کریم میں لباس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کے طور پر بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو زینت اور حفاظت کا سبب بنایا۔

تو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ساری چیزیں ہماری ضرورت کے لئے بنائی ہیں، اس لئے ان کا حاصل کرنا، کمانا اور اس کے ذریعہ سے اپنی ضرورتیں پوری کرنا منع نہیں ہے۔ اصل تو یہ کہا جا رہا ہے کہ اُس کی محبت دل میں نہ رکھو۔ ضرورت پوری کرنا الگ چیز ہے، اور دل میں اُس کی محبت رکھنا الگ چیز ہے۔

دنیا اور دل: پانی اور کشتی

کوئی کہے کہ دن میں چوبیس گھنٹے اس سے پالا پڑتا ہے، اس کے بغیر تو زندہ ہی نہیں رہ سکتے، تو اُس کی محبت دل میں کیسے نہیں ہوگی؟ تو مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، انہوں نے بہت اچھی مثال دی ہے کہ دیکھو! کشتی پانی کے بغیر چل ہی نہیں سکتی، کشتی کا چلنا پانی پر موقوف ہے، اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے نیچے پانی ہونا چاہیے، اگر پانی نہیں ہوگا تو کشتی چل نہیں سکتی۔ لیکن پانی باہر باہر ہی ہونا

چاہیے، اگر سوراخ ہو گیا اور پانی اندر آ گیا تو کشتی ہلاک ہو جائے گی۔ اسی طریقہ سے دنیا کے بغیر ہم زندہ نہیں رہیں گے، لیکن دنیا باہر باہر ہونی چاہیے، دل کے اندر نہیں چاہیے، اگر دل کے اندر ہم اس کو جگہ دیں گے، تو یہی دنیا ہم کو ہلاک و برباد کر کے رکھ دے گی۔ جب آدمی اُس کی محبت دل میں نہیں رکھے گا، بلکہ دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت رہے گی تو دنیا کو حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے حکم کو کبھی نہیں توڑے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہی کمائے گا، اور اس کے حکم کے مطابق ہی خرچ کرے گا، دنیا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ایک چھوٹے سے حکم کو بھی توڑنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔

آج کل ہم جو حیلے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں نا کہ مولوی صاحب! اس کا کوئی راستہ بننا چاہیے، یہ پریشانی اور دشواری ہے، اُس کے بغیر چلتا ہی نہیں، بیمہ تو کرانا ہی پڑے گا۔ تو میں سوال کرتا ہوں کہ کیا بیمہ کرانے سے دکان بچ جائے گی؟ اگر جلنے والی ہے تو وہ جل کر ہی رہے گی۔ درحقیقت دل میں ایسے سوالات جو پیدا ہوتے ہیں، اس کی وجہ دنیا کی محبت ہی ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی محبت ہوتی تو آدمی کے لیے ساری چیزیں آسان ہو جاتیں، اللہ تعالیٰ تھوڑی دیر کے لیے آزماتے ہیں۔

محمود و ایاز

حضرت محمود غزنویؒ کا ایاز نامی ایک غلام تھا، اُس سے اُن کو بڑی محبت تھی، اور لوگ کہتے تھے کہ ایک ادنیٰ غلام ہے اور اس کے ساتھ محمود غزنوی اتنی محبت کا معاملہ کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان کے پاس کہیں سے ایک بڑا قیمتی موتی آیا، دربار سجا ہوا تھا، انہوں نے وزیر اعظم صاحب سے کہا کہ یہ موتی توڑ دو۔ وہ نہیں سمجھا کہ بادشاہ امتحان لے رہے ہیں، اس لیے وزیر اعظم نے کہا کہ حضرت! یہ کیسے توڑ دوں، اتنا قیمتی موتی

ہے، اس نے نہیں توڑا۔ دوسرے سے کہا، تیسرے سے کہا لیکن کسی نے نہیں توڑا، آخر میں انہوں نے ایاز سے کہا کہ اس کو توڑ دو۔ اس نے ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کی اور زور سے نیچے دے مارا اور توڑ ڈالا۔ لوگ اس پر ہنسنے لگے کہ کتنا قیمتی موتی تھا، تم نے توڑ دیا؟ تو اُس نے کہا کہ ہاں! مجھ سے غلطی ہوگئی، لیکن اگر میں اس کو نہ توڑتا تو بادشاہ سلامت کا حکم ٹوٹتا، اور ان کا حکم اس موتی سے بھی زیادہ قیمتی ہے، اس لئے میں نے سوچا کہ بھلے ہی یہ موتی بڑا قیمتی کیوں نہ ہو، اور ساری دنیا اسے قیمتی سمجھتی ہو، لیکن اس سے زیادہ قیمتی تو بادشاہ کا حکم ہے جسے ٹوٹنے سے بچانے کے لئے مجھے اسے توڑنا پڑا۔ اُس وقت لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ محمود کو اس کے ساتھ جو محبت ہے اس کی وجہ کیا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت دل میں ہو، دنیا کی محبت سے دل خالی ہو۔ آج ہمارے لئے قدم قدم پر جو رکاوٹیں کھڑی ہیں اُس کی بنیاد یہی ہے۔ صحابہ کرامؓ کے لیے یہی ساری چیزیں آسان تھیں۔

یہ دل میں اُتارنے کی چیز نہیں

اور دیکھو! دنیا ضروری تو ہے لیکن اس کی محبت دل میں نہیں ہونی چاہیے، بعض لوگوں نے اس کی ایک اور مثال دی ہے۔ جیسے کسی نے شاندار قسم کا کوئی بنگلہ بنایا، اُس میں بیڈ روم بنایا، ڈرائنگ روم اور سٹنگ روم بنایا، لیکن بیت الخلاء نہیں بنایا۔ اس نے یوں سوچا کہ بدبودار چیز کو ایسے اعلیٰ بنگلے میں کیا بنانا۔ تو ظاہر ہے کہ جو بھی آئے گا وہ کہے گا کہ چاہے سب کچھ ہے، لیکن بیت الخلاء نہیں ہے، تو یہ بنگلہ ادھورا ہے۔ کسی بنگلے کے مکمل ہونے کے لئے بیت الخلاء ضروری ہے۔ وہ نہیں ہوگا تو یہ بنگلہ ناقص ہے ایک مکمل گھر کے لئے بیت الخلاء لازمی اور ضروری چیز ہے؛ لیکن کیا کوئی آدمی اپنے دل میں بیت الخلاء کی

محبت لیے پھرتا ہے کہ میں کب اپنے کام کاج سے فارغ ہوؤں اور وہاں جا کر آرام سے بیٹھوں؟ نہیں! بلکہ وہ ایک ضرورت کی چیز ہے، جس کے بغیر مکان مکمل نہیں ہوسکتا، اُس کے باوجود اُس کی محبت ذرہ برابر بھی دل میں نہیں ہوتی اور کبھی اُس کا خیال بھی نہیں آتا۔ اسی طرح دنیا کا حال بھی ہے کہ دنیا ایک ضروری چیز ہے، لیکن ایسی ہی ہے جیسا کہ بیت الخلاء ضروری ہوتا ہے کہ اُس کے بغیر آدمی زندگی نہیں گذار سکتا اور مکان بھی مکمل نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح دنیا کی یہ ساری چیزیں زندگی گذارنے کے لیے ضروری ہیں، لیکن دل میں اُتارنے کی چیز نہیں ہے، اس کی محبت ہی ساری رکاوٹ کی بنیاد ہے۔

چوٹ کر گیا

حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ بڑے بزرگ گذرے ہیں، ان کی فارسی زبان میں ''پندنامہ'' ایک کتاب ہے جو ہمارے مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ پہلے وہ تاجر اور دنیادار آدمی تھے، دوا فروش تھے، یونانی دوا کی بہت بڑی دوکان تھی اور خوشبوئیں بھی رکھتے تھے، اسی لئے عطار کہا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک درویش صفت آدمی آیا اور ایک شیشی اُٹھائی اس کو دیکھا، دوسری شیشی اُٹھائی اس کو دیکھا، تیسری شیشی اُٹھائی اس میں کچھ دیکھا، یہ ڈبیہ اٹھائی، وہ ڈبہ اُٹھایا۔ انہوں نے کہا: کیا بات ہے، کیا کچھ خریدنا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ انہوں نے کہا: جب کچھ خریدنا نہیں چاہتے تو یہ سب اُٹھا اُٹھا کر کیا دیکھ رہے ہو؟ اُس نے کہا: میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے اتنی ساری شیشیاں جمع کر رکھی ہیں، تمہاری روح کیسے نکلے گی؟ وہ تو ایک شیشی میں سے نکلے گی، دوسری شیشی میں پھنسے گی، دوسری سے تیسری میں جائے گی۔ انہوں نے کہا: جیسے تیری نکلے گی ویسے میری نکلے گی۔ اس نے کہا کہ دیکھو میری تو اس طرح نکلے

گی۔ اور ایک کونے میں جا کر لیٹا، لا الٰہ الا اللہ کہا اور مر گیا۔

اللہ تعالیٰ کبھی اپنے کسی بندہ کو اپنی طرف کھینچنا چاہتا ہے تو ایسے غیبی لطیفے ظاہر کر دیتا ہے۔ ان کے لیے بھی اللہ کے قرب اور اس کی رضامندی کے حصول کا وقت آ گیا تھا۔ بس! یہ واقعہ اُن کے دل پر چوٹ کر گیا اور تجارت چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے اور مقبولین میں شامل ہوئے۔

دل پر چوٹ لگ گئی

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے جی انہی چیزوں میں اٹکے ہوئے رہتے ہیں تو موت کے وقت یہی چیزیں سامنے آ جاتی ہیں۔ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں، پہلے وہ حاکم تھے، ان کی بڑی سلطنت تھی، اللہ تعالیٰ کو جب اُن کو اپنی طرف متوجہ کرنا منظور ہوا تو ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ اپنے محل میں اپنی اہلیہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں سنا کہ محل کی چھت کے اوپر سے کسی کے چلنے کی آواز آ رہی ہے۔ سوچنے لگے کہ ابھی اس وقت محل کی چھت کے اوپر کون ہوگا؟ کوئی چور آ گیا ہوگا۔ سنتریوں سے کہا کہ دیکھو کون ہے۔ اس کو پکڑ کر دربار میں پیش کیا گیا۔ پوچھا: کون ہو، اور اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ اُس نے کہا: میرا اونٹ گم ہو گیا ہے، میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔ انہوں نے کہا: پاگل آدمی ہو، کہیں اونٹ شاہی محل کی چھت پر تلاش کیا کرتے ہیں؟ اگر تلاش ہی کرنا ہے تو جنگل اور صحراء کے اندر جاؤ، وہاں تمہارا اونٹ ملے گا، شاہی محل کی چھت کے اوپر اونٹ تلاش کرنا تو پاگل پن اور بڑی حماقت کی بات ہے اُس نے کہا: جس طرح شاہی محل کی چھت پر اونٹ کا تلاش کرنا حماقت ہے، اسی طرح محل میں بیٹھ کر اللہ کو ڈھونڈنا بھی بڑی حماقت ہے۔ بس! یہ سن کر دل پر چوٹ لگ گئی،

سب سلطنت چھوڑ دی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

زُہد کی اہمیت

تو یہی زہد کی حقیقت ہے اور اس کی بڑی فضیلت آئی ہے، بلکہ ساری خوبیوں اور باطنی اوصاف کی جڑ یہی ہے۔ اسی لئے آپ نے فضائلِ صدقات کے دوسرے حصہ میں پڑھا اور سنا ہوگا کہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے زہد کی فضیلت کے لیے بڑے اہتمام سے مستقل ایک فصل قائم کی ہے اور اس میں زاہدوں کے قصے بتائے ہیں۔ آپ قرآن اور حدیث میں اور بزرگوں کے کلام میں بھی جگہ جگہ دیکھیں گے تو یہی ملے گا کہ یہ دنیا فانی اور ختم ہونے والی چیز ہے، اور بہت تاکید کے ساتھ اس کو بیان کیا گیا ہے۔ جتنی بھی برائیاں ہیں جیسے حسد، کینہ، بغض، لڑائی جھگڑے؛ یہ ساری برائیاں اسی دنیا کی محبت کی وجہ سے آتی ہیں، اسی کی خاطر سب کچھ ہوتا ہے، اس لئے اس کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔

یہاں باب قائم کیا ہے ''زہد فی الدنیا'' اور بہت ساری آیات پیش کی ہیں۔ دنیا سے بے رغبتی کی فضیلت، اور دنیا کو کم سے کم اختیار کرنے کی ترغیب۔ یعنی آدمی کو اپنی ضرورتیں تو پوری کرنی ہی ہیں، لیکن کوشش یہ کرے کہ اپنی ضرورتیں پوری کرنے میں جتنا کم سے کم ہوسکتا ہے اسی پر اکتفاء کرے، دنیا کو زیادہ حاصل نہ کرے۔ اگر زیادہ حاصل کرے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی کی حاجتیں اور خواہشات بڑھتی جائیں گی، پھر اس کی محبت بھی بڑھتی جائے اور قیمت بھی ادا کرنی پڑے گی۔

چار ملکوں کے گورنر کا مکان

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، اور رومیوں کے ساتھ جو آخری معرکہ ہوا، جس میں اسلام کو غلبہ ہوا، اس کے سپہ سالار یہی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

ان کو دمشق اور شام کا گورنر بنایا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام تشریف لے گئے، اُس زمانہ میں شام آج کے شام جتنا نہیں تھا، بلکہ فلسطین، شام، جورڈن اور لبنان؛ یہ کل چار ملک مل کر اس زمانہ کا شام کہلاتا تھا۔ اس کے گورنر حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادت یہ تھی کہ کسی کو جب کسی علاقے کا حاکم بناتے تھے، تو اس کا جائزہ بھی لیتے رہتے تھے، اس کے حالات کی اطلاع لیتے تھے کہ حاکم بننے کی وجہ سے اس میں کوئی تبدیلی تو نہیں آئی، کہیں دنیا کی محبت میں مشغول تو نہیں ہو گیا تو ایک مرتبہ خود شام تشریف لے گئے، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ان کے استقبال کے لیے آئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں ذرا آپ کا مکان دیکھنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا: کیوں دیکھو گے، آنسو بہانے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ملے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں! مجھے دیکھنا ہے۔ کہا: چلئے۔ جب دمشق کی پوری آبادی سے گذر کر باہر نکلے تو دیکھا کہ کھجور کی ٹہنیوں سے بنا ہوا ایک جھونپڑا ہے۔ جب اندر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک مصلیٰ بچھا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تمہارے پاس صرف یہ مصلیٰ ہی ہے، کوئی بستر بھی نہیں؟ اور کھانے کے لئے کوئی برتن بھی نہیں؟ انہوں نے کہا: یہ مصلیٰ جائے نماز کا بھی کام دیتا ہے، اور یہی میرا بستر بھی ہے، اسی پر سوتا ہوں۔ اور جھونپڑے کی چھت میں سے لکڑی کا ایک پیالہ نکالا اور کہا یہ میرا پیالہ ہے، اسی سے پیتا ہوں، اسی میں کھاتا ہوں، اس کے علاوہ اور کوئی سامان نہیں ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رونے لگے اور کہا: سب نے اپنی حالت میں تبدیلی کر لی، لیکن اللہ تعالیٰ تم کو جزائے خیر دے کہ تم اسی حالت پر ہو جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چھوڑا تھا۔ (سیر اعلام النبلاء)

فقر کا مطلب

اس باب میں فقر کی فضیلت بھی بیان کی ہے۔ فقر کا مطلب کیا ہے؟ فقر کا

مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے دل میں دنیا کی رغبت نہ رکھے۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ ایک آدمی کے پاس ظاہری اعتبار سے مال ودولت نہیں ہے لیکن دل دنیا کی محبت سے بھرا ہوا ہے تو اس سے زیادہ محروم کون کہا جا سکتا ہے کہ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ دنیوی اعتبار سے بھی مال ودولت نہیں ہے اور دل میں دنیا کی محبت بھری ہوئی ہے، تو آخرت سے بھی محروم رہا۔ اور دوسرا آدمی ایسا ہے جس کے پاس بہت دولت ہے، لیکن اس کا دل دنیا کی محبت سے خالی ہے، دنیا کی رغبت اس کے دل میں نہیں ہے، تو کوئی حرج کی بات نہیں، یہ مال ودولت اس کے لئے مضر نہیں۔

دنیوی زندگی کی مثال

باری تعالیٰ کا ارشاد پیش کیا ہے: ﴿إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلاً أَوْ نَهَاراً فَجَعَلْنَاهَا حَصِيداً كَأَن لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ. كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾ دنیوی زندگی کی مثال بارش کے اس پانی کی ہے جو ہم نے آسمان سے اتارا، اس کے ساتھ زمین کا سبزہ باہر نکل آیا (بارش کا پانی جب برستا ہے تو زمین پر سبزہ نکل آتا ہے، اور یہی جانوروں اور انسانوں کے کھانے کی مختلف چیزیں ہیں) یہاں تک کہ جب زمین نے اپنی رونق حاصل کرلی اور وہ مزین ہوگئی (یعنی اس سبزہ کی وجہ سے بڑی خوبصورت نظر آنے لگی) اور جن لوگوں نے یہ کھیتی باڑی بوئی تھی وہ یوں سمجھنے لگے کہ اب تو یہ بالکل تیار ہے اور ہم اس کو اپنے قابو میں لے چکے (باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) اسی درمیان ہمارا حکم آپہنچا (کوئی آسمانی آفت) دن میں یا رات میں

(آ گئی، یا گرم ہوا چلی، یا برف پڑی) تو ہم نے اس کو چورا چورا کر کے بالکل ایسا کر دیا کہ گویا کل یہاں کوئی چیز تھی ہی نہیں۔ ہم اسی طرح نشانیوں کو واضح کر کے پیش کرتے ہیں تا کہ لوگ سوچیں اور غور وفکر کریں۔

آدمی دنیا میں محنت اور کوشش کرتا ہے، بنگلے کھڑے کئے، کاریں اور فیکٹریاں بنائیں، سب لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک بہت بڑا سامراج قائم کیا ہے، لیکن ادھر آنکھ بند ہوئی کہ سارا معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ کہاں گیا؟ ایک دم سے سب کچھ غائب ہو جاتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ تو زندہ رہتا ہے اور یہ سب ختم ہو جاتا ہے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ دنیا باقی رہنے والی چیز نہیں ہے، پھر کیوں آدمی اپنی صلاحیت اور قوت اس کے اندر برباد کرے۔ آدمی کو چاہیے کہ ضرورت جتنا حاصل کرنے کے بعد اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو آخرت کے لئے استعمال کرے۔

فَضْلُ الزُّهْدِ فِي الدُّنْيَا وَالْحَثُّ عَلَى التَّقَلُّلِ مِنْهَا وَفَضْلُ الْفَقْرِ

دنیا کے معاملہ میں زہد اختیار کرنے کی فضیلت اور ساز وسامان میں کمی رکھنے کی ترغیب اور فقر کی فضیلت

مجلس ۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۲۸/شوال المکرم ۱۴۲۰ھ ۵/فروری ۲۰۰۰ء

دنیا سے بے رغبتی کا عنوان چل رہا تھا کہ آدمی اپنے دل میں دنیا کی محبت نہ رکھے، اس لیے کہ ساری خرابیوں کی جڑ یہی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بہت ساری آیتیں پیش کی ہیں۔ ایک آیت گذشتہ مجلس میں ہو چکی تھی۔

باقیات صالحات

آج دوسری آیت پیش کی ہے جس میں دنیوی زندگی کتنی قلیل ہے، اس کو بتلاتے ہیں ﴿وَاضۡرِبۡ لَهُم مَّثَلَ الۡحَيَاةِ الدُّنۡيَا كَمَآءٍ أَنزَلۡنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخۡتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الۡأَرۡضِ فَأَصۡبَحَ هَشِيمًا تَذۡرُوهُ الرِّيَاحُ وَكَانَ اللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٍ مُّقۡتَدِرًا. الۡمَالُ وَالۡبَنُونَ زِينَةُ الۡحَيَاةِ الدُّنۡيَا وَالۡبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيۡرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيۡرٌ أَمَلًا. (کہف: ۴۵-۴۶)﴾ اے نبی! آپ اُن کے سامنے دنیوی زندگی کی مثال پیش کیجئے: اُس پانی کی طرح جس کو ہم نے آسمان سے اُتارا (یعنی بارش) پھر اس کے ساتھ زمین کا سبزہ نکل آیا (بارش جب برستی ہے تو کھیتی اور دوسری سرسبز چیزیں بارش کی وجہ سے اُگ آتی ہیں اور وہ آدمی کو بہت اچھی اور بھلی بھی لگتی ہے، بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کتنے دنوں کے واسطے، چند دنوں کے بعد) پھر وہی سبزہ (جو نکلا تھا) سوکھ جاتا اور چورا چورا ہو جاتا ہے، اور ہوائیں اس کو اُڑا کر لے جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے {الۡمَالُ وَالۡبَنُونَ زِينَةُ الۡحَيَاةِ الدُّنۡيَا} یہ مال واولاد دنیوی زندگی کی زیب وزینت ہے، اور باقی رہنے والے نیک اعمال اللہ تعالیٰ کے یہاں ثواب کے اعتبار سے بھی بہت بہتر ہیں اور امید رکھنے کے اعتبار سے بھی یہی بہتر ہیں۔ آئندہ ذخیرہ رکھنے کے

اعتبار سے بھی زیادہ بہتر ہیں، آئندہ اس سے امید رکھی جاسکتی ہے۔ دنیا کا مال واسباب آدمی کتنا ہی جمع کرلے لیکن بہر حال ایک دن وہ چھوٹنے والا ہے۔

یہ مثال دے کر بتلانا چاہتے ہیں کہ یہ سب دنیوی زندگی کی ظاہری چمک دمک اور زیب وزینت ہے، اُس کی وجہ سے آدمی کو اس کی طرف مائل ہو کر آخرت کو نقصان پہنچانے کی ضرورت نہیں۔ یہ جو کچھ بھی نظر آرہا ہے، سب چندروزہ ہے۔ یا دنیا میں موت سے پہلے ہی ہاتھوں سے نکل جائے گا، یا اگر یہاں باقی رہا تو مرنے کے بعد خود ہی اس کو چھوڑ کر جانا ہے۔ ہمیشہ باقی رہنے والی چیز نہیں ہے۔ باقی رہنے والے تو نیک اعمال ہیں جو آدمی کرتا ہے۔

حدیث پاک میں ''باقیات الصالحات'' کی تشریح میں یہ بھی آیا ہے کہ اللہ کے ذکر کے طور پڑھی جانے والی تسبیحات – سبحان اللہ، الحمد اللہ، اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ – کا ثواب ہمیشہ باقی رہنے والا ہے (مؤطا مالک ۱۵/۷) اور دوسرے جتنے بھی نیک اعمال ہیں وہ سب باقیات الصالحات ہیں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بڑا اجر ملے گا۔ اس لیے جس سے آدمی امید اور آس لگائے وہ یہی چیزیں ہیں۔ باری تعالیٰ بھی فرماتے ہیں کہ اُمید لگانے کی چیزیں تو یہی ہیں۔ پیسہ تو ختم ہو جائے گا لیکن نیک اعمال جو ہم کریں گے، وہی آخرت میں کام آئیں گے، انہی سے کام بنے گا۔

لہو ولعب

ایک اور آیت میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا وَفِي الْآخِرَةِ

عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ. (الحدید:۲۰)﴾ جان لو کہ دنیا کی زندگی کھیل اور تماشہ ہے۔

چھوٹے چھوٹے بچے جو کھیل کھیلتے ہیں، جن کا کوئی مقصد اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا؛ ایسی چیز کو ''لَعِبٌ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور آدمی غم وفکر سے اپنے آپ کو نجات دلانے، طبیعت میں چستی پیدا کرنے اور طبیعت کو بہلانے کے لیے جو کوئی مشغلہ اختیار کرے؛ اس کو ''لَهْوٌ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں ذرا مقصد تو ہوتا ہے، لیکن یہ بھی وقت گزاری کی ہی ایک چیز ہے۔ تو دُنیوی زندگی کو لعب ولہو سے تعبیر کیا ہے۔

بچہ جب ایک دم چھوٹا ہوتا ہے، اس وقت جو کچھ کھیل کیا کرتا ہے؛ اس کو ''لعب'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور کچھ بڑا ہو کر اپنے آپ کو بہلانے کے لئے جو کچھ کھیلا کرتا ہے؛ اس کو ''لہو'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

﴿وَزِيْنَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ﴾ اور (دنیوی زندگی) زینت اور آپس میں ایک دوسرے سے فخر کرنا ہے۔ آدمی جب جوان ہوتا ہے تو عام طور پر اس کی طبیعت میں یہ ہوتا ہے کہ میں اچھا لباس پہنوں، اچھی سواری، اچھی کار، اچھا اسکوٹر استعمال کروں، اور میرا عمدہ مکان ہو۔ اور پھر ان چیزوں میں آپس میں فخر کرتا ہے کہ میرا لباس تمہارے لباس سے، میری کار تمہاری کار سے، میری سواری تمہاری سواری سے اچھی ہے، میرا مکان تمہارے مکان سے عمدہ ہے۔

زندگی میں تین مرحلے

آدمی کی زندگی میں تین مرحلے آتے ہیں۔ بچپن، جوانی اور بوڑھاپا۔ بچپن میں عام طور پر کھیل کود میں آدمی کا وقت گزرتا ہے، جس کو 'لعب ولہو' سے تعبیر کیا گیا۔

اور جوان ہونے کے بعد ''زینت وتفاخر'' میں مشغول ہوتا ہے یعنی ایسی چیزوں میں جو آدمی کی زینت کا باعث ہوتی ہیں، اور اسی پر آپس میں فخر کرتا ہے۔ اور جب عمر بڑی ہو جاتی ہے، بڑھاپا آتا ہے تو پھر ''تکاثر فی الاموال والاولاد'' یعنی مال واولاد کی زیادتی میں آپس میں ایک دوسرے پر فخر کیا جاتا ہے، اب یہ چیز دیکھی جاتی ہے کہ میرے پاس اتنا مال ہے، میری اتنی اولاد ہے۔ گویا دنیوی زندگی کے یہ تین دور ہیں جن کے اندر عام طور پر آدمی کی جو مرغوبات ہوتی ہیں ان کو اس آیت میں بیان کر دیا ہے۔

آگے باری تعالیٰ فرماتے ہیں: دنیوی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے بارش برسی اس سے جو کچھ بھی سبزہ وغیرہ ہوا، اس کو دیکھ کر کسان بہت خوش ہوتے ہیں، پھر اس میں کچھ نکھار اور رونق پیدا ہوتی ہے، پھر کچھ دنوں کے بعد وہی رونق پیلی پڑ جاتی ہے، اور کچھ دنوں کے بعد چورا چورا ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ گویا کھیتی کا پورا پروسیجر (procedure) ہے کہ دو تین چار مہینے میں معاملہ نمٹ جاتا ہے، کھیتی آدمی کو بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ چند روزہ ہے۔

بہرحال! اللہ تعالیٰ یہ بتلاتے ہیں کہ دنیوی زندگی کا بھی یہی حال ہے، آدمی کتنا ہی مال ودولت جمع کر لے، کتنی ہی چیزیں اپنے لیے حاصل کر لے اور بسا لے، چند دنوں کا معاملہ ہے۔ اس میں اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے تو پھر آخرت میں بڑا سخت عذاب ہے، اور اگر یہاں اطاعت اور فرمانبرداری کر رکھی تھی تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت بخشش اور خوشنودی عطا کی جائے گی۔ دنیا میں دو حال سے خالی نہیں، یا تو اللہ کو ناراض کرنے والے کام کئے ہیں تو سخت عذاب سے واسطہ پڑے گا، اور اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوگی، اور پھر کوئی کوتاہی ہوئی ہوگی تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے۔

رقیم، متاع اور تبارک

اور دنیا کی زندگی دھوکے کا سامان ہے۔ ''متاع'' اس چیز کو کہتے ہیں جس سے آدمی اپنی وقتی ضرورت پوری کرلیا کرے۔ ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک واقعہ بیان کرتے تھے۔ صاحب بن عباد جو لغت کے امام ہیں اور مؤرخ بھی ہیں وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے قرآنِ پاک کے تین لفظوں کی تحقیق مطلوب تھی، ایک تو لفظ "رَقِيمٌ" جو سورۂ کہف میں آیا ہے۔ دوسرا لفظ "تَبَارَكَ" جو سورۂ فرقان اور سورۂ ملک میں ہے اور تیسرا لفظ "مَتَاعٌ"۔ اور ان کی عادت تھی کہ وہ دیہاتوں اور اعراب کے علاقوں میں پہنچ جاتے جہاں خالص عربی زبان بولی جاتی تھی اور ان کی زبان سنتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں ایک جگہ پہنچا تو دیکھا کہ گھر والے نہیں ہیں اور ایک بچہ بیٹھا ہوا ہے اتنے میں ایک کتا آیا اور وہ کپڑا جو چولہے پر ہنڈیا وغیرہ پکڑنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اس کو اپنے منہ میں اٹھا کر چلا گیا اور قریب ہی پہاڑ کی چوٹی تھی اس پر جا کر پاؤں پھیلا کر اچھی طرح سے براجمان ہو کر بیٹھ گیا۔ جب گھر والے آئے تو اس بچے نے سارا منظر جو دیکھا تھا وہ اس طرح بیان کیا: "جَآءَ الرَّقِيمُ وَأَخَذَ الْمَتَاعَ وَتَبَارَكَ الْجَبَلَ" رقیم یعنی کتا آیا اور متاع یعنی وہی کپڑا (صافی، جو قیمتی نہیں ہوا کرتا لیکن اس کے بغیر کام بھی نہیں چلتا) اُٹھایا اور پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا (تفسیر حقی۔ ۷/۳۲۲) بتلانا یہ ہے کہ اس کپڑے کی کوئی قیمت نہیں، لیکن کوئی کچن اور باورچی خانہ اس سے خالی بھی نہیں، اس لئے کہ اس کے بغیر کام بھی نہیں چلتا ہے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ ضرورت کی چیز ہے، لیکن اس کی کوئی حیثیت اور قیمت نہیں ہے، اس لئے اس میں آدمی کو دل نہیں لگانا چاہیے۔ اگر

اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے احکام توڑے، اور اللہ تعالیٰ سے اپنا جیسا رشتہ قائم کرنا چاہیے وہ نہ کرے؛ تو یہ تو اور زیادہ خطرناک بات ہے۔

استعمال کا سامان

آگے ایک اور آیت پیش کی ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ.ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ. (آل عمران: ۱۴)﴾ لوگوں کے لیے چیزوں کی محبت مزین کردی گئی (یعنی اللہ تعالیٰ نے قدرتی اور فطری طور پر انسان کے دل کے اندر ان چیزوں کو مرغوب بنایا ہے۔ یعنی) عورتیں، لڑکے، سونے اور چاندی کے سجائے ہوڈھیر، نشان لگے ہوئے گھوڑے، جانور اور کھیتی (یہ ساری چیزیں ایسی ہیں کہ قدرتی طور پر انسان کے دل میں ان کی محبت ہوتی ہے) جیسا کہ حضرت عمرؓ نے باری تعالیٰ سے عرض کیا: اے اللہ! انسان کے دل میں ان چیزوں کی تو نے محبت ڈالی ہے، لیکن ہم اُس کو تیری رضا کے ساتھ حاصل کریں، اور تیری رضا کے مطابق استعمال کریں، اس کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ (بخاری شریف، ۶۴۴۰)

تو ان چیزوں کی محبت فطری ہے، لیکن باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ دنیوی زندگی کے استعمال کا سامان، ضرورت اور برتنے کی چیز ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں اور اچھا ٹھکانہ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہیے کہ اپنے لیے اچھا ٹھکانہ حاصل کرنے کی کوشش کرے، اور دنیوی زندگی کے دھوکہ میں نہ آئے۔

دنیا کی زندگی دھوکہ میں نہ ڈالے

اور ایک آیت پیش کی ہے: ﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ

الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ. (فاطر:۵)﴾ اے لوگو! اللہ کا وعدہ (کہ دنیا ختم ہوگی قیامت آنے والی ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور اعمال کا جواب دینا ہے، یہ سب) ایک حقیقت ہے (یہ نہ سمجھنا کہ یہ سب ایسا ہی ہے، بلکہ یہ سب ہونے والا ہے) اس لئے دنیا کی زندگی تم کو دھوکہ میں نہ ڈالے۔ یعنی دنیا کی زندگی میں پڑ کر یہ مت بھول جانا کہ دوبارہ پیدا ہونا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے، اپنے اعمال کا حساب کتاب ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں تم کو شیطان دھوکہ میں نہ ڈال دے۔ شیطان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ آدمی دنیا میں ایسا رچ بس جائے اور اس کے اندر ایسا مرکھپ جائے کہ آخرت کو فراموش ہی کر دے۔ اس لیے باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دیکھو! شیطان کے دھوکے میں نہ آنا، اس کی کوشش تو یہی ہوگی کہ وہ تمہیں ایسی چیزوں میں مشغول کر دے جو تمہارے لئے نقصان کا باعث ہو۔

اور مفسرین نے لکھا ہے کہ شیطان کا دھوکہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ کے کاموں میں ڈال کر یہ اُمید دلاتا رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو بہت معاف کرنے والے ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں مبتلا ہیں وہ یہی سمجھ کر کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی (باب المراقبہ، جلد نمبر ۲، حدیث نمبر ۶۶ کے ذیل میں) بتلا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں معافی کا ایک قاعدہ ہے، اس لیے شیطان کے اس دھوکہ میں آکر گناہوں اور نافرمانیوں میں نہ لگے، اور دنیا کی محبت کے پیش نظر آخرت سے غافل نہ ہو جائے۔

تم کو غفلت میں ڈال دیا

ایک اور آیت پیش کی ہے ﴿أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ. حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ. كَلَّا

سَوْفَ تَعْلَمُونَ۔ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ۔ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ﴾ مال و دولت کی زیادتی نے تم کو غفلت میں ڈال دیا (جب آدمی کے پاس مال و دولت آتا ہے، تو اس کو زیادہ حاصل کرنے کی فکر میں اللہ تعالیٰ اور آخرت کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے، اور یہ سلسلہ اس کی زندگی میں جاری رہتا ہے) یہاں تک کہ تم قبروں کی زیارت کر لو گے (یعنی موت تک آدمی اس میں لگا رہتا ہے کہ میں مال اور بڑھا لوں، اس میں کسی نہ کسی طرح اضافہ کرلوں، اور اس میں وہ ایسا مشغول ہو جاتا ہے کہ موت آجاتی ہے) ایسا نہ ہو، اور ہرگز ایسا نہیں ہونا چاہیے، تم کو معلوم ہوگا اور پھر یقین کے ساتھ معلوم ہوگا۔ (یعنی گویا وہاں جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بہلاوا نہیں ہے، بلکہ حقیقت ہے کہ آخرت کا معاملہ پیش آنے والا ہے۔

آخرت کا گھر ہی ہمیشہ کی زندگی ہے

ایک اور آیت ہے ﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ۔ (العنکبوت:۶۴)﴾ دنیا کی یہ زندگی ایک تماشہ اور کھیل ہے (کہ تھوڑی دیر کے لئے آدمی تماشہ دیکھتا ہے اور دل بہل جاتا ہے اور پھر تماشہ ختم ہو جاتا ہے، سب کچھ خواب و خیال کی طرح ایک چیز ہو جاتی ہے) اور آخرت کا گھر ہی ہمیشہ کی زندگی ہے، کاش کہ لوگ جانتے (لیکن عام طور پر لوگ اس سے غافل ہیں)۔

بہر حال! قرآنِ پاک میں بے شمار آیتیں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے مختلف طریقوں سے انسانوں کو یہ بتلایا ہے کہ دنیا کی زندگی چند روزہ ہے، اور آخرت ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، اس لئے آدمی کو چاہیے کہ آخرت کی تیاری کرے۔ دنیا بقدر ضرورت حاصل کرے اور اس کے حاصل کرنے کے لئے کوئی ایسا کام نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کو

ناراض کرنے والا ہو۔

آگے اس سلسلے میں روایتیں لاتے ہیں، ان سب کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کو اپنے دل میں دنیا کی محبت نہیں رکھنی چاہیے۔

حضور کو اندیشہ

۴۵۷-عن عمرو بن عوف الانصاری رضی اللہ عنہ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بَعَثَ أَبَا عُبَيْدَةَ بنَ الجَرَّاحِ إِلَى الْبَحْرَيْنِ يَأْتِي بِجِزْيَتِهَا، فَقَدِمَ بِمَالٍ مِنَ الْبَحْرَيْنِ، فَسَمِعَتِ الأَنصَارُ بِقُدُومِ أَبِي عُبَيْدَةَ، فَوَافَوْا صَلَاةَ الْفَجْرِ مَعَ رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم. فَلَمَّا صَلَّى رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انْصَرَفَ، فَتَعَرَّضُوا لَهُ، فَتَبَسَّمَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حِينَ رَآهُمْ، ثُمَّ قَالَ: أَظُنُّكُمْ سَمِعْتُمْ أَنَّ أَبَا عُبَيْدَةَ قَدِمَ بِشَيْءٍ مِنَ الْبَحْرَيْنِ؟ فَقَالُوا: أَجَلْ، يَا رَسُولَ اللهِ. فَقَالَ: أَبْشِرُوا وَأَمِّلُوا مَا يَسُرُّكُمْ. فَوَاللهِ مَا الْفَقْرَ أَخْشَى عَلَيْكُمْ، وَلٰكِنِّي أَخْشَى أَنْ تُبْسَطَ الدُّنْيَا عَلَيْكُمْ كَمَا بُسِطَتْ عَلَى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، فَتَنَافَسُوهَا كَمَا تَنَافَسُوهَا، فَتُهْلِكَكُمْ كَمَا أَهْلَكَتْهُمْ. (متفق علیہ)

ترجمہ:-حضرت عمرو بن عوف انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو بحرین بھیجا تاکہ لوگوں کے اوپر جو جزیہ مقرر کیا گیا تھا وہ وصول کرکے لاویں۔ چناں چہ بحرین سے وہ جزیہ کے طور پر مال کی ایک بڑی مقدار لے کر آئے (کہتے ہیں کہ ایک لاکھ درہم لے کر آئے تھے اور اتنی بڑی رقم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں آئی تھی، یہ پہلا موقع تھا کہ مال کی اتنی بڑی مقدار جزیہ کے طور پر آئی تھی۔ رات کے وقت وہ آئے تھے اور راتوں رات یہ بات مدینہ منورہ میں پھیل گئی کہ ابوعبیدہ بحرین سے جزیہ کی بڑی مقدار وصول کرکے لائے ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ ساری رقم مسلمانوں میں تقسیم ہونے والی تھی، جب رات ہی مدینہ میں یہ بات پھیل گئی اور) انصار نے بھی سنا تو فجر کی نماز میں سب مسجد نبوی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس

آ گئے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فجر کی نماز سے فارغ ہو کر واپس ہو رہے تھے تو صحابہ کرامؓ اپنے آپ کو حضور کے سامنے پیش کرنے لگے، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو دیکھا تو آپ مسکرائے، اور ارشاد فرمایا کہ میرا خیال یہ ہے کہ تم لوگوں نے یہ بات سن لی کہ ابوعبیدہ بحرین سے مال لے کر آئے ہیں۔ انہوں نے جواب میں کہا: جی ہاں اے اللہ کے رسول! ایسا ہی ہے۔ تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خوشخبری سن لو اور اپنے آپ کو اُمید دلاؤ اُس چیز کی جو خوش کرنے والی ہے، لیکن (ایک بات یاد رکھو) اللہ کی قسم! مجھے تمہارے متعلق فقر کا اتنا اندیشہ نہیں ہے جتنا ڈر اور اندیشہ اس بات کا ہے کہ تمہارے اوپر دنیا پھیلا دی جائے، جیسے تم سے پہلی اُمتوں کو دی گئی تھی، پھر تم اُس کو حاصل کرنے کے لیے آپس میں اسی طرح ایک دوسرے کے مقابلہ پر اور ایک دوسرے کی ریس میں آجاؤ جیسے کہ وہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلہ پر آتے تھے۔ پھر یہ دنیا تم کو اُسی طرح ہلاک کر دے جس طرح اُن کو ہلاک کیا تھا۔

افادات:- بحرین والوں کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صلح ہوئی تھی اور ان پر جزیہ مقرر کیا تھا، اسی کو وصول کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کو جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں بھیجا۔

میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ مدینہ منورہ کے مختلف محلے تھے، اور عام طور پر صحابہ کرامؓ فجر کے بعد اطمینان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آتے تھے، اور وہ حضرات ظہر وعصر کی نماز میں آپ کے ساتھ شریک ہوتے تھے، عصر کی نماز کے بعد پھر اپنے اپنے محلوں میں چلے جاتے تھے اور مغرب، عشاء اور فجر وہیں ہوتی تھی۔ البتہ جو حضرات مسجد نبوی کے آس پاس آباد تھے وہ تمام نمازیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مسجد نبوی میں ادا کرتے تھے۔ لیکن اس روز وہ لوگ بھی- جو اپنے محلوں میں فجر کی نماز پڑھنے کے عادی تھے- مسجد نبوی میں پہنچ گئے کہ فجر کے بعد مال تقسیم ہوگا، جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

فجر کی نماز سے فارغ ہو کر واپس ہو رہے تھے تو صحابۂ کرام نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو حضور کے سامنے پیش کیا کہ ہمیں دیکھیں گے تو یاد آ جائے گا۔ جب نبی کریم ﷺ نے ان کو دیکھا تو آپ مسکرائے کہ روزانہ تو فجر کی نماز اپنے اپنے محلوں میں پڑھتے ہیں، اور آج یہاں آئے۔ اصل بات آپ سمجھ گئے۔ آپ ﷺ نے مسکرا کر ارشاد فرمایا کہ میرا خیال یہ ہے کہ تم لوگوں کو پتہ چل گیا ہے کہ ابوعبیدہ بحرین سے مال لے کر آئے ہیں؟ انہوں نے کہا: جی ہاں اے اللہ کے رسول! ایسا ہی ہے۔ انہوں نے کوئی بات چھپائی نہیں۔ ہم لوگوں کی تو عادت ہوتی ہے، اگر ہماری بات پکڑی جائے تو کہنے لگتے ہیں کہ نہیں حضرت! ایسا نہیں ہے، میں تو ویسے ہی آ گیا تھا، یہاں آ کر مجھے پتہ چلا۔ لیکن انہوں نے سچی سچی بات بتلا دی کہ ہاں اے اللہ کے رسول! ہمیں رات کو معلوم ہوا کہ ابوعبیدہ مال لے کر آئے ہیں، اسی لئے آج فجر کی نماز میں ہم یہاں آ گئے۔

فقر سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا

حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: خوشخبری سن لو اور اپنے آپ کو اُمید دلاؤ اُس چیز کی جو خوش کرنے والی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم جو اُمید لے کر آئے ہو وہ پوری ہونے والی ہے، مَیں مال تقسیم کروں گا اور سب کو ملے گا اور تم جس مقصد کے لئے آئے ہو وہ حاصل ہو جائے گا، لیکن ایک بات یاد رکھو، اللہ کی قسم! تمہارے متعلق مجھے فقر کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ یعنی اگر تم کو فقر و فاقہ آ جائے، اُس کی وجہ سے مجھے اتنا ڈر نہیں، جتنا ڈر اور اندیشہ اس بات کا ہے کہ تمہارے اوپر دنیا پھیلا دی جائے، اور دُنیا کی مال و دولت تم کو اس کثرت سے دی جائے جیسے تم سے پہلی اُمتوں کو دی گئی تھی، پھر تم اس کو حاصل کرنے کے لیے آپس میں اسی طرح ایک دوسرے کے مقابلہ اور ریس میں آ جاؤ

جیسے کہ وہ لوگ کرتے تھے۔ اور جب دنیا حاصل کرنے کے لیے مقابلہ ہوگا تو آپس میں دشمنیاں پیدا ہوں گی اور قتل وقتال ہوگا، رشتہ داروں کے حقوق ضائع ہوں گے، اور دیگر گناہوں میں ابتلاء ہوگا۔ پھر یہ دنیا تم کو اُسی طرح ہلاک کردے گی جس طرح اُن لوگوں کو ہلاک کیا تھا۔ گویا نبی کریم ﷺ نے بتلادیا کہ فقر وفاقہ کی وجہ سے تمہارے دین پر مجھے اتنا خطرہ نہیں جتنا مال ودولت کی وجہ سے ہے۔ فقر وفاقہ میں تمہارا دین اتنا برباد نہیں ہوگا جتنا مال ودولت کی وجہ سے ہوگا، مال ودولت اور دنیا کی کشادگی حاصل کرنے کے لیے جب آپس میں حقوق ضائع ہوتے ہیں، اس سے دین کو جو نقصان پہنچتا ہے، اتنا فقر سے نہیں پہنچتا۔

دنیا کی زیب وزینت کا ڈر

۴۵۸۔ عن أبي سعيد ن الخدري رضی اللہ عنہ قَالَ: جَلَس رَسُوْلُ اللهِ ﷺ علی الْمِنْبَرِ، وَجَلَسْنَا حَوْلَهُ فقَالَ: إِنَّ مِمَّا أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِیْ مَايُفْتَحُ عَلَيْكُمْ مِنْ زَهْرَةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتِهَا۔ (متفق علیه)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ منبر پر کچھ ارشاد فرمانے کے لئے تشریف فرما ہوئے اور ہم آپ کے آس پاس بیٹھ گئے، آپ ﷺ نے اپنی اس تقریر میں یہ ارشاد فرمایا: مجھے اپنے بعد تم پر جس چیز کا ڈر ہے وہ یہ ہے کہ تم پر دُنیا کی زیب و زینت کھولی جائے گی۔

افادات:- میرے بعد ملک فتح ہوں گے اور دنیا کی دولت اور زیب و زینت تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھولی جائے گی اور اس کے نتیجے میں دنیا کو حاصل کرنے کے لئے آپس میں مقابلے ہوں گے اور بندوں کے حقوق ضائع ہوں گے

اور دین کو نقصان پہنچے گا اس کا مجھے ڈر ہے۔ گویا پہلے سے نبی کریم ﷺ نے متنبہ کر دیا۔

دنیا شیریں اور سرسبز ہے

۴۵۹- وعنه أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: إِنَّ الدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ وَإِنَّ اللهَ تَعَالٰى مُسْتَخْلِفَكُمْ فِيْهَا، فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ. فَاتَّقُوا الدُّنْيَا وَاتَّقُوا النِّسَآءَ.

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: دنیا شیریں، سرسبز وشاداب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تم کو اس دنیا کی حکومت میں دوسروں کا جانشین بنائے گا اور پھر تمہیں آزمائے گا کہ تم کیا کرتے ہو۔ دُنیا کے فتنے سے بچو اور عورتوں کے فتنے سے بھی بچو۔

افادات:- (۱) ''شیریں، سرسبز وشاداب'' کا مطلب یہ ہے کہ دیکھنے میں بھی بھلی معلوم ہوتی ہے اور استعمال کرنے میں بھی اچھی لگتی ہے، دنیا میں یہ دونوں باتیں ہیں۔

(۲) ''اللہ تعالیٰ تم کو دنیا کی حکومت میں دوسروں کا جانشین بنائے گا'' یعنی آج تو دنیا کی حکومتیں دوسرے لوگوں کے پاس ہیں، لیکن ایک وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں مسلمانوں کو اقتدار اور حکومت عطا فرمائے گا۔ چناں چہ بعد میں تمام ممالک فتح ہوئے، مسلمانوں کے ہاتھوں میں حکومت آئی اور پوری دنیا پر قبضہ نصیب ہوا۔

(۳) ''آزمائے گا کہ تم کیا کرتے ہو'' یعنی دنیا جو دی جائے گی وہ تمہارے لیے آزمائش ہوگی کہ اس دنیا کے ملنے کے بعد تم اللہ تعالیٰ کے احکام پر کتنا عمل کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی کتنی خلاف ورزی کرتے ہو۔

بربادی لانے والی دو چیزیں

یہی دو چیزیں ''مال اور عورتیں'' ہیں جن کے نتیجے میں کہ عام طور پر آدمی برباد ہوتا ہے، اس لیے دنیا کے معاملہ میں بھی نبی کریم ﷺ نے ہدایتیں عطا فرمائی ہیں کہ

اللہ تعالیٰ کے حکم کو باقی رکھتے ہوئے، اس کی مرضی کے مطابق شریعت کے بتلائے ہوئے جائز طریقہ سے حاصل کی جائے، اور صحیح طریقہ سے حاصل ہونے کے بعد خرچ کرنے کے لیے بھی شریعت کا بتلایا ہوا طریقہ اختیار کیا جائے۔ گویا کمانا بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کے ساتھ ہونا چاہیے اور خرچ بھی اس کی رضا کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔

اس طرح عورتوں کے معاملہ میں شریعت نے ہدایتیں فرمائی ہیں کہ ان سے احتیاط کیا جائے، غیر محرم سے اپنے آپ کو روکا جائے، حجاب پردہ کے احکام کی ساری تفصیل شریعت میں اسی لئے بتلائی گئی ہے۔ ان ساری چیزوں کا اگر آدمی اہتمام کرے گا تب ہی عورتوں کے فتنے سے اپنے آپ کو بچا سکے گا، اور اگر ایسا نہیں کرے گا تو پھر خطرہ ہے کہ عورت کے فتنے میں مبتلا ہو جائے گا۔

حقیقی زندگی تو آخرت کی ہے

۴۶۰ - وعن أَنَسٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَبِيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: أللّٰهُمَّ لاَعَيْشَ إِلَّاعَيْشَ الْاٰخِرَةِ ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حقیقی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

افادات:- اس لئے آدمی کو آخرت ہی کے لیے اپنی صلاحیتیں استعمال کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے جو قوتیں دی ہیں وہ آخرت کی زندگی سنوارنے اور بنانے کے لئے استعمال کرے۔ اگر آدمی اپنی صلاحیت دنیا کے لیے استعمال کرے گا تو گویا یہ اپنی صلاحیتوں کو برباد کرنا ہوا۔

میت کے ساتھ تین چیزیں

۴۶۱-وعنه عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: يَتْبَعُ الْمَيِّتَ ثَلاَثَةٌ: أَهْلُهُ وَمَالُهُ

وَعَمَلُهُ. فَيَرْجِعُ اثْنَانِ وَيَبْقَى وَاحِدٌ، يَرْجِعُ أَهْلُهُ وَمَالُهُ وَيَبْقَى عَمَلُهُ.

ترجمہ:- حضرت انس ؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی کا جب انتقال ہوتا ہے تو اس کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں؛ ایک تو اس کے گھر والے، دوسرے اس کا مال، اور تیسرے اس کے اعمال۔ (جب آدمی کو قبر میں اُتار دیا جاتا ہے تو) دو تو واپس لوٹ جاتے ہیں اور ایک اس کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کے اعزہ واقرباء اور مال تو واپس آجاتا ہے لیکن اعمال اس کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔

افادات:- آدمی جب مرتا ہے اور اُس کا جنازہ اُٹھا کر لے جایا جاتا ہے، تو رشتہ دار، اولاد اور دوسرے اعزہ واقرباء ساتھ جاتے ہیں، اور مال بھی جاتا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زمانہ میں یہ دستور تھا کہ آدمی جو مال چھوڑ کر مرتا تھا وہ بھی قبر تک ساتھ لے جایا جاتا تھا، پھر واپس لایا جاتا تھا، اگرچہ اب وہ دستور نہیں رہا لیکن کچھ نہ کچھ چیزیں ساتھ جاتی ہی ہیں، مثلاً جنازہ۔ پہلے زمانہ میں ایسا ہوتا تھا کہ جس چارپائی پر آدمی کو قبرستان لے جایا جاتا تھا وہ خود اسی کی ہوتی تھی، آج کل چارپائی کے بجائے جنازے ہوتے ہیں اور وہ مسجد سے لائے جاتے ہیں، لیکن پھر بھی نیچے بچھانے کے لئے چادر گھر کی ہی ہوتی ہے۔ اب تو وہ بھی مسجد کی ہونے لگی ہے۔ خیر کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ مال آدمی کے ساتھ جاتا ہے۔ اور اعمال اس کے ساتھ جاتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں جب آدمی کو قبر میں اُتار دیا جاتا ہے، تو اس کے اعزہ واقرباء اور مال تو واپس آجاتا ہے لیکن اعمال اس کے ساتھ ہی رہتے ہیں، اس لئے جو چیز ساتھ رہنے والی ہو اسی کو درست کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ اگر مال اور اولاد کے لئے ہی آپ نے ساری محنتیں کیں اور اپنی صلاحیتوں کو اسی میں ضائع کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہوئے تو پھر اس کو بھگتنا پڑے گا۔

جنت وجہنم کا غوطہ

۴۶۲- وعَنْهُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: يُؤْتَى بِأَنْعَمِ أَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ أَهْلِ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فيُصْبَغُ فِي النَّارِ صَبْغَةً، ثُمَّ يُقَالُ: يَا ابْنَ آدَمَ، هَلْ رَأَيْتَ خَيْراً قَطُّ؟ هَلْ مَرَّ بِكَ نَعِيمٌ قَطُّ؟ فَيَقُوْلُ: لاَ وَاللّٰهِ يَا رَبِّ. وَيُؤْتَى بِأَشَدِّ النَّاسِ بُؤْساً فِي الدُّنْيَا مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فيُصْبَغُ صَبْغَةً فِي الْجَنَّةِ، فَيُقَالُ لَهُ: يَا ابْنَ آدَمَ، هَلْ رَأَيْتَ بُؤْساً قَطُّ؟ هَلْ مَرَّ بِكَ شِدَّةٌ قَطُّ؟ فَيَقُوْلُ: لاَ وَاللّٰهِ، مَا مَرَّ بِي بُؤْسٌ قَطُّ، وَلاَ رَأَيْتُ شِدَّةً قَطُّ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت انسؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز جہنمیوں میں سے ایسے آدمی کو لایا جائے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ آرام اور عیش وعشرت میں تھا اور جہنم میں ایک غوطہ لگایا جائے گا اور پھر اس سے سوال ہوگا: اے انسان! کبھی تو نے کوئی راحت دیکھی؟ کبھی کوئی نعمت یا عیش وعشرت کی کوئی چیز تیرے اوپر سے گذری؟ تو وہ قسم کھا کر کہے گا: میں نے کبھی کوئی راحت دیکھی ہی نہیں۔ اور جنتیوں میں سے ایسے آدمی کو لایا جائے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ تکلیف مشقت اور دُکھ میں تھا۔ اس کو بھی جنت کے اندر ایک غوطہ لگا کر پوچھا جائے گا کہ کیا کبھی تو نے کوئی دکھ دیکھا ہے؟ کبھی کوئی تکلیف تیرے اوپر آئی ہے؟ تو وہ قسم کھا کر کہے گا کہ نہیں اللہ کی قسم! کبھی کوئی دکھ اور کوئی تکلیف میں نے دیکھی ہی نہیں۔

افادات:-غوطہ لگانے میں کتنی دیر لگتی ہے؟ ایک سانس کے برابر ذراسی دیر ہوتی ہے، اس غوطہ کے درمیان آدمی دوسرا سانس نہیں لے سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ ذراسی دیر کے لئے رکھا جائے گا۔ پہلے آدمی نے دنیا کی پوری زندگی بڑے عیش وآرام میں گزاری تھی، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کی تھیں اور جہنمی بنا تھا تو جہنم میں ایک

غوطہ کھانے کے بعد اس کا حال یہ ہوگا کہ دنیا کی زندگی کے سارے عیش وآرام اور راحتیں بھول کر کہے گا کہ میں نے کبھی راحت دیکھی ہی نہیں کہ راحت کس چڑیا کا نام ہے۔ اور دوسرے آدمی نے کبھی کوئی عیش وآرام اور راحت نہیں دیکھی، اس کی پوری زندگی دکھ اور تکلیف میں گزری تھی لیکن وہ اتنی سی دیر میں سب دُکھ بھول جائے گا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ بھائی! دنیا کی زندگی کی راحت وآرام اور اس کے عیش وعشرت کے لئے آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کرے اور عذاب مول لے: یہ بڑی خطرناک چیز ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔

دنیا اور آخرت کا موازنہ

۴۶۳- وعَنِ الْمُسْتَوْرِدِ بن شَدَّاد رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مَا الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مِثْلُ مَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ إِصْبَعَهُ فِي الْيَمِّ، فَلْيَنْظُرْ بِمَ يَرْجِعُ.!

ترجمہ:- حضرت مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دنیا کی حیثیت آخرت کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے ایک انگلی دریا میں ڈالیں اور باہر نکالیں پھر دیکھیں کہ اس انگلی پر کتنا پانی آیا۔

افادات:- اس انگلی پر جو پانی آرہا ہے، اس کی حیثیت دریا کے مقابلہ میں کیا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی حیثیت اتنی ہی ہے، بلکہ یہ بھی صرف سمجھانے کے لئے ہے، ورنہ دنیا تو ختم ہونے والی، اور آخرت باقی رہنے والی ہے، آخرت کی نعمتیں ہر اعتبار سے باقی رہنے والی ہیں، اور کوالیٹی (Quality) اور کونٹیٹی (Quantity) دونوں اعتبار سے وہ دنیا سے بہتر ہی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ دنیا کی حیثیت آخرت کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے تم اپنا کوڑا زمین پر ڈالو، تو وہ

کتنی جگہ روکے گا؟ اتنی بھی قیمت آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی نہیں ہے؛ تو اب اس دنیا کی خاطر آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کیوں کرے؟

ساری حدیثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ اپنے دل میں دنیا کی محبت کو جگہ نہ دے کہ اسی کے نتیجہ میں اس کو حاصل کرنے کے لئے آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں پر اُتر آتا ہے۔ دنیا کی محبت ہی جب دل سے نکل جائے گی پھر اس کی نوبت نہیں آئے گی۔

دنیا کی حقیقت یہ ہے

۴۶۴- وعن جابر رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مَرَّ بِالسُّوْقِ وَالنَّاسُ كَنَفَتَيْهِ، فَمَرَّ بِجَدْيٍ أَسَكَّ مَيِّتٍ، فَتَنَاوَلَهُ فَأَخَذَ بِأُذُنِهِ، ثُمَّ قَالَ: أَيُّكُمْ يُحِبُّ أَنْ يَكُوْنَ هٰذَا لَهُ بِدِرْهَمٍ؟ فَقَالُوا: مَا نُحِبُّ أَنَّهُ لَنَا بِشَيْءٍ وَمَا نَصْنَعُ بِهِ؟ ثُمَّ قَالَ: أَتُحِبُّوْنَ أَنَّهُ لَكُمْ؟ قَالُوا وَاللهِ لَوْ كَانَ حَيًّا كَانَ عَيْباً، إِنَّهُ أَسَكُّ؛ فَكَيْفَ وَهُوَ مَيِّتٌ! فَقَالَ: فَوَاللهِ لَلدُّنْيَا أَهْوَنُ عَلَى اللهِ مِنْ هٰذَا عَلَيْكُمْ.

قوله: (كَنَفَتَيْهِ) أَيْ: عَنْ جانبيه. وَ(الأَسَكُّ) الصَّغِيْرُ الأُذُن

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مرتبہ بازار سے گزرے، لوگ آپ کی دونوں طرف چل رہے تھے۔ آپ کا گزر بکری کے مرے ہوئے ایک ایسے بچے کے پاس سے ہوا جو چھوٹے چھوٹے کان والا تھا (اور چھوٹے کان والی بکری ویسے ہی ان کے یہاں کم قیمت سمجھی جاتی تھی) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مرے ہوئے بچے کا کان پکڑ کر اٹھایا اور فرمایا کہ کون اس بات کو پسند کرتا ہے کہ یہ بچہ اس کو ایک درہم میں مل جائے۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! معمولی چیز دے کر بھی لینا کوئی پسند نہیں کرے گا، اس لئے کہ اس کو

لے کر کیا کریں گے؟ تو حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ یہ تم کو مل جائے؟ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر یہ زندہ ہوتا تب بھی اس کے کان چھوٹے ہونے کی وجہ سے معمولی قیمت میں بھی ہم اس کو لینا پسند نہ کرتے، اب جبکہ وہ مر چکا ہے، کوئی حیثیت اور قیمت ہی نہیں رہی۔ تو حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا (دیکھو! بکری کا یہ بچہ تمہاری نگاہوں میں کیسا بے قیمت ہے کہ تم لینے کے لئے بالکل تیار نہیں ہو، تو) اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں دنیا اس سے بھی زیادہ بے قیمت ہے۔

افادات:- نبی کریم ﷺ مختلف مثال اور نمونے پیش کر کے صحابہ کرامؓ اور اپنی اُمت کے دلوں میں دنیا کی بے رغبتی بٹھانا چاہتے ہیں اور دنیا کی محبت سے دلوں کو خالی کرنا چاہتے ہیں کہ دیکھو! دنیا ایسی حقیر چیز ہے، اس کو دل میں جگہ دے کر کیا کرو گے؟

فَضْلُ الزُّهْدِ فِي الدُّنْيَا وَالْحَثُّ عَلَى التَّقَلُّلِ مِنْهَا وَفَضْلُ الْفَقْرِ

دنیا کے معاملہ میں زہد اختیار کرنے کی فضیلت

اور سازوسامان میں کمی رکھنے کی ترغیب

اور فقر کی فضیلت

﴿مجلس ۳﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۵/ذی قعدۃ الحرام ۱۴۲۰ھ ۱۲/فروری ۲۰۰۰ء

زہد کے سلسلہ میں بیان چل رہا تھا کہ آدمی اپنے دل کو دنیا کی محبت سے خالی رکھے، اور اپنی ضرورت کو پورا کرنے میں بھی دنیا میں کم سے کم لگے۔ اس سلسلے میں گذشتہ مجلس میں چند روایتیں پیش کی تھیں، آج بھی کچھ روایتیں پیش کرتے ہیں۔ اس باب میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ زیادہ ہی روایتیں پیش کی ہیں جس کی وجہ یہی ہے کہ سب سے بڑی بیماری جو ہمارے اندر پائی جاتی ہے وہ دنیا کی محبت ہے۔ جیسا کہ پہلے بتلایا تھا کہ ساری خرابیوں اور برائیوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے۔ اگر وہ دل سے نکل جائے اور دل کے اندر دنیا کی رغبت باقی نہ رہے تو پھر آدمی کے لئے اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

مال کے فتنہ سے بچنے کا علاج

۴۶۵- وعن أبي ذر رضی اللہ عنہ قَالَ: كُنۡتُ أَمۡشِيۡ مَعَ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فِيۡ حَرَّةٍ بِالۡمَدِيۡنَةِ، فَاسۡتَقۡبَلَنَا أُحُدٌ، فَقَالَ: يَاأَبَاذَرٍّ۔ قُلۡتُ: لَبَّيۡكَ يَارَسُوۡلَ اللهِ۔ فَقَالَ: مَا يَسُرُّنِيۡ أَنَّ عِنۡدِيۡ مِثۡلَ أُحُدٍ هٰذَا ذَهَبًا تَمۡضِيۡ عَلَيَّ ثَلَاثَةُ أَيَّامٍ وَعِنۡدَيۡ مِنۡهُ دِيۡنَارٌ، إِلَّا شَيۡئٌ أَرۡصُدُهُ لِدَيۡنٍ، إِلَّا أَنۡ أَقُوۡلَ بِهٖ فِيۡ عِبَادِ اللهِ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا: عَنۡ يَمِيۡنِهٖ وَعَنۡ شِمَالِهٖ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ۔ ثُمَّ سَارَ، فَقَالَ: إِنَّ الۡأَكۡثَرِيۡنَ هُمُ الۡأَقَلُّوۡنَ يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ إِلَّا مَنۡ قَالَ بِالۡمَالِ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا، عَنۡ يَمِيۡنِهٖ وَعَنۡ شِمَالِهٖ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ، وَقَلِيۡلٌ مَا هُمۡ۔ ثُمَّ قَالَ لِيۡ: مَكَانَكَ لَا تَبۡرَحۡ حَتّٰى آتِيَكَ، ثُمَّ انۡطَلَقَ فِيۡ سَوَادِ اللَّيۡلِ حَتّٰى تَوَارٰى، فَسَمِعۡتُ صَوۡتًا قَدِ ارۡتَفَعَ. فَتَخَوَّفۡتُ أَنۡ يَكُوۡنَ أَحَدٌ عَرَضَ لِلنَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم،

فَأَرَدْتُ أَنْ آتِيَهِ فَذَكَرْتُ قَوْلَهُ "لَا تَبْرَحْ حَتّٰى آتِيَكَ" فَلَمْ اَبْرَحْ حَتّٰى أَتَانِيْ. فَقُلْتُ: لَقَدْ سَمِعْتُ صَوْتًا تَخَوَّفْتُ مِنْهُ، فَذَكَرْتُ لَهُ فَقَالَ: وَهَلْ سَمِعْتَهُ؟ قُلْتُ: نَعَمْ. قَالَ: ذَاكَ جِبْرِيْلُ أَتَانِيْ فَقَالَ: مَنْ مَاتَ مِنْ أُمَّتِكَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ. قُلْتُ: وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ؟ قَالَ: وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ. (متفق علیہ، وھٰذا لفظ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رات کے وقت مدینہ منورہ کی پتھریلی جگہ میں چل رہا تھا (اس زمانہ میں مدینہ کے دونوں طرف میدان تھا جہاں چھوٹے چھوٹے پتھر بچھے ہوئے تھے، اور درمیان میں مدینہ منورہ آباد تھا۔ اور ایسا میدان جس میں چھوٹے چھوٹے پتھر ہوں، عربی زبان میں اس کو "حَرَّة" کہتے ہیں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہی میدانوں میں سے ایک میدان میں مَیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ چل رہا تھا) چلتے چلتے ہمیں سامنے اُحد پہاڑ نظر آیا (جب آدمی مدینہ منورہ کی آبادی سے باہر نکلتا ہے تو احد پہاڑ بالکل سامنے ہی نظر آتا ہے) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے ابوذر! سنو۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں، فرمایئے، کیا ارشاد ہے۔ تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ بات میرے لئے باعثِ مسرت نہیں ہے کہ میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور تین دن میرے اوپر ایسے گزر جائیں کہ میرے پاس اس میں سے ایک دینار بھی باقی رہ گیا ہو، سوائے اتنی مقدار کے جس کو میں قرضہ کی ادائیگی کے لیے رہنے دوں، مگر یہ کہ میں اس سونے کو اللہ کے بندوں میں اس طرح (دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کے) تقسیم کر دوں۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو لوگ زیادہ مال والے ہیں وہ قیامت کے دن کم اجر و ثواب والے ہوں گے، البتہ وہ آدمی جو اپنے مال کو اس طرح اور اس طرح خرچ کرتا رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے دائیں بائیں اور پیچھے اشارہ کیا (کہ اس طرح ہاتھ بھر بھر کر خرچ کرے تو وہ البتہ قیامت کے روز بھی زیادہ ثواب والے لوگوں میں ہوگا۔)

پھر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لیکن ایسے لوگ بہت کم ہیں۔یعنی جن کے پاس مال زیادہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ اس طرح کثرت سے خرچ بھی کریں ایسے لوگ کم ہیں۔حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: یہیں ٹھہرو، یہاں سے مت ہٹنا جب تک کہ میں واپس نہ آجاؤں۔ یہ فرما کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کے اندھیرے میں آگے بڑھ گئے، یہاں تک کہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کے بعد مجھے ایک آواز سنائی دی، اور وہ ذرا بھیانک قسم کی آواز تھی، تو مجھے ڈر لاحق ہوا کہ شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی تکلیف پہنچانے کے لیے وہاں پہنچ گیا ہو، یا کوئی ایسی ویسی بات پیش آئی ہو اسی کے نتیجہ میں یہ آواز آرہی ہے، اس لئے میرے دل میں خیال آیا کہ جہاں سے آواز آرہی ہے میں بھی ادھر چلا جاؤں، لیکن مجھے یاد آیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تاکید فرما گئے تھے کہ میں جب تک نہ آؤں یہیں رہنا، اس لئے میں اپنی جگہ سے نہیں ہٹا، یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے دل میں آیا تھا کہ میں اُدھر پہنچوں لیکن پھر آپ نے جاتے وقت تاکید فرمائی تھی کہ میں اپنی جگہ سے نہ ہٹوں، اس لئے میں نہیں آیا۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم نے وہ آواز سنی تھی؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! سنی تھی۔ اس پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ حضرت جبرئیل کے آنے کی آواز تھی، اور انھوں نے آکر یہ خوش خبری سنائی کہ آپ کی اُمت میں سے کوئی آدمی دنیا سے اس حالت میں رُخصت ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا ہے، تو وہ جنت میں جائے گا۔اس پر میں نے کہا: اگرچہ زنا کیا ہو، اور چوری کی ہو؛ تب بھی وہ جنت میں جائے گا؟ تو انھوں نے کہا: اگرچہ زنا کیا ہو اور چوری کی ہو۔

افادات:- اس حدیثِ پاک میں ایک تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مال کے سلسلہ میں اپنا مزاج بتلا دیا اور دوسرے لوگوں کو متوجہ کیا کہ اگر کسی کے پاس مال ہو تو اس کے فتنے سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آدمی اس مال کو اللہ کے راستہ میں خوب

خرچ کرے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہاتھ بھر بھر کے اتنا خرچ کرے کہ وہ جلدی سے خرچ ہو جائے۔ضرورت کے بقدر اپنے پاس رہنے دے، باقی سب اللہ کے راستہ میں خرچ کردے۔مال کی وجہ سے آنے والی خرابیوں سے بچنے کا یہی علاج ہے۔جس کے پاس مال زیادہ ہو اس کے حق میں آخرت کے اعتبار سے پورے طور پر مفید اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس کو کثرت سے اللہ کے راستہ میں خرچ کرے۔

مال ودولت کے بارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نظریہ

۴۶۶-وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ:لَوْ كَانَ لِيْ مِثْلُ أُحُدٍ ذَهَبًا لَسَرَّنِيْ أَنْ لَا تَمُرَّ عَلَيَّ ثَلَاثُ لَيَالٍ وَعِنْدِيْ مِنْهُ شَيْئٌ إِلَّا شَيْئٌ أَرْصُدُهُ لِدَيْنٍ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر اُحد پہاڑ کے برابر بھی میرے پاس سونا ہو، تو مجھے یہ بات پسند نہیں کہ تین راتیں اس پر گزر نے پائیں، سوائے وہ جس کو میں اپنے قرضہ کی ادائیگی کے لیے رہنے دوں۔

افادات:-اس روایت میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اسی تمنا کو پیش فرمایا ہے جو اوپر گزری۔اور قرض کی ادائیگی بہت اہم ہے، اس کے لئے اپنے پاس اتنی مقدار رہنے دوں گا جس سے قرض خواہ کا قرض ادا ہو جائے۔

عمدہ اصول

۴۶۷-وعنه قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:انْظُرُوْا إِلٰى مَنْ هُوَ أَسْفَلُ مِنْكُمْ وَلَا تَنْظُرُوْا إِلٰى مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ، فَهُوَ أَجْدَرُ أَنْ لَا تَزْدَرُوْا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ.

وفی روایة البخاری:-إِذَا نَظَرَ أَحَدُكُمْ إِلٰى مَنْ فُضِّلَ عَلَيْهِ فِي الْمَالِ وَالْخَلْقِ، فَلْيَنْظُرْ إِلٰى مَنْ هُوَ أَسْفَلُ مِنْهُ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی (دنیوی اعتبار سے، مال و دولت یا کسی بھی اعتبار سے) تم سے کم درجہ کا ہو اس کو دیکھو اور جو تم سے اونچے درجہ کا ہو (مال کے اعتبار سے یا دنیوی کسی اور اعتبار سے) اس کی طرف نہ دیکھو (اگر آپ ایسا کرو گے تو) اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں تم پر ہیں ان کو تم حقیر نہیں سمجھو گے، اور ان کی ناقدری نہیں کرو گے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ کوئی آدمی آپ کو ایسا نظر آیا جو مال کے اعتبار سے یا جسمانی خوبصورتی کے اعتبار سے تم سے اچھا ہے، تو جو تم سے کم درجہ کا ہے اس کی طرف بھی نگاہ کرلو (تاکہ اس کی وجہ سے اللہ کی جو نعمت تمہیں ملی ہے اس کی ناقدری نہ ہو۔)

افادات:- اس روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بہت ہی عمدہ اصول بتلایا ہے، اس لئے کہ انسان کے مزاج میں فطری طور پر مال کی جو محبت ہے وہ تو ساتھ ہی لگی ہوئی ہے، اس محبت کی وجہ سے عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ آدمی کو کتنا ہی کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہوا ہو، تب بھی اس کو اس پر صبر نہیں آتا ہے۔ وہ اپنے سے زیادہ والے کو جب دیکھتا ہے تو سوچتا ہے کہ میرے پاس تو یہ چیز نہیں ہے۔ کسی آدمی کے پاس چاہے دس فیکٹریاں ہوں، لیکن جب پندرہ فیکٹری والے کو دیکھے گا تو کہے گا کہ دیکھو! یہ کتنا بڑا آدمی ہے، اور پھر وہی حسرت پیدا ہوتی ہے، حالانکہ اس کی ضرورت سے بہت زیادہ خود اس کے پاس موجود ہے۔ یا اگر کسی دوسرے کے پاس مرسڈیز (Mercedes) گاڑی دیکھی، اب چاہے خود اس کے پاس (BMW) ہو، تب بھی وہ کہے گا کہ میرے پاس (Mercedes) تو نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کا مزاج ہی ایسا بنا ہوا ہے۔

پریشانی سے راحت ملی

حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے محدث گزرے ہیں،

بڑے فقیہ بھی تھے اور تاجر بھی تھے، اللہ تعالیٰ نے دولت بھی بہت زیادہ عطا فرمائی تھی۔ ایک سال حج کے لئے تشریف لے جاتے اور ایک سال جہاد میں تشریف لے جاتے۔ انہوں نے دُعا فرمائی تھی کہ اے اللہ! میری زندگی تو مالداروں جیسی ہو لیکن میری موت مسکینوں جیسی ہو اور چوں کہ خود بھی مالدار تھے، اس لیے فرماتے ہیں کہ پہلے میں مالداروں میں بیٹھا کرتا تھا تو ہمیشہ غمگین اور پریشان رہتا تھا۔ کسی کو دیکھا کہ اس کا کپڑا میرے کپڑے سے اچھا ہے تو مجھے تکلیف ہوتی، کسی کی سواری میری سواری سے اچھی دیکھی تو مجھے تکلیف ہوتی، کسی کا مکان میرے مکان سے اچھا دیکھتا تو تکلیف ہوتی۔ ظاہر ہے کہ خود کا مکان چاہے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، ایک آدھ چیز تو دوسرے کے مکان میں ضرور اچھی ہوتی ہے۔ یہ ایک قدرتی چیز ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب ان کے پاس بیٹھتا تھا تو یہ ساری چیزیں دیکھ دیکھ کر ہمیشہ غمگین اور پریشان رہتا تھا کہ یہ چیز میرے پاس کیوں نہیں ہے۔ پھر میں نے ان کے پاس بیٹھنا چھوڑ دیا اور جو لوگ مجھ سے کم تر تھے ان کے اندر بیٹھنا شروع کیا تو مجھے بڑی راحت ملی، جب کسی کو دیکھتا تو سوچتا کہ اللہ تعالیٰ کا بڑا شکر ہے کہ میرا لباس اس کے لباس سے اچھا ہے، میری سواری اس کی سواری سے اچھی ہے، میرا مکان اس کے مکان سے اچھا ہے۔ اس کے بعد مَیں بڑی راحت وآرام میں آ گیا۔

ذہنی وفکری تشویش کا علاج

اور ایک بات بتاؤں کہ درحقیقت آدمی جو بھی تکلیف اُٹھاتا ہے، زیادہ تر اس تکلیف کا تعلق ذہن اور فکر سے ہوتا ہے، حقیقت سے نہیں ہوتا ہے، اس روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی کا علاج بتلایا ہے کہ آپ کسی ایسے آدمی کو دیکھ لو جو مال ودولت کے اعتبار سے یا ظاہری خوبصورتی کے اعتبار سے آپ سے اچھا ہو تو اس وقت ذرا آپ

اپنے سے نیچے والے لوگوں کو بھی دیکھ لیجئے۔ اگر آپ نے دیکھا کہ کسی کے پاس ۲۵ر لاکھ والا بنگلہ ہے؛ تو بھائی! آپ کو آس پاس جھونپڑ پٹیاں بھی کہیں نظر آ جائیں گی، ان کو بھی دیکھ لیجئے۔ اور اگر آپ کے پاس جھونپڑا ہے تو پھر فٹ پاتھ پر بغیر کسی جھونپڑے کے سونے والے بھی ہیں ان کو دیکھ لیجئے۔ اور گٹر لائن کے اندر بھی سونے والے آپ کو نظر آئیں گے۔ اگر جھونپڑا بھی ہے تو آپ یوں سوچئے کہ ایک جھونپڑا بھی تو ملا ہوا ہے، اس کے پاس تو اتنا بھی نہیں ہے۔ اور بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اسٹیشن کی کسی بینچ اور کرسی پر رات گذار دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ آدمی اگر سوچے تو ایسے نمونے ضرور نظر آئیں گے، جس کے نتیجے میں اللہ کی نعمت کی قدر پیدا ہوگی۔

میرے پاؤں تو سلامت ہیں

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ایسی حالت میں گھر سے نکلا کہ پیر میں جوتا نہیں تھا، مجھے بڑا افسوس تھا کہ آج کھلے پیر جا رہا ہوں اور اس کی وجہ سے طبیعت پر ایک خاص اثر تھا، اور غمگینی چھائی ہوئی تھی۔ اتنے میں ایک آدمی کو دیکھا کہ اس کے پاؤں ہی نہیں ہیں؛ تو میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ میرے پاؤں تو سلامت ہیں، بھلے ہی جوتا نہیں تو کیا ہوا۔ تو حقیقت یہی ہے کہ آدمی ان چیزوں کو بھی بار بار دیکھے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

اب تو مجھے حق الیقین حاصل ہو گیا

باقی یہ ہے کہ آدمی کی خواہشات کی کوئی انتہاء نہیں ہے۔ ایک قصہ لطیفہ کے طور پر سناتا ہوں، اور ہمارے مولوی لوگوں کو تو سناتا رہتا ہوں کہ میں ایک مرتبہ سفر سے واپس آ رہا تھا، ٹرین چھوٹ گئی تو ٹرک میں بیٹھا، ایک اور مولوی صاحب بھی اسی میں

ساتھ بیٹھے۔ بہت سیدھے سادے آدمی ہیں۔ کہنے لگے کہ ہم جو کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ مقدر میں جو روزی ہوتی ہے اتنی ہی ملتی ہے، اس سے زیادہ نہیں ملتی، اس پر یقین تو تھا لیکن اس کے باوجود دل میں یہ خیال رہتا تھا کہ ایک آدمی ہندوستان میں رہ کر پانچ سو روپے کماتا ہے، اور وہی آدمی سعودی چلا جائے تو وہاں اس کو پانچ سو ریال ملیں گے؛ تو یہ کیسے برابر ہوسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دل میں ایسا خیال آتا تھا، لیکن اب تو مجھے حق الیقین حاصل ہوگیا کہ جو مقدر میں ہے وہی ملتا ہے۔ میں نے کہا کہ حق الیقین کیسے ہوگیا؟ تو کہنے لگے کہ دراصل میں ایک جگہ پڑھاتا تھا اور وہاں مجھے بارہ سو (۱۲۰۰) روپے تنخواہ ملتی تھی۔ میرے دل میں آیا کہ اتنے پیسے کافی نہیں ہیں، اور زیادہ ملنے چاہئیں۔ لوگ سعودیہ محنت مزدوری کرنے کے لیے جاتے ہیں تو میں بھی جاؤں۔ لہٰذا میں نے اپنا مکان بیچا، کچھ قرضہ بھی کیا اور آزاد ویزا حاصل کر کے وہاں گیا، اور دو سال وہاں رہا، اس درمیان یہاں پیسے بھی بھیجے اور جو قرض تھا وہ بھی ادا کیا، اور دو سال کے بعد جب واپس آیا اور میں نے حساب کیا تو جانے کا خرچہ جو پچاس ہزار، یا ساٹھ ہزار ہوا تھا وہ نکالنے کے بعد باقی جو پیسے بچے، ان کو دو سال پر تقسیم کیا تو مہینہ کے بارہ سو (۱۲۰۰) روپے ہی نکلے، تو میں نے سوچا کہ اپنے نصیب میں تو وہ بارہ سو (۱۲۰۰) روپے ہی ہیں۔

یقین کے تین درجے

دیکھو! ایک علم الیقین ہوتا ہے، اور ایک عین الیقین ہوتا ہے، اور ایک حق الیقین ہوتا ہے۔ آدمی کو کسی چیز کا یقین علم کے درجہ میں ہوتا ہے جیسے آپ کو کسی نے بتلایا کہ آگ جلاتی ہے۔ بتلانے والا آپ کا بھروسہ مند آدمی ہے، آپ کو اس کی ہر بات پر یقین ہے، اس نے کہہ دیا، آگ جلاتی ہے تو آپ کو یقین ہوگیا کہ بالکل صحیح کہتا ہے، اس

کو علم الیقین کہتے ہیں۔ یہ یقین کا پہلا درجہ ہے۔

اس کے بعد دوسرا درجہ عین الیقین کا ہے۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ پہلے تو صرف سنا تھا لیکن اب آنکھ سے دیکھ بھی لیا کہ کہیں آگ لگی اور کوئی آدمی اس میں جل گیا، جب آپ نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا تو آپ کا یقین اور بڑھ گیا؛ اس کو عین الیقین کہتے ہیں۔

اور تیسرا درجہ حق الیقین کا ہے۔ اتفاق کی بات کہ آپ خود ہی کسی وجہ سے اس مرحلہ سے دوچار ہو گئے، مثلاً کسی گرم چیز کو آپ نے پکڑ لیا اور آپ کا ہاتھ جل گیا۔ خود پر بیتی اور اس سے جو یقین حاصل ہوا؛ اس کو حق الیقین کہتے ہیں۔

چشم کشا حقیقت

بہت سے دوکان والے بینک سے قرض لے کر فیکٹری کھولتے ہیں، اب فیکٹری چل رہی ہے، پندرہ بیس آدمی کام کر رہے ہیں، پیسے آرہے ہیں اور وہ بینک میں قسط چکا رہے ہیں اور اس کا سالانہ سود بھی ادا کر رہے ہیں، ملازمین کی تنخواہ دی جارہی ہے، سرکاری آفیسرز آتے ہیں تو ان کو رشوت دی جارہی ہے، کوئی چیز پاس کرانے کے لیے پیسے نکالے، اور فلاں بل پاس کرانے کے لیے دوسرے پیسے نکالے وغیرہ وغیرہ۔ بظاہر تو کاروبار تو بہت اچھا چل رہا ہے، بہت سارے پکے رجسٹر بھی بنے ہوئے ہیں۔ پیسے آ بھی بہت رہے ہیں اور جا بھی بہت رہے ہیں؛ لیکن اگر وہ آدمی یوں سوچے کہ اس سب میں سے میرے حصہ کا کتنا ہے؟ تو میں یوں سمجھتا ہوں کہ پہلے جو دوکان کرتا تھا اور اُس میں سے اس کو پانچ ہزار ملتے تھے، اب فیکٹری کرنے کے بعد بھی پانچ ہزار سے زیادہ اس کی ملکیت میں نہیں آرہے ہوں گے۔ دوسرے جو پیسے اِدھر اُدھر نکل رہے ہیں

اگرچہ سب اسی کے ماتحت ہو رہا ہے، لیکن اس کے پاس جو اپنے خاص استعمال میں رہ جاتے ہیں وہ اتنے ہی ہوتے ہیں۔ یہ بات اور رہی کہ یوں کہا جائے گا کہ یہ صاحب فیکٹری کے مالک اور سیٹھ ہیں، اور اتنے سارے نوکران یہاں کام کرتے ہیں، لیکن جو آیا اور گیا، وہ تو دوسروں کا تھا۔ دیکھا تو یہ جائے گا کہ خود اس کا اپنا کتنا ہے!

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا تجویز کردہ علاج

ہمارے حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحبؒ کا واقعہ صوفی اقبال صاحب نے ذکر کیا ہے۔ ان کا ایک رسالہ ''فیضِ شیخ'' ہے۔ صوفی اقبال صاحب دامت برکاتہم مدینہ منورہ میں حضرت شیخ کے خلیفہ ہیں، کئی سالوں سے وہیں مقیم ہیں، آج کل بہت بیمار بھی چل رہے ہیں، دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو صحت عطا فرمائے۔ (اب انتقال ہو چکا ہے رحمہُ اللہ رحمۃً واسعۃً) حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سارے افادات انہوں نے شائع کئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے جوانی میں تجارت کا بہت شوق تھا۔ حضرت کے سامنے اس کا تذکرہ کیا تو حضرت نے مجھ سے فرمایا: دیکھو صوفی جی! میں تو یوں سمجھتا ہوں کہ سہارنپور میں جتنی بھی دوکانیں ہیں وہ میری ہیں اور میں ان کا مالک میں ہوں اور جو لوگ ان دوکانوں پر بیٹھے ہوئے ہیں وہ سب میرے کارندے ہیں، سارا حساب کتاب وہ رکھتے ہیں اور وہ جو کچھ کرتے ہیں اس کا اپنا معاوضہ ان کو دیا جاتا ہے، اور میری قسمت کا جو ہے وہ مجھ تک یہاں پہنچ جاتا ہے۔ حقیقت میں ان کے ذہن میں دنیا کمانے کا جو کیڑا تھا اس کو دور کرنے کے لیے حضرت شیخؒ نے یہ ایک علاج بتلایا۔

میں نے بھی ابھی آپ کے سامنے یہی عرض کیا کہ آپ واقعتاً بھی مالک بن جائیں، تو اصل تو دیکھنا یہ ہے کہ آپ کے ہاتھ میں کیا آیا! یہ سب کچھ تو ہوا کہ بینک سے

لون لی، کسی سے قرض لیا، فیکٹری خریدی، زمین بھی لی، لیکن اخیر میں آپ کے پاس کیا آیا! آدمی کے پاس اتنا ہی آتا ہے جو اس کی قسمت کا ہوتا ہے، اس سے زیادہ نہیں آتا۔

قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکے؟

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے تقدیر پر ایک رسالہ لکھا، اس میں بہت سارے قصے لکھے جو لوگوں سے سنے تھے۔ بعض لوگ اپنے ایسے ایسے حالات سناتے ہیں کہ عبرت ہوتی ہے، خاص کر جو تعویذ لینے آیا ہو، وہ سب کچھ سچ سچ بتاتا ہے بالکل جھوٹ نہیں بولتا، اس لئے کہ اس کو تعویذ چاہیے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اس رسالہ میں مَیں نے لکھا تھا کہ جس کی قسمت میں اللہ تعالیٰ نے مرغی کھانا لکھا ہے، تو یا تو سیٹھ بن کر کھائے گا یا باورچی بن کر کھائے گا۔ باورچی جب سیٹھ کے یہاں مرغی پکائے گا تو وہ بھی وہی کھائے گا۔ اور جس کی قسمت میں کار میں گھومنا لکھا ہے تو وہ سیٹھ بن کر پھرے، یا ڈرائیور بن کر پھرے۔ اونچی سے اونچی کار ہو، جس کار میں سیٹھ صاحب بیٹھیں گے اسی میں ڈرائیور بھی بیٹھتا ہے۔ اور حضرت نے لکھا ہے کہ جس کے لیے جیل جانا لکھا ہے تو چاہے مجرم بن کر جائے، یا شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی بن کر جائے۔ اس زمانہ میں جنگ آزادی کے سلسلہ میں حضرت مدنیؒ بار بار جیل جاتے رہتے تھے۔

کروڑ پتی کی قسمت میں دال کا پانی

ایک انگریز کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ایک سگریٹ پیتا تھا اتنی دیر میں اس کے خزانہ میں ہزاروں روپے جمع ہوتے تھے، لیکن وہ پیٹ کا بیمار تھا، ڈاکٹروں اور حکیموں نے کہہ دیا تھا کہ غذا کے طور پر دال کا پانی پینا ہے، اس کے علاوہ اور کچھ بھی کھائے تو مر جائے گا۔ اب اگر وہ لاکھوں اور کروڑوں کمائے، تب بھی اس کی قسمت میں دال کا

پانی ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

ٹینشن کیوں؟

میں یہ سارے نمونے اس لئے پیش کرتا ہوں کہ آدمی اتنی ساری محنتیں کرتا ہے، مشقتیں اُٹھاتا ہے، اتنا سب بوجھ سر پر لے کر پھرتا ہے؛ تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی یہ سب سوچے۔ آج کل جس کو دیکھو وہ یہی کہتا ہے کہ میں ٹینشن میں ہوں۔ دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک امریکہ ہے، لیکن سب سے زیادہ ٹینشن وہاں کے رہنے والوں میں ہے، جنگل میں رہنے والوں کو کوئی ٹینشن نہیں، اس لیے کہ انہوں نے اپنی ضرورت کو جتنا کم پھیلایا ہے اتنا ہی زیادہ آرام میں ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حقیقت میں سارے جھگڑے ہم خود اپنے لئے طے کرتے ہیں، حالاں کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ آدمی کو موت نہیں آسکتی یہاں تک کہ اپنی روزی پوری کرلے۔ جس کی قسمت میں روزی کے جتنے دانے لکھے ہیں جب تک ان کو پورا نہیں کرے گا؛ وہاں تک موت آنے والی نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ روزی کے طلب کرنے کے معاملہ میں کاروبار کو زیادہ مت پھیلاؤ (Short cut) اِختیار کرو، زیادہ لمبا کاروبار ہونا نہیں چاہیے، بس اتنا ہو جس سے آپ کی ضرورت پوری ہو جائے، بقیہ اوقات کو اللہ تعالیٰ کی یاد اور آخرت کی تیاری میں استعمال کرنا چاہیے۔

دنیا کی محبت والوں کا مزاج

۴۶۸ - عنه عن النبی ﷺ قَالَ: تَعِسَ عَبْدُ الدِّينَارِ وَالدِّرْهَمِ وَالْقَطِيفَةِ وَالْخَمِيصَةِ، إِنْ أُعْطِيَ رَضِيَ، وَإِنْ لَمْ يُعْطَ لَمْ يَرْضَ۔ (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: برا

ہے جو دینار و درہم کا، اور چادر و کملی کا غلام بنا ہوا ہے، اگر اس کو یہ چیزیں مل جاتی ہیں تو خوش رہتا ہے اور اگر نہیں ملتی تو ناراض رہتا ہے۔

افادات:- اس روایت میں نبی کریم ﷺ نے لوگوں کا مزاج بتلایا ہے کہ پیسہ آیا تو اللہ کا شکر ادا کریں گے کہ اللہ میاں کی نظر کرم ہے۔ گویا اس کی نظر کرم کو ایک ہی چیز (صرف پیسہ) میں محدود کردی۔ اگر کسی پاس دو پیسے آ گئے تو اس کو تعبیر ہی اس طرح کرتے ہیں کہ اللہ میاں نے ہاتھ پکڑ لیا۔ نعوذ باللہ گویا کہنا چاہتے ہیں کہ اب تک بے یار و مددگار تھا۔ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ ان کو پیسہ ملے، دینار و درہم ملے؛ مطلب یہ ہے کہ کچھ ملے تو اللہ تعالیٰ سے خوش ہوتے ہیں اور نہ ملے تو ناراض ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی شکایت کرتے ہیں کہ میرا تو یہ حال ہے، میری تو یہ مصیبت ہے، حالاں کہ ایک بندہ کا مزاج ایسا نہیں ہونا چاہیے، دراصل یہ سب باتیں دنیا کی محبت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

صحابہ کرام کے لباس

۴۶۹- وعنه قَالَ: لَقَدْ رَأَيْتُ سَبْعِيْنَ مِنْ أَهْلِ الصُّفَّةِ، مَا مِنْهُمْ رَجُلٌ عَلَيْهِ رِدَاءٌ: إِمَّا إِزَارٌ، وَإِمَّا كِسَاءٌ، قَدْ رَبَطُوا فِيْ أَعْنَاقِهِمْ، فَمِنْهَا مَا يَبْلُغُ نِصْفَ السَّاقَيْنِ، وَمِنْهَا مَا يَبْلُغُ الْكَعْبَيْنِ، فَيَجْمَعُهُ بِيَدِهِ كَرَاهِيَةَ أَنْ تُرَى عَوْرَتُهُ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہؓ ہی کی ایک روایت ہے کہ اہلِ صفہ میں سے ستر آدمیوں کو میں نے ایسی حالت میں دیکھا کہ ان میں سے کسی کے پاس ''رِداء'' یعنی اوپر کا حصہ ڈھانپنے والی چادر تو تھی ہی نہیں۔ بہت سے بہت ان کے پاس نیچے کا حصہ ڈھانپنے والی چادر تھی۔ اور بہت سے تو وہ تھے جن کے پاس ایک کملی ہوتی تھی اسی کو اس طرح لپیٹ کر اوپر سے کانٹے لگا کر باندھ

دیتے تھے کہ ستر چھپ جاتا تھا۔ اور بہت سے وہ تھے جن کی چادر تو صرف گھٹنوں تک آتی تھی۔ اور بعض وہ تھے جن کی چادر ٹخنوں تک آتی تھی، اس کے آگے والے حصے کو اپنے ہاتھوں میں پکڑے رہتے تھے تا کہ کہیں ستر نہ کھل جائے۔

افادات:- صفہ مسجدِ نبوی کے اندر ایک چبوترہ ہے، مسجد نبوی کے اندر باب جبرئیل سے جب داخل ہوتے ہیں تو دائیں طرف ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں بعض صحابہ وہ تھے جنھوں نے علم حاصل کرنے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کو سننے کے لئے اپنے آپ کو فارغ کر دیا تھا، ان کی نہ تو بیوی تھی، نہ بال بچے تھے؛ وہ تنہا رہتے تھے۔ آج کل کے حساب سے طلبۂ علم تھے۔ ان کی قیام گاہ وہی چبوترہ ہوتا تھا، وہیں رہنا، وہیں سونا؛ انہیں کو عربی زبان میں ''أَهْلُ الصُّفَّة'' کہتے ہیں، اردو زبان میں ''چبوترہ والے'' ترجمہ ہوگا۔ تو وہ لوگ وہاں رہتے تھے، اس پر رہنے والوں اور علم حاصل کرنے میں مشغول رہنے والوں کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی رہتی تھی، جیسے ہمارے یہاں مدرسوں میں بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مدرسہ تھا جہاں تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔

اور اس زمانہ میں عام طور پر سلا ہوا لباس پہننے کے بجائے دو چادریں استعمال کرنے کا رواج تھا۔ بدن کے نچلے حصہ کو ڈھانپنے کے لئے جو چادر ہوتی تھی اس کو عربی میں ''اِزَارٌ'' کہتے ہیں۔ اور بدن کے اوپر والے حصہ کو ڈھانپنے کے لئے اچھی نقشی دار چادر ہوا کرتی تھی، اسی کو ''رِدَآءٌ'' کہتے ہیں۔

گویا صحابہ کرامؓ کے لباس کا یہ حال تھا کہ لباس کے طور پر ایک ہی چادر ہوتی تھی، دوسری چادر بھی نہیں ہوتی تھی۔ بعض کے پاس فقط لنگی ہوتی تھی، اوپر کا حصہ ننگا رہتا تھا، اسی چادر کو اپنی گردن میں باندھ دیتے تھے۔ کسی کی آدھی پنڈلی تک پہنچتی تھی، کسی کی ٹخنوں تک پہنچتی تھی۔ ان حضرات کا یہ حال تھا، لیکن اس پر ان کو کوئی افسوس وغم

نہیں ہوتا تھا کہ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے، اس کی تو فکر ہی نہیں، ان کے پیش نظر تو صرف آخرت تھی۔

قید خانہ اور جنت

۴۷۰-وعنه قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہؓ ہی کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے، اور کافر کے لیے جنت ہے۔

افادات:- دیکھو! قید خانہ میں کیسی زندگی گزرتی ہے کہ آدمی کو اُس میں رہنے کی تمنا نہیں ہوتی، اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اس بات کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے کہ اپنی ضرورتیں کم سے کم میں پوری کرے؛ تا کہ دنیا میں جی لگنے کی نوبت ہی نہ آئے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

بعض حضرات اشکال بھی کرتے ہیں کہ بعض مومنین کو دیکھتے ہیں کہ بہت اچھی مالی حالت میں اور راحت وآرام میں ہوتے ہیں، اور بعض کافروں کو دیکھتے ہیں کہ جسم کے اوپر لباس بھی نہیں ہوتا۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ حدیث میں ایک عام اندازہ بتلایا گیا ہے کہ عموماً مومن کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مومن کو آخرت میں جنت کے اندر جو ملنے والا ہے اس کے مقابلہ میں یہاں اس کو ساری دنیا کی راحتیں ملی ہوں؛ تب بھی وہاں کے مقابلہ میں یہ سب قید خانہ ہی ہے۔ اور کافر کو وہاں جو سزائیں ہونے والی ہیں، کفر پر جو عذاب ہونے والا ہے، اس کے مقابلہ میں چاہے یہاں بھوکے مرتا ہو؛ تب بھی یہ دنیا جنت ہے۔

نادر مثال

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایک مثال سے سمجھایا ہے کہ دیکھو! ایک پرندہ پنجرہ کے اندر ہے، اور اس جیسے دوسرے پرندے باہر باغ کے اندر ہیں اور وہ پنجرہ اسی باغ کے اندر رکھا ہوا ہے۔ تو اس کے حق میں یہ قید ہے کہ ہمجولیوں کو دیکھتا ہے کہ وہ باغ میں گھوم پھر رہے ہیں اور وہ اندر بند ہے، چاہے اس پنجرہ کے اندر اس کو کتنی ہی اچھی غذا کھانا پانی وغیرہ کیوں نہ دیا جاتا ہو، پھر بھی وہ پنجرہ اس کے حق میں قید خانہ کہلائے گا، وہ دیکھ رہا ہے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد اس کو یہ ملنے والا ہے۔

اس کے برخلاف ایک پرندہ وہ ہے جو پنجرہ میں ہے، اس کو پانی بھی نہیں مل رہا ہے، اور دانہ بھی نہیں مل رہا ہے، لیکن باہر شکاری چھری لے کر کھڑا ہے کہ باہر نکلے تو اس کو ذبح کرے، تو اب چاہے اس کو یہاں دانہ بھی نہ ملتا ہو، پانی بھی نہ ملتا ہو؛ تب بھی وہ یہ سوچتا ہے کہ کوئی مجھے اندر سے نہ نکالے تو اچھا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو کہا گیا کہ مومن کے حق میں یہ قید خانہ ہے اور کافر کے حق میں جنت ہے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے، آخرت کے مقابلہ میں دیکھا جائے تو یہ بات سو فیصد درست ہے۔

فَضْلُ الزُّهْدِ فِي الدُّنْيَا وَالْحَثُّ عَلَى التَّقَلُّلِ مِنْهَا وَفَضْلُ الْفَقْرِ

دنیا کے معاملہ میں زہد اختیار کرنے کی فضیلت اور ساز وسامان میں کمی رکھنے کی ترغیب اور فقر کی فضیلت

مجلس ۴

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۲/ذی قعدۃ الحرام ۱۴۲۰ھ ۱۹/فروری ۲۰۰۰ء

یہ باب زہد فی الدنیا کا چل رہا تھا کہ آدمی اپنے دل میں دنیا کی محبت نہ رکھے بلکہ اس سے بے رغبتی ہو، اس سلسلہ میں علامہ نوویؒ نے کئی آیتیں بھی پیش کی تھیں اور بہت ساری روایتیں بھی پیش کرنے کا اہتمام کیا ہے، وہی سلسلہ چل رہا ہے۔

دنیا میں اس طرح رہو

۴۷۱-وَعَنِ ابۡنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ أَخَذَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بِمَنۡکِبِیَّ۔ فَقَالَ: کُنۡ فِیۡ الدُّنۡیَا کَاَنَّکَ غَرِیۡبٌ، أَوۡعَابِرُ سَبِیۡلٍ.

وَکَانَ ابۡنُ عمر یَقُوۡلُ: إِذَا اَمۡسَیۡتَ فَلَا تَنۡتَظِرِ الصَّبَاحَ، وَإِذَا اَصۡبَحۡتَ فَلَا تَنۡتَظِرِ الۡمَسَاءَ۔ وَخُذۡ مِنۡ صِحَّتِکَ لِمَرَضِکَ، وَمِنۡ حَیَاتِکَ لِمَوۡتِکَ۔

قَالُوا فِیۡ شَرۡحِ ھٰذَا الۡحَدِیۡثِ مَعۡنَاہُ: لَاتَرۡکَنۡ إِلَی الدُّنۡیَا وَلَا تَتَّخِذۡھَا وَطَناً، وَلَا تُحَدِّثۡ نَفۡسَکَ بِطُوۡلِ الۡبَقَاءِ فِیۡھَا، وَلَا بِالۡاِعۡتِنَاءِ بِھَا، وَلَا تَتَعلَّقۡ مِنۡھَا إِلَّا بِمَا یَتَعلَّقُ بِهِ الۡغَرِیۡبُ فِیۡ غَیۡرِ وَطَنِهِ ، وَلَا تَشۡتَغِلۡ فِیۡھَا بِمَا لَا یَشۡتَغِلُ بِهِ الۡغَرِیۡبُ الَّذِیۡ یُرِیۡدُ الذَّھَابَ إِلٰی أَھۡلِهِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے دونوں مونڈھوں کو پکڑ کر ارشاد فرمایا: دنیا میں اس طرح رہو جیسے پردیسی، یا راستہ چلنے والا رہتا ہے

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب شام کرو تو صبح کا انتظار نہ کرو اور جب صبح کرو تو شام کا انتظار نہ کرو۔ اور اپنی تندرستی میں اپنی بیماری کے لئے، اور اپنی زندگی میں اپنی موت کے لئے توشہ حاصل کرلو۔

افادات:- کوئی آدمی سفر کر کے دوسری جگہ جاتا ہے اور وہاں اس کو چند روز قیام کرنا مقصود ہوتا ہے تو عیش وآرام اور راحت کا زیادہ سامان جمع نہیں کرتا، جو تکلیف آتی ہے اس کو برداشت کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ مجھے یہاں کتنے روز رہنا ہے، دو چار روز کے بعد تو میرا یہاں سے واپسی کا نظام بنا ہوا ہے، اور یہ میرا وطن نہیں ہے، لہٰذا اپنے لئے کوئی مکان بنانے کی فکر نہیں کرتا، نہ کوئی ایسی تدبیر کرتا ہے جو اس بات پر دلالت کرنے والی ہو کہ وہ یہاں مستقل قیام کرنے والا ہے۔ جیسے پردیسی آدمی پردیس میں رہتا ہے تو وہاں جی نہیں لگاتا، اور نہ وہ وہاں اپنے لئے عیش وآرام کے سامان مہیا کرنے کی فکر کرتا ہے، بلکہ پردیس میں جس مقصد کے لئے آنا ہوا ہے وہ اپنے اسی مقصد کو حاصل کرنے کی طرف زیادہ تر توجہ لگایا کرتا ہے۔

جیسے آپ بمبئی کسی کام کی غرض سے گئے ہوں تو وہاں آپ اپنے لئے راحت و آرام کی فکر نہیں کریں گے، بلکہ جس مقصد کو لے کر گئے ہیں، آپ کی پوری کوشش یہی ہوتی ہے کہ میں اپنے اس مقصد کو پورے طور پر حاصل کرلوں۔ تو اسی طرح دنیا میں انسان کی آمد آخرت کی تیاری کے لئے ہوئی ہے، دنیا ہمارا مستقل گھر نہیں ہے، ہماری حیثیت یہاں ایک پردیسی کی ہے۔

جیسے راہ گیر

بلکہ مزید ترقی کرتے ہوئے ایک قدم اور آگے کی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمائی کہ: راستہ چلتا ہوا مسافر ہوتا ہے۔ یعنی پردیس میں جب کوئی آدمی جاتا ہے تو وہاں تو چند روز رہتا بھی ہے، لہٰذا وہ تھوڑا بہت اہتمام تو کرتا ہے۔ لیکن ایک آدمی کا سفر جاری ہے، راستہ چل رہا ہے، تو اب اگر راستہ چلتے چلتے کبھی تھکن بھی محسوس ہوئی، تو

تھوڑی دیر کے لئے کسی درخت کے نیچے کھڑا ہو جائے گا، یا چند منٹ کے لئے کہیں بیٹھ جائے گا، اور پھر آگے سفر پر بڑھ جائے گا۔ وہ اتنا بھی اہتمام نہیں کرتا جیسا کہ ایک پردیسی پردیس میں چند روز قیام کے دوران کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ سے ہم کو متوجہ کیا کہ یہاں اپنے لئے راحت و آرام کے کوئی زیادہ اسباب اور سامان مہیا کرنے کے بجائے آخرت کی تیاری میں لگنا چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم شام کرو تو صبح کا انتظار نہ کرو، اور جب صبح کرو تو شام کا انتظار نہ کرو۔ اور یہ بات بھی اپنی جگہ سو فیصد صحیح ہے کہ کوئی گارنٹی نہیں کہ ہم صبح تک زندہ رہیں گے یا نہیں! تو پھر کیوں ہم اپنے لئے کل صبح تک کا پروگرام بھی بنائیں، ایسی تیاری کیوں نہ کرلیں کہ ابھی بلاوا آجائے تو ہم اس کے لئے تیار ہوں۔

اعمال کیے بغیر ثواب

اور فرماتے ہیں کہ: اپنی تندرستی میں اپنی بیماری کے لئے، اور اپنی زندگی میں اپنی موت کے لئے توشہ حاصل کرلو۔ یعنی آدمی کے ساتھ تندرستی اور بیماری لگی ہوئی ہے تو اب اس بات کا اہتمام کرلے کہ تندرستی کے زمانہ میں اعمال کا ایسا اہتمام کرے کہ اگر بیماری کی وجہ سے ان اعمال اور معمولات میں کمی بھی آگئی تو تندرستی کے زمانہ میں اس نے جو کام انجام دئے تھے اس سے اس کا کام چلتا رہے۔ اس لیے کہ ایک حدیث میں ہے کہ آدمی تندرستی کے زمانہ میں جن اعمال کا اہتمام کرتا ہے، اگر بیماری کی وجہ سے وہ ان اعمال کو انجام نہیں دے سکتا تو اللہ تعالیٰ بغیر کئے ہی ان اعمال کا ثواب دیا کرتے ہیں (الادب المفرد، ۵۰۰) جیسے آدمی جب کماتا ہے تو اس میں بھی اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ

بیماری آجائے تو کام چل جائے، اس لئے اتنا کماتا ہے کہ بیماری کے زمانہ میں بھی اگر اس کو کام کرنے یا کاروبار کا موقعہ نہ ملے تو یہ کمائی اس کے لئے کافی ہو۔ اور اپنی زندگی میں موت کے لئے تیاری کر لے اور چوں کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے اس لیے آدمی کو ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

دنیا کا قیام

علماء فرماتے ہیں کہ ہمارا یہاں قیام اتنا ہی ہے جتنا وقت اذان کہنے کے بعد اقامت کا ہوا کرتا ہے، بلکہ اذان و اقامت کے بعد نماز شروع کرنے کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو ایک کان میں اذان اور دوسرے کان میں اقامت کہی جاتی ہے، گویا جنازے کی نماز کی تیاری ہو چکی ہے، اب بس نماز و اقامت کے درمیان جتنا فاصلہ ہوتا ہے اتنے ہی فاصلہ کے بقدر ہمارا دنیا کے اندر قیام ہے، اس لئے آدمی کو یہاں اپنے واسطے راحت و آرام کے زیادہ اسباب یا سازوسامان کو مہیا کرنے کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ علامہ نوویؒ نے اس حدیث کی شرح میں علماء کا کلام نقل کیا ہے کہ دنیا کی طرف مائل نہ ہو، اس کی طرف دل نہ لگاؤ، اس کو اپنا وطن نہ بناؤ۔

اور یہ جو فرمایا تھا کہ جب صبح کرو تو شام کا انتظار نہ کرو، اور شام کرو تو صبح کا انتظار نہ کرو، گویا آدمی کو اپنے دل میں یہ چیز سوچنی ہی نہیں چاہیے کہ یہاں زندہ رہنا اور دیر تک قیام کرنا ہے۔ آدمی ایسے پروگرام نہ بنائے کہ ایک مہینہ کے بعد یوں کریں گے، اور اتنے دنوں کے بعد یوں کریں گے، اس طرح پروگرام بنا کر گویا اپنے آپ کو زندگی کی اُمید دلا رہا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ آدمی کو چاہیے کہ ہر وقت تیار رہے یعنی دنیا میں باقی رہنے کی طرف کوئی خاص توجہ نہ ہو، دنیا کے ساتھ تمہارا رشتہ اور تعلق اتنا ہی

ہو جتنا ایک پردیسی کا پردیس کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

محبوب بننے کا نسخہ

۴۷۲-وعن ابی العباس سهل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ قَالَ: جَآءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! دُلَّنِيْ عَلٰى عَمَلٍ إِذَا عَمِلْتُهُ أَحَبَّنِيَ اللهُ وَأَحَبَّنِي النَّاسُ. فَقَالَ: ازْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبُّكَ اللهُ، وَازْهَدْ فِيْمَا عِنْدَ النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاسُ.

(حديث حسن، رواه ابن ماجه وغيره بِأَسَانِيْدَ حَسَنَةٍ)

ترجمہ:-حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا عمل بتلائیں کہ جب میں اس کو کرلوں تو اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے محبت رکھے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں؟ (گویا میں اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں بھی محبوب بن جاؤں اور لوگوں کی نگاہوں میں بھی محبوب بن جاؤں) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: دنیا سے بے رغبتی اختیار کرو، اللہ تعالیٰ محبت کریں گے۔ اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے، اس سے بے رغبتی برتو، تو لوگ بھی تم سے محبت کریں گے۔

افادات:-دنیا کی محبت اگر آپ دل میں سے نکال لو، اور دنیا سے بے رغبتی برتو؛ تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے، اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے رغبتی برتو؛ تو لوگ تم سے محبت کریں گے۔ کسی کے ساتھ آدمی کا کیسا ہی تعلق کیوں نہ ہو، لیکن جہاں کوئی مطالبہ اس کے سامنے کیا گیا تو سالہا سال کے تعلق کے اوپر پانی پھر جاتا ہے اس لیے لوگوں کے پاس جو مال و دولت ہے، آدمی اگر اپنے آپ کو اس کی طرف سے بے رغبت بنالے گا، تو وہ یوں سمجھیں گے کہ اس کو میرے مال کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں ہے، اور پھر وہ کوئی خطرہ بھی محسوس نہیں کریں گے اور آپ کے

ساتھ محبت اور تعلق بھی رکھیں گے۔

اس روایت میں نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں محبوب بننے کا آسان نسخہ بتلایا ہے کہ آدمی دنیا کی محبت دل میں نہ رکھے۔ اور لوگوں کے نزدیک محبوب بننے کا بھی بڑا آسان نسخہ بتلایا کہ لوگوں کے پاس جو کچھ ہے، اس کی طمع ولالچ تمہارے دل میں نہیں ہونی چاہیے۔

حضور کی فقیری

۴۷۳ - وعن النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ قَالَ: ذَكَرَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ مَا أَصَابَ النَّاسُ مِنَ الدُّنْيَا، فَقَالَ: لَقَدْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَظَلُّ الْيَوْمَ يَلْتَوِيْ مَا يَجِدُ مِنَ الدَّقَلِ مَا يَمْلَأُ بِهِ بَطْنَهُ۔ (رواہ مسلم)

(الدَّقَلُ) بِفَتْحِ الدَّالِ الْمُهْمَلَةِ وَالْقَافِ: رَدِيُّ التَّمْرِ۔

ترجمہ:- حضرت نعمان بن بشیرؓ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے پاس دنیا کے مال ودولت کی وسعت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ دن بھر آپ اپنے پیٹ کو فاقہ سے لپیٹے رہتے تھے، اور آپ کو گھٹیا قسم کی کھجور بھی اتنی میسر نہیں ہوتی تھی کہ اس کے ذریعہ سے آپ اپنا شکم مبارک (پیٹ) بھر سکیں۔

افادات:- چوں کہ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں بڑے بڑے ممالک فتح ہوئے جس کی وجہ سے مالِ غنیمت سے مسلمانوں کے پاس خوب دولت آئی اور مال کی ریل پیل ہوئی۔ اس کا ذکر کر کے حضرت عمرؓ یہ فرمانے لگے کہ آج لوگوں کے پاس مال ودولت کی یہ حالت ہے۔

گھٹیا قسم کی کھجور جو سوکھ جاتی ہے اس کو ''دقل'' کہتے ہیں۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کا حال

۴۷۴- وَعَنْ عائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، وَمَا فِيْ بَيْتِي مِنْ شَيْءٍ يَأْكُلُ ذُو كَبِدٍ إِلاَّ شَطْرُ شَعِيْرٍ فِيْ رَفٍّ لِيْ، فَأَكَلْتُ مِنْهُ حَتَّى طَالَ عَلَيَّ، فَكِلْتُهُ فَفَنِيَ. (متفق علیہ)

قَوْلُهَا: (شَطْرُ شَعِيْرٍ) أَيْ: شَيْءٌ مِنْ شَعِيْرٍ، كَذَا فَسَّرَهُ التِّرْمِذِيُّ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ایسی حالت میں ہوا کہ میرے مکان میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کو کوئی جاندار کھا سکے، سوائے تھوڑے سے جَو کے، جو ایک الگنی میں رکھے ہوئے تھے، میں اس میں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد بھی برابر کھاتی رہی، یہاں تک کہ جب اس پر طویل زمانہ گزرا تو میں نے یہ دیکھنے کے لیے کہ اب کتنے رہ گئے ہیں اس کو ناپا۔ بس! پھر (اس میں سے برکت ختم ہوگئی اور) وہ جو ختم ہو گئے۔

افادات:- یہاں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کھانے پینے کی کوئی فراوانی نہیں تھی، اور جیسا کہ پہلے آچکا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تو یہ چیز بھی آپ کو حاصل ہو جاتی لیکن آپ نے اپنے لئے اسی چیز کو پسند کیا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ترکہ

۴۷۵-وعن عمرو بن الحارث أَخِيْ جُوَيْرِيَّةَ بِنْتِ الحَارِثِ أُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: مَا تَرَكَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عِنْدَ مَوْتِه دِيْنَاراً وَلاَ دِرْهَماً، وَلاَ عَبْدًا وَلاَ أَمَةً، وَلاَ شَيْئاً إِلاَّ بَغْلَتَهُ الْبَيْضَاءَ الَّتِيْ كَانَ يَرْكَبُهَا، وَسِلاَحَهُ، وَأَرْضًا جَعَلَهَا لِابْنِ السَّبِيْلِ صَدَقَةً۔

ترجمہ:- حضرت عمرو بن حارث رضی اللہ عنہ جو اُم المؤمنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے بھائی

ہیں، فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی موت کے وقت نہ تو کوئی سونے کا سکہ چھوڑا، نہ چاندی کا، نہ کوئی غلام، نہ باندی، نہ کوئی اور چیز، سوائے آپ کا سفید خچر جس پر آپ سواری فرماتے تھے، اور آپ کے ہتھیار، اور ایک زمین جس کی آمدنی آپ نے مسافروں کے لئے وقف فرمائی تھی۔

افادات:- اور اس میں سے بچی ہوئی آمدنی کو مسلمانوں کی ضرورتوں پر خرچ کرتے تھے۔ اور جو زمین آپ نے چھوڑی تھی اس کو بھی آپ نے اپنے بعد مسافروں کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس لیے آدمی یہ نہ سوچے کہ میں دنیا سے ایسی حالت میں جارہا ہوں کہ اپنے بال بچوں کے لئے میں نے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔ عام طور پر آدمی یہ بھی سوچ کر زیادہ دنیا حاصل کرنے کی فکر کرتا ہے۔ حالاں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پیچھے کوئی مال و دولت نہیں چھوڑی، اگر یہ مطلوب اور پسندیدہ چیز ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ایسا ضرور کرتے۔

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے احوال

۴۷۶- وعن خبابِ بن الأرَتِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: هَاجَرْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نَلْتَمِسُ وَجْهَ اللهِ تَعَالىٰ، فَوَقَعَ أَجْرُنَا عَلَى اللهِ، فَمِنَّا مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَأْكُلْ مِنْ أَجْرِهِ شَيْئاً، مِنْهُمْ: مُصْعَبُ بنُ عُمَيْرٍ رضی اللہ عنہ قُتِلَ يَوْمَ أُحُدٍ، وَتَرَكَ نَمِرَةً، فَكُنَّا إِذَا غَطَّيْنَا بِهَا رَأْسَهُ، بَدَتْ رِجْلَاهُ، وَإِذَا غَطَّيْنَا بِهَا رِجْلَيْهِ، بَدَا رَأْسُهُ، فَأَمَرَنَا رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم أَنْ نُغَطِّي رَأْسَهُ، وَنَجْعَلَ عَلىٰ رِجْلَيْهِ شَيْئاً مِنَ الإِذْخِرِ، وَمِنَّا مَنْ أَيْنَعَتْ لَهُ ثَمَرَتُهُ، فَهُوَ يَهْدِبُهَا۔

(النَّمِرَةُ): كِساءٌ مُلَوَّنٌ مِنْ صُوفٍ. وَقَوْلُه: (أَيْنَعَتْ) أَيْ: نَضِجَتْ وأَدْرَكَتْ. وقولُهُ: (يَهْدِبُها) هُوَ بِفَتْحِ الْيَاءِ وَضَمِّ الدَّالِ وَكَسْرِهَا لُغَتَانِ: أَيْ:

يَقْطُفُهَا وَيَجْتَنِيْهَا، وَهَذِهِ اسْتِعَارَةٌ لِمَا فَتَحَ اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِمْ مِنَ الدُّنْيَا وَتَمَكَّنُوا فِيْهَا۔

ترجمہ مع تشریح:- حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی (مکہ مکرمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ آئے) اور اپنے اس عملِ ہجرت سے خالص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی طلب کر رہے تھے، اس لیے ہمارے اس عمل کا اجر اللہ تعالیٰ کے یہاں یقینی ہے۔ پس ہم میں سے بعض تو ایسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے کہ انہوں نے اپنے اس نیک عمل کا اجر و بدلہ دنیا میں نہیں لیا، انہی میں سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ہیں کہ جنگِ اُحد میں شہید ہوئے اور انہوں نے رنگین قسم کی ایک چادر چھوڑی تھی، اور وہ بھی اتنی چھوٹی تھی کہ جب اس میں ان کو کفن دیا گیا تو اگر ان کے سر کو چھپایا جاتا تھا تو پاؤں کھل جاتے تھے، اور پاؤں چھپایا جاتا تو سر کھل جاتا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سر کو چھپالو اور پاؤں کو ڈھانپنے کے لئے گھاس ڈال دیا گیا۔ اور ہم میں سے بعض وہ ہیں جن کے پھل پک گئے تو وہ ان کو استعمال کر رہے ہیں (یعنی دنیا میں انہوں نے ایسا زمانہ پایا کہ ان کے نیک عمل کا بدلہ دنیا میں بھی کچھ ان کو مل گیا، چنانچہ جن حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فتوحات کا زمانہ پایا اور ان کے پاس مالِ غنیمت میں بہت ساری دولت آئی، لیکن حضراتِ صحابہ دولت کے آنے کو اپنے لیے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔)

دنیا کی قدر و قیمت

۴۷۷ - وعن سهلِ بن الساعدی رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ، مَا سَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ.

ترجمہ:- حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر دنیا کی قدر و قیمت اللہ تعالیٰ کے یہاں مچھر کے پر کے برابر ہوتی تو اللہ تعالیٰ کسی

کافر کو پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ دیتا۔

افادات:- اس لیے اگر کسی کو دنیا کا مال اور عیش وآرام کی چیزیں میسر نہیں ہیں تو اس کی وجہ سے دل گرفتہ اور رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی خصوصی توجہ آخرت کی طرف کرے۔

دنیا ملعون ہے

۴۷۸- وعن أبي هريرة رضي الله عنه قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: أَلَا إِنَّ الدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ مَلْعُوْنٌ مَا فِيْهَا إِلَّا ذِكْرَ اللهِ تَعَالٰى، وَمَا وَالَاهُ وَعَالِماً وَمُتَعَلِّماً۔

(رواه الترمذي وقال: حديث حسنٌ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ دنیا ملعون ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ناپسندیدہ ہے) اور جو کچھ بھی دنیا میں ساز وسامان ہے وہ سب بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے، البتہ اللہ کا ذکر اور وہ تمام چیزیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ذکر سے قریب کرنے والی ہیں، اور علم سکھانے والا اور علم سیکھنے والا (اس سے مستثنیٰ ہیں۔)

افادات:- اس روایت کو لاکر بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ ہر وہ چیز جس کے ذریعہ سے آدمی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے؛ اس کو دنیا کا حصہ قرار نہیں دیا جائے گا اسی لیے بزرگوں کا قول نقل کیا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو تم کو تمہارے رب سے غافل کردے وہ تمہاری دنیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی آدمی دنیا کی بقدر ضرورت چیزیں اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑے بغیر حاصل کرتا ہے، اور ان سے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں مدد حاصل کرتا ہے تو اُس کو دنیا میں شمار نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ تو وہ چیز ہے جو اللہ کے ذکر اور اس کی یاد سے قریب کرنے والی ہے۔ اللہ کی یاد اور ہر وہ چیز جو اللہ کی یاد سے قریب کرنے والی ہو؛ وہ دنیا کا حصہ

قرار نہیں دیا گیا۔

اب اگر کسی نے اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے مطابق دولت کمائی یعنی کمانے میں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا موجب ہو، اور پھر اُس کو خرچ کرنے کا جب وقت آیا تو وہاں بھی کوئی ایسا انداز اختیار نہیں کیا جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ہو، بلکہ انہی چیزوں میں خرچ کیا جہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، اس صورت میں چاہے وہ کتنی ہی بڑی مقدار کیوں نہ ہو، اس کو دنیا میں شمار نہیں کیا جائے گا، اور ایک آدمی تھوڑی سی چیز حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے احکام توڑتا ہے، یا اس کو استعمال اس طرح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہے، تو وہ بھی دنیا میں داخل ہے اور وہ اس وعید کا حق دار بنے گا۔

بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ وہ تمام چیزیں اور کام جو آدمی کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق سے دور کر دیں، وہ تمام دنیا کہلائیں گے، اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

جائیداد مت بناؤ

۴۷۹-وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لَا تَتَّخِذُوا الضَّيْعَةَ فَتَرْغَبُوا فِي الدُّنْيَا۔ (رَوَاهُ الترمذی، وَقَالَ: حدیث حسنٌ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جائیداد مت بناؤ؛ ورنہ (دل میں) دنیا کی محبت پیدا ہوگی۔

افادات:- ''ضَيْعَةَ'' یعنی غیر منقول جائیداد۔ ایسی چیز جو اپنی جگہ پر رہنے والی ہے، مثلاً مکان بنایا، دوکان بنائی، فیکٹری لگائی، پلاٹ خریدا؛ یہ سب ''ضَيْعَةَ''

کہلاتی ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ چیزیں مت بساؤ، اس لئے کہ اس کے نتیجے میں آدمی کا دل دنیا کی طرف مائل ہوتا ہے۔

چوں کہ یہ باب زہد کے بارے میں قائم کیا گیا تھا کہ دنیا کی محبت دل میں نہ ہو، اس لیے ایسی تمام چیزیں جو دنیا کی محبت پیدا کرنے والی ہیں ان کو اختیار کرنے سے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ اگر آدمی ایسی چیزیں اپنی ضرورت کے مطابق اختیار کرتا ہے تو ضرورت کی حد تک ہی اختیار کرے، لیکن اس میں ایسا کوئی انداز اختیار نہ کرے جس کے نتیجے میں اُس کا دل دنیا میں مشغول ہو۔ بس! ضرورت کی حد تک اس کو برتے، لیکن دل اُس میں نہ لگائے، بلکہ دل تو اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لگائے۔

موت اس سے جلد دیکھتا ہوں

۴۸۰ - عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْروبن العاص رضی اللہ عنہما قَالَ : مَرَّ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَنَحْنُ نُعَالِجُ خُصّاً لَنَا، فَقَالَ: مَا هٰذَا؟ فَقُلْنَا: قَدْوَهٰى، فَنَحْنُ نُصْلِحُهٗ. فَقَالَ: مَا أَرَى الأَمْرَ إِلاَّ أَعْجَلَ مِنْ ذٰلِكَ. (رواہ ابوداؤد والترمذی بأسناد البخاری ومسلم)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم اپنے جھونپڑے کی مرمت کر رہے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہاں سے گزر ہوا تو پوچھا: کیا کر رہے ہو؟ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ جھونپڑا کمزور ہو گیا ہے اور ٹوٹ چکا ہے، ہم اس کی مرمت کر رہے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں موت کا معاملہ اس سے جلد دیکھتا ہوں۔

افادات:- آدمی مکان کی مرمت اسی لئے کرتا ہے کہ مرمت کرنے کے بعد اس میں رہائش اختیار کرے گا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ موت کب آتی ہے اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ آپ جھونپڑا درست کر رہے ہیں اسی درمیان موت

آجائے، یا جھونپڑا درست کرنے کے بعد اس جھونپڑے سے فائدہ اُٹھانے سے پہلے ہی موت آجائے۔ تو جو چیز جلد آنے والی ہے اس کی تیاری کی طرف دھیان پہلے دینا چاہیے۔

ذہن کی گردش

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جب مکان، دوکان یا فیکٹری بناتا ہے، یا ایسی چیزیں جو جائیداد کے قبیل سے ہوتی ہیں، ان کو بساتا ہے تو اس دوران آدمی کا ذہن اُدھر ہی چلتا ہے، اور اس تعمیر کے دوران طبیعت دھیرے دھیرے آخرت سے ہٹ کر دنیا کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ مثلاً فیکٹری بناتا ہے تو پورا ایک پروگرام اس کے ذہن میں چلتا ہے کہ ابھی تو فیکٹری بن رہی ہے، پھر اس کی مشینری لاؤں گا، پھر اس کے اندر پاور آئے گا، پھر اس کے اندر کام کاج شروع ہوگا، اس کا پروڈکشن ہوگا، پھر میں اس کی مارکیٹنگ کروں گا تو اتنا نفع ہوگا، پھر اس میں اتنی ترقی ہوگی وغیرہ۔ تو کتنے لمبے زمانہ کا پروگرام اور کتنا لمبا چوڑا پروسیجر (Procedure) سامنے ہے اور اسی کو وہ برابر سوچ رہا ہے۔ فیکٹری بنانے کا پلان اور اس کی ساری چیزیں ہمیشہ اس کے ذہن میں گردش کرتی رہتی ہیں، ایسا تو ہے نہیں کہ کسی وقت آئی اور نکل گئی، بلکہ اس کا ذہن اُدھر ہی چلتا ہے اور یہی سوچتا رہتا ہے، اور سوچتے سوچتے اس کا جی ادھر ہی لگ جاتا ہے، اور جو اصل مقصود تھا اور جدھر توجہ کرنی چاہیے تھی، اُدھر توجہ باقی نہیں رہتی۔ یہی حال مکان کی تعمیر کا ہوتا ہے، اور یہی حال دوکان کے کاروبار کا ہوتا ہے۔

مقصد سے توجہ نہ ہٹے

اس روایت میں بات تو جھونپڑے کی ہے، اور نیا جھونپڑا ابھی نہیں بنا رہے تھے، یا ایسا بھی نہیں تھا کہ جو بنا ہوا تھا اس کو گرا کر نیا بنا رہے تھے، بلکہ ٹوٹے ہوئے جھونپڑے

کی مرمت کی جارہی تھی۔ وہ کوئی فلیٹ تعمیر نہیں کررہے تھے، کوئی بنگلہ نہیں بنارہے تھے۔ حدیث کے الفاظ موجود ہیں "خُصًّا لَنَا"، اے اللہ کے رسول! ہمارا جھونپڑا ٹوٹ گیا ہے، اس کی مرمت کررہے ہیں۔ لیکن یہ مرمت ایسی چیز ہے کہ ہوسکتا تھا اس کے دوران آدمی یہ سوچنے لگ جائے کہ ذرا اچھی مرمت کریں تاکہ ایک سال تو چلے۔ تو گویا ایک سال تک کے لئے وہ اپنے ذہن سے اپنا ویزا تو بڑھوا ہی رہا ہے، اور اپنی سمجھ سے گویا وہ یوں سوچ رہا ہے کہ مجھے اب ایک سال تو دنیا میں رہنا ہی ہے، اس لیے نبی کریم ﷺ اُن کو متوجہ فرمارہے ہیں کہ معاملہ اس سے بھی زیادہ جلدی کا ہے، یعنی تم تو یہ سمجھ کر جھونپڑے کی مرمت کرتے ہو کہ ذرا ٹھیک کرلیں تاکہ سال دو سال چل جائے گا۔ تو یہ سال دو سال کا تم کیوں سوچ رہے ہو؟ یہ مرمت کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ تم نے اپنے لئے بہت کچھ آگے سوچ لیا ہے۔ چھ مہینے سوچا، یا سال دو سال سوچا۔ جھونپڑا تو ایک سال تک کا معاملہ ہے کہ ابھی یہ بارش کا زمانہ نکل جاوے اور آئندہ بارش تک چلے، اور فیکٹری تو بہت کچھ سوچواتی ہے۔ تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: "مَا أَرَى الْأَمْرَ إِلَّا أَعْجَلَ مِنْ ذَالِكَ".

یہ فرما کر دراصل نبی کریم ﷺ حضراتِ صحابہؓ کی تربیت فرمارہے ہیں کہ دیکھو! یہ ٹھیک بات ہے کہ جھونپڑا ٹوٹ گیا ہے اور مرمت کی ضرورت ہے، اس لئے مرمت کررہے ہو، لیکن مرمت کرتے وقت آدمی کو یہ چیز ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھنی چاہئے کہ پتہ نہیں مرمت کئے ہوئے اس جھونپڑے سے کتنا فائدہ اُٹھانے کی نوبت آتی ہے، ہمیں اللہ تعالیٰ کے سامنے جانا ہے، اس کے حضور پیش ہونا ہے، اپنی زندگی کے تمام اعمال کا جواب دینا ہے۔ اور جھونپڑا درست کرنے کے بعد پتہ نہیں اس میں رہنے کی نوبت آئے گی یا نہیں۔ اس کو ٹھیک کرنے کے دوران ایسا نہ ہو کہ اس کے ساتھ تمہارا تعلق اتنا زیادہ ہوجائے کہ تمہارا جی اسی میں لگ جائے اور تم موت کی طرف سے غافل

ہوجاؤ۔غور کیجیے کہ نبی کریم ﷺ صحابہ کرامؓ کی کیسی تربیت فرماتے ہیں۔ جہاں کوئی ایسا کام کرتے ہوئے دیکھا کہ اس کی وجہ سے اس کا دل دنیا کی طرف مائل ہورہا ہے تو اس موقعہ پر آپ ﷺ نے ایسا جملہ اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمادیا کہ اس سے دل ہٹے اور اپنے مقصود کی طرف متوجہ ہو۔

نعمتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا

کھانے پینے تک کی چیزوں میں نبی کریم ﷺ اس بات کا اہتمام فرماتے تھے۔ ترمذی شریف کی روایت ہے، حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ ایسے وقت گھر سے باہر تشریف لائے کہ عموماً اس وقت باہر نہیں نکلتے تھے اور نہ کسی سے ملاقات فرماتے تھے، اتنے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی وہاں آئے، تو آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے؟ کیوں آئے؟ انہوں نے جواب میں عرض کیا کہ اس لیے آیا ہوں تاکہ اللہ کے رسول سے ملاقات ہوجائے اور آپ کے چہرۂ انور کا دیدار کرلوں اور آپ کو سلام کرلوں۔ اتنے میں حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ وہ بھی گھر سے باہر نکلے ہیں۔ پوچھا: کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! بھوک کے تقاضہ سے بے چین ہوگیا اور کھانے کے لئے کچھ تھا نہیں، تو باہر نکلا ہوں۔تو نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَیں بھی بھوک محسوس کررہا ہوں۔یعنی آپ ﷺ بھی بھوک کے تقاضہ کی وجہ سے بے چین ہوکر باہر نکلے تھے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ فلاں انصاری صحابی (ابوالہیثم بن التیہان) کا کھجور کا باغ ہے، چلیں! آج ان کے یہاں جائیں۔ان صحابی کی خواہش بھی تھی کہ حضور ان کے باغ میں تشریف لائیں۔تینوں وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ صحابی تو نہیں ہیں، مگر ان کی بیوی موجود ہے۔ پوچھا: تمہارے شوہر کہاں گئے؟

کہا: وہ درختوں کو پانی پلا رہے ہیں، ان کو اطلاع کرائی تو وہ آئے اور حضور کو دیکھ کر آپ سے لپٹ گئے اور کہا: اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میری قسمت کہ آپ میرے یہاں تشریف لائے۔ بہت خوش ہوئے اور جلدی جلدی کھجوروں کے خوشے توڑ کر لائے، اور دودھ بھی لائے اور کہا: میں بکری ذبح کرتا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: دیکھو! دودھ دینے والی بکری ذبح مت کرنا، اس لیے کہ اس کے دودھ کا فائدہ ختم ہو جائے گا، جو بکری دودھ نہ دیتی ہو، وہ ذبح کرنا۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے۔ جانور ذبح کیا، گوشت پکایا اور حضور کے سامنے پیش کیا۔ آپ ﷺ نے تناول فرمایا، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے بھی تناول فرمایا۔ پھر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے یہی یعنی درخت کا سایہ، تازہ کھجور اور ٹھنڈا پانی، یہ سب اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں ہیں جن کے متعلق قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ﴾ کل قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے یہاں انہی نعمتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

(سنن ترمذی۔ باب ماجاء فی معیشۃ اصحاب النبی ﷺ۔ حدیث نمبر: ۲۳۶۹)

دراصل آدمی کو شدید بھوک کے تقاضے کے بعد جب کوئی چیز ملتی ہے، تو اس پر ایسا متوجہ ہوتا ہے کہ دوسری چیزوں سے غافل ہو جاتا ہے، تو نبی کریم ﷺ یاد دلا رہے ہیں کہ دیکھو! کھانے میں مشغول ہو کر اُدھر سے دھیان نہیں ہٹنا چاہیے۔

جب ہم احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہر ایسے موقعہ پر جہاں نبی کریم ﷺ یہ محسوس کرتے کہ دنیا کے اس کام میں لگ کر آدمی آخرت سے غافل ہو جائے گا تو آپ ﷺ آخرت کی طرف متوجہ کر دیتے۔ ویسے صحابہ کرامؓ کا حال بھی یہی تھا کہ نہ ان کے دلوں میں دنیا کی محبت تھی، وہ خود ہی دنیا سے بڑے بے رغبت تھے، اور جو کچھ آتا تھا

ہمیشہ خرچ کرنے والے تھے، اگر چہ ان کے پاس کچھ ہوتا ہی نہیں تھا، لیکن جو تھوڑا بہت میسر آجاتا تھا، اُس پر بھی نبی کریم ﷺ ان کی ایسی تربیت فرماتے تھے۔

عین حکمت کا تقاضہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لوگ تمنائیں کرتے ہیں کہ ہم بھی نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں موجود ہوتے۔ حالانکہ حضراتِ صحابہ کرامؓ نے جو مجاہدے کئے اور جو مشقتیں اُٹھائی ہیں، اور جس طرح کی قربانیاں دی ہیں، ان کا اگر ہم مطالعہ کریں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جس کو جس زمانہ میں پیدا کیا ہے وہ اس کی عین حکمت کا تقاضہ ہے۔ اگر ہم اُس زمانہ میں ہوتے تو معلوم نہیں کہ خدانخواستہ کس لسٹ میں نام آتا۔ اس لئے آدمی کو اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور قناعت کی صفت پیدا کرنی چاہیے۔

دور کی نہ سوچے

خیر! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جھونپڑا بناتے وقت کم سے کم آدمی کا یہ تصور ہوتا ہے کہ اس کو ایسا ٹھیک کرلوں کہ چھ مہینے چل جائے، ایک سال چل جائے۔ تو چھ مہینے اور ایک سال کا تصور جو دماغ میں آیا اس کو حضور اکرم ﷺ نکالنا چاہتے ہیں کہ ”میں تو معاملہ اس سے بھی زیادہ جلدی کا دیکھتا ہوں“ معلوم نہیں موت کب آجائے، اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ (۱) کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ نے رہنے کے لیے اطمینان کی رہائش دی ہے یعنی امن سے ہے، کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے (۲) اور بدن وجسم میں عافیت ہے، یعنی کوئی مہلک بیماری نہیں ہے (۳) اور اس کے پاس کھانے کے لیے ایک دن کی روزی موجود ہے؛ تو یوں سمجھو کہ اس کو ساری

دنیا ملی ہوئی ہے۔ تو بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ آدمی بہت آگے کی نہ سوچے۔

ایک بوڑھا تاجر اور اس کے عزائم!

آدمی جب مستقبل کی پلاننگ کرنے لگتا ہے تو ایک دو سال کی نہیں، بلکہ سالہا سال اور صدیوں تک کی پلاننگ کر ڈالتا ہے، گویا صدیوں دنیا میں رہنا ہے، اور پھر اپنی ہی نہیں، بلکہ اپنی آنے والی دو تین نسلوں کی فکر کر ڈالتا ہے کہ بس! اب تو مزے میں رہو۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قصہ بیان کیا ہے کہ میں ایک مرتبہ ایک تاجر کے یہاں مہمان ہوا، جب اس سے ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگا کہ میری تجارت فلاں ملک میں بھی ہے، اور فلاں ملک میں بھی ہے۔ بہت کچھ بتانے کے بعد پھر کہنے لگا کہ بس میری ساری تمنائیں پوری ہو چکی ہیں، اب ارادہ یہ ہے کہ تجارت کی غرض سے ایک آخری سفر کر لوں۔ یہاں ایران سے گندھک لے کر چین جاؤں گا، اور وہاں جا کر اس کو فروخت کروں گا، اس لئے کہ وہاں اس کی ڈیمانڈ بہت ہے، اس سے وہاں بہت منافعہ ملے گا۔ پھر وہاں سے چینی برتن لے کر روم جاؤں گا، وہاں اس کو فروخت کروں گا، وہاں اس کی بڑی ڈیمانڈ ہے۔ اور روم سے کپڑا لے کر ہندوستان جاؤں گا، وہاں اس کو فروخت کروں گا، اس سے وہاں بہت نفع آئے گا۔ پھر ہندوستان سے فولاد خریدوں گا، وہ لے کر حلب جاؤں گا۔ وہاں کا شیشہ بڑا عمدہ ہوتا ہے، اس لئے وہاں سے شیشہ خریدوں گا، وہ لے کر یمن جاؤں گا، اس کو وہاں بیچوں گا۔ اور یمن سے یمنی چادر لا کر یہاں ایران میں بیچوں گا۔ بس! پھر ایک دوکان کھول کر اطمینان سے بیٹھ جاؤں گا۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں سوچ رہا تھا کہ ابھی اس وقت ہی زندگی کے آخری مرحلے میں ہے اور اتنا لمبا سفر کرنے کے بعد بھی یہ نہیں سوچتا کہ مسجد

میں بیٹھوں گا، بلکہ ایک دوکان کھول کر اطمینان سے بیٹھ جاؤں گا۔ بس! میری اتنی ہی تمنا باقی ہے۔ پھر اس نے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ تم بھی کچھ سناؤ تو شیخ نے فرمایا:

آں شنیدستی کہ در صحرائے غور	بار سالارے بیفتاد از ستور
گفت چشم تنگ دنیادار را	یا قناعت پر کند یا خاک گور

ترجمہ:- تم نے سنا ہے غور کے صحرا میں ایک بڑے سپہ سالار اور بڑے مالدار تاجر کا سامان ایک اونٹ پر تھا، وہ اونٹ مارے بھوک کے اِدھر گرا اور اس کا سامان اُدھر گرا، پھر اس نے ایک بات کہی کہ دنیادار کی ان تنگ نگاہوں کو یا تو قناعت بھر سکتی ہے یا پھر قبر کی مٹی۔ ورنہ آدمی کی حرص ایسی عجیب وغریب چیز ہے کہ بس وہ اپنے طور پر مال جمع کرتا ہی رہتا ہے اور اس کی حرص ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔

ایک مالدار کا عبرت ناک واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک یہودی مالدار کا قصہ لکھا ہے کہ ایک بڑا مالدار آدمی تھا، اس کے پاس سونے چاندی کے ڈھیر تھے، اس نے اپنے خزانے کی چابی پر ایک نگران مقرر کر رکھا تھا جو اس کی حفاظت کرتا تھا، ایک مرتبہ اس نے سوچا کہ اس نگران دربان کا امتحان لینا چاہیے کہ وہ کہیں میرے خزانے میں خیانت تو نہیں کرتا۔ وہ رئیس خود ہی خزانے پر پہنچ گیا اور جس مکان کے اندر یہ خزانہ محفوظ تھا، اس کی چابی اس کے پاس بھی رہتی تھی، اپنی چابی سے دروازہ کھول کر اندر گیا اور دیکھا کہ سب ٹھیک ہے یا نہیں۔ اسی درمیان وہ دربان آیا تو اس نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے، تو اس نے دروازہ بند کر دیا، اور تالا لگا دیا۔ اس کو پتہ ہی نہیں تھا کہ اندر مالک موجود ہے۔ جب مالک صاحب دروازے کی طرف آئے تو دیکھا کہ دروازہ باہر سے بند ہے، تو خوب شور

مچایا اور آوازیں لگائیں، لیکن کسی نے سنی ہی نہیں۔ جب بھوک لگی تو نہ چاندی اور سونے سے بھوک مٹا سکتا تھا، نہ پیاس بجھا سکتا تھا۔ وہیں چاندی اور سونے کے ڈھیر تھے، اسی میں وہ مر گیا۔ بعد میں جب دروازہ کھولا گیا تو پتہ چلا کہ وہ مرا ہوا ہے۔

توکل پر بصیرت افروز مضمون

اب کوئی آدمی یوں کہے کہ مولوی صاحب! کسی کو اگر ایک دن کا کھانا ملے تو کیا دوسرے دن کھانا نہیں چاہیے؟ تو بھائی دیکھئے! قرآنِ کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ زمین کے اندر جتنے بھی جاندار ہیں ان کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ تو جس اللہ نے آج روزی دی ہے وہی اللہ کل بھی دے گا۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایسا توکل کرو جیسا کہ کرنا چاہیے، تو وہ تم کو پرندوں کی طرح روزی دے گا کہ وہ صبح اپنے گھونسلے سے خالی پیٹ نکلتے ہیں، اور شام کو جب واپس آتے ہیں تو پیٹ بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ کیا انہوں نے کہیں دوکان لگائی ہے؟ کوئی فیکٹری لگائی ہے کوئی تجارت اور کاروبار شروع کیا ہے؟ نہیں! بلکہ صبح جس وقت وہ اپنے گھونسلوں سے نکل رہے ہوتے ہیں اس وقت ان کا کوئی متعین پروگرام بھی نہیں ہوتا ہے، لیکن شام کو اللہ تعالیٰ ان کو پیٹ بھر کر واپس کرتے ہیں۔

اس پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اکابرین نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی پاؤں توڑ کر بیٹھا رہے۔ بلکہ پرندے صبح کے وقت اپنے گھروں اور گھونسلوں سے نکلے، گھونسلوں میں بیٹھے نہیں رہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ جب نکلے تو صرف آج ہی کی فکر لے کر نکلے تھے، کل کی فکر لے کر نہیں نکلے تھے۔ اور یہ

انسان جو پریشانیوں میں مبتلا ہوتا ہے وہ اس لئے کہ آج ہم یہاں بیٹھے بیٹھے دس سال آگے کی فکر کرتے ہیں، تو اب ٹینشن نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ اگر آج ایک دن کی فکر کرلیں، تو کوئی ٹینشن نہیں ہے اور مسئلہ بہت ہی آسان ہے۔ بلکہ بہت سے لوگوں کے پاس تو سالوں کا موجود ہوتا ہے، اور ان کی پوری دونسلوں کا موجود ہوتا ہے، مگر پھر بھی وہ زیادہ ہی کی فکر میں پڑے ہوئے ہیں، حقیقت میں دنیا کی حرص ختم نہیں ہوسکتی۔

یہ بھی دیکھا؛ وہ بھی دیکھ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ میں لاس اینجلس گیا، تو وہاں ہمارے ایک دوست مجھے ایک بازار میں لے گئے، اور کہنے لگے کہ یہ دنیا کا سب سے مہنگا بازار ہے۔ یہاں جتنی قیمت سے چیزیں ملتی ہیں دنیا میں اور کہیں نہیں ملتی۔ یہاں موزوں کی ایک جوڑ دو ہزار ڈالر میں ملتی ہے۔ اور ایک ٹائی تین ہزار ڈالر میں ملتی ہے۔ ایک سوٹ دس ہزار، بیس ہزار، تیس ہزار، اور ایک لاکھ ڈالر تک ملتا ہے۔ اور ایک دوکان تو انہوں نے مجھے ایسی بتلائی کہ اس کے دو حصے ہیں، ایک نچلا اور دوسرا اوپر والا۔ نچلے حصے میں تو آپ خریداری کے لیے جاسکتے ہیں لیکن اوپر والے حصے میں آپ نہیں جاسکتے۔ اگر اوپر والے حصے میں آپ کو جانا ہو، تو پہلے سے (Appointment) لینا پڑتا ہے۔ اور مالک خود آکر آپ کو لے جائے گا، اور وہ آپ کو دیکھ کر مشورہ دے گا کہ یہ سوٹ آپ پر مناسب ہے یا دوسرا کوئی سوٹ بہتر رہے گا۔ اور صرف اس مشورے کے بھی وہ دس پندرہ ہزار ڈالر فیس لیتا ہے۔ اور بتایا کہ چارلس جو برطانیہ کا شہزادہ تھا، اس نے (Appointment) لیا تو اس کو چھ مہینے بعد کا وقت دیا۔ دنیا کی دولت کا یہ حال ہے۔

پھر مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ اس بازار سے نکل کر ہم اسی لاس اینجلس میں ایک کلومیٹر آگے بڑھے تو وہاں دیکھا کہ ٹرافک سگنل پر کچھ لوگ بھیک مانگ رہے تھے ہمارے ساتھی سے بھیک مانگی تو اس نے کہا کہ میرے پاس چلّر نہیں ہے، تو بھکاری نے یوں کہا کہ: مجھے ایک ڈالر نہیں چاہیے، مجھے تو صرف دس پینس دے دو، میرا پیٹ بھوک کی وجہ سے خالی ہے۔

ٹینشن: ناشکری کی سزا

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ دیکھو! جب دولت کی فراوانی ہوتی ہے تو اس کی بھی کوئی انتہاء نہیں ہوتی، اور آدمی کی حرص بڑھتی ہی رہتی ہے۔ آدمی خود ہی اپنی ضرورتیں بڑھاتا رہتا ہے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ تعلیم سامنے ہونی چاہیے کہ دنیا کے معاملہ میں آپ اپنے سے نیچے والے کو دیکھئے، اوپر والے کو نہ دیکھئے، تب ہی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا ہو سکے گا۔ اصل تو یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرتا رہے۔

آج ہمارا مزاج دنیا کی حرص کی وجہ سے، قناعت نہ ہونے اور دنیا کی محبت دل میں ہونے کی وجہ سے ایسا بن گیا ہے کہ سب کچھ ہے، بہترین مکان ہے، فرنیچر ہے، کاروبار چل رہا ہے، پھر بھی پوچھو کہ کیا حال ہے؟ تو کہتے ہیں کہ بس چل رہا ہے، گزر رہی ہے، Time pass ہو رہا ہے۔ بھائی! اتنی ساری نعمتیں موجود ہیں پھر بھی ایسا کیوں کہتے ہو؟ تو کہتے ہیں کہ بس! آج کل مندی چل رہی ہے۔ اس ایک مندی کی وجہ سے ایسا ٹینشن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہزاروں لاکھوں نعمتوں کے باوجود ناشکری ہے حالاں کہ ٹینشن اسی ناشکری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آدمی اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا مزاج بنالے تو سارے مسئلے آسان ہو جائیں۔ ہر ایک کی الگ ذہنیت ہوتی ہے۔

شریعت ہم کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو، اگر شکر ادا کرو گے تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنی نعمتوں میں اضافہ کروں گا۔

شکر گزاری کا نرالا انداز

ہمارے بزرگوں میں ایک بزرگ گزرے ہیں، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت میاں صاحب کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا مزار راندیر کے قبرستان میں ہے۔ اصل دیوبند کے رہنے والے ہیں۔ ہمارے اکابرین میں سے ہیں اور ابوداود شریف پڑھایا کرتے تھے، ہماری سند میں ان کا نام آتا ہے۔ ایک مرتبہ وہ بیمار تھے، سخت بخار تھا۔ کسی نے پوچھا: حضرت! کیا حال ہے؟ تو کہنے لگے کہ الحمد للہ! میری آنکھیں سلامت ہیں، ناک سلامت ہے، کان سلامت ہے، ہاتھ سلامت ہے، پاؤں سلامت ہے، اللہ تعالیٰ نے گھر میں عافیت کے ساتھ رکھا ہے۔ بہت کچھ گنوایا، پھر کہا: بس! تھوڑا سا بخار ہے۔ یہ بھی بیان کرنے کا ایک انداز ہے۔ حالاں کہ اس وقت وہ شدید بخار میں مبتلا تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ان ساری نعمتوں کو شمار کرانے کے بعد اس کو ایسے انداز سے بیان کیا کہ بس ذرا بخار ہے، باقی تو سب الحمد للہ ٹھیک ہے۔ یہ بھی ایک انداز ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کسی کے پاس اگر گلاس ہو، اور آدھا دودھ سے بھرا ہوا ہو، تو جو شکر گزار آدمی ہوگا، وہ یوں کہے گا کہ آدھا گلاس دودھ میرے پاس ہے، اور جو ناشکرا ہوگا وہ کہے گا کہ آدھا گلاس خالی ہے، شکر گزار بھرے ہوئے کو دیکھے گا اور ناشکرا خالی حصہ کو دیکھے گا۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں ہیں، آدمی اُنہی کو دیکھے۔ جتنا ان کو دیکھے گا اور شکر ادا کرے گا، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نعمتوں میں اضافہ ہوگا۔

ایک ہی سوال مالدار اور غریب سے

باقی دنیوی اعتبار سے حالات کا ہونا کوئی عجیب بات نہیں، اس لیے کہ دنیا ہے ہی ایسی جگہ جہاں آدمی سو فیصد اپنے آپ کو مطمئن نہیں پا سکتا۔ میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ اس دنیا کا جو سب سے مالدار ترین انسان ہے، اس سے آپ جا کر پوچھ لیجئے کہ بھائی! تمہاری ساری تمنائیں پوری ہوگئیں؟ اور کسی غریب سے بھی یہی سوال پوچھ لیجئے؛ تو میں سمجھتا ہوں کہ غریب تو یوں کہے گا کہ ایک دو باقی ہیں، لیکن مالدار کہے گا کہ بہت ساری تمنائیں ابھی باقی ہیں، اس لیے آدمی ان باتوں کی طرف ذرا دھیان دے اسی کو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''مَا أَرَى الْأَمْرَ إِلَّا أَعْجَلَ مِنْ ذَالِكَ'' آدمی ہر وقت یہی سوچتا رہے۔ لمبے لمبے پلان ہی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی ناشکری کی طرف لے جاتے ہیں۔

اُمتِ محمدیہ کا فتنہ

۴۸۱- وعن كعب بن عياض رضي الله عنه قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: إِنَّ لِكُلِّ أُمَّةٍ فِتْنَةً وَفِتْنَةُ أُمَّتِي الْمَالُ۔ (رواه الترمذي، وقال: حديثٌ حسنٌ صحيحٌ)

ترجمہ:- حضرت کعب بن عیاض رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر امت کے لیے ایک فتنہ ہے، اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔

افادات:- ایسے حالات اور ایسی چیزیں جن کے ذریعہ سے کسی کو آزمایا جائے؛ اس کو عربی زبان میں ''فتنہ'' کہتے ہیں، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کون کتنا اللہ تعالیٰ کے حکم پر چلنے والا ہے، اور کون کتنا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والا ہے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر اُمت کے لئے کوئی ایسی چیز رکھی ہے جس کے ذریعہ سے اس کو آزماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ میری اُمت کو مال کے ذریعہ سے آزمائیں گے۔ مال

ہی کے معاملہ میں پتہ چلے گا کہ کتنا شریعت پر چلتا ہے اور کتنا ہٹا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام پر کتنا عمل کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو کتنا توڑتا ہے۔ اس لئے مال کو کمانے اور خرچ کے معاملہ میں آدمی کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب نہ کرے۔ قیامت کے روز سب سے پہلے جن چیزوں کے متعلق سوال ہوگا اس میں مال کے متعلق بھی پوچھا جائے گا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو کمانے میں تو اہتمام کرتے ہیں کہ کسی ناجائز چیز کا ارتکاب نہ ہو، لیکن خرچ کرنے کے معاملہ میں اہتمام نہیں کرتے۔ حالانکہ شریعت نے ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے کو فضول خرچی بتلایا ہے۔ فضول خرچی کا مطلب کیا ہے؟ ضرورت جتنے میں پوری ہوتی ہو اس سے زیادہ خرچ کرنا؛ اس کو فضول خرچی کہتے ہیں۔

مکان کے مختلف درجات

آپ کہیں گے کہ مولوی صاحب! آپ تو جھونپڑے کی بات کر رہے ہیں، ہم جھونپڑے میں کیسے رہیں گے؟ تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی! ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ اونچا مقام جو حضراتِ صحابہ کرامؓ کو حاصل تھا، تم بھی حاصل کرو، وہ مقام تو حاصل کرنا بھی ہمارے لئے مشکل ہے، لیکن شریعت کی حدود کی تو ہمیں پوری پوری رعایت کرنی چاہیے۔ اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مکان کے مختلف درجات بتلائے ہیں، اس اصول کو آپ ہر چیز میں جاری کر سکتے ہیں۔

رہائش

فرمایا کہ: ایک مکان تو آدمی کی رہائش یعنی رہنے کی ضرورت کا ہوتا ہے کہ آدمی کے پاس ایسا کوئی انتظام ہو جس میں وہ اپنے آپ کو گرمی، سردی، بارش وغیرہ سے

بچا سکے، اگر آپ نے چار ڈنڈے لگا کر اس کے اوپر پلاسٹک ڈال دیا، تو ضرورت پوری ہوجائے گی، اور گرمی سردی بارش سے بھی بچاؤ ہوجائے گا؛ یہ رہائش کہلاتی ہے۔

آسائش

رہائش کے بعد دوسرا درجہ آسائش اور راحت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیز دھوپ آئے گی تو ایسے مکان میں گرمی لگے گی، بارش میں پانی ٹپکے گا، اس لیے اور کچھ راحت حاصل کرنے کے لیے آپ نے اس مکان کو پختہ بنالیا، ایسا پختہ مکان جس میں آپ گرمی کی تیزی سے اپنے آپ کو بچالیں اور کچھ راحت سے رہیں؛ تو یہ آسائش کا درجہ ہے اور یہ بھی جائز ہے۔ اصل ضرورت تو پہلے والے سے پوری ہو رہی تھی لیکن اس کے بعد جو آسائش اور راحت کا درجہ تھا، اس کی بھی اجازت ہے۔

آرائش

پھر تیسرا درجہ آرائش کا آتا ہے کہ اپنے جی کو ذرا ٹھیک لگے، مثلاً آپ نے بھلے ہی پکا مکان بنایا، لیکن پلاسٹر نہیں کیا، رنگ وروغن کا درجہ تو بعد کا ہے، تب بھی اس میں آپ آرام سے رہ سکتے ہیں، لیکن جی کو ذرا اچھا لگے اس لیے پلاسٹر بھی کرایا، رنگ وروغن بھی لگایا؛ تو یہ آرائش ہے۔ اپنے جی کو خوش کرنے اور اپنی طبیعت میں سکون پانے کے لیے ذرا ٹھیک ٹھاک کرنا؛ یہ بھی جائز ہے۔

نمائش

لیکن چوتھا درجہ نمائش اور دکھلاوے کا ہے۔ لوگ کہیں کہ یہ بلڈنگ فلاں کی ہے اور اس حویلی کے مالک فلاں سیٹھ صاحب ہیں، اور یہ فلیٹ فلاں صاحب کا ہے،

اور ساری دنیا دیکھنے کے لیے آتی ہے، لوگوں میں چرچا ہے کہ ان کے یہاں کا ڈیکوریشن تو جا کر دیکھو، ان کی رہائش تو جا کر دیکھو کہ کیسی بنائی ہے۔ اور پھر آدمی یہ سوچے کہ میرے یہاں ہر چیز موجود ہو، اگر میں ایسا نہیں بناؤں گا تو لوگ کہیں گے کہ میں جس Area میں رہتا ہوں، میرا مکان اس Area کے مناسبِ حال بھی نہیں ہے۔ لوگ کہیں گے کہ تھرڈ کلاس (Third Class) آدمی یہاں کہاں آ گیا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ لوگوں میں ایسا چرچا نہ ہو، لوگ مجھے (Third Class) اور گھٹیا نہ سمجھیں، میں جس پوش ایریا (Posh Area) میں رہتا ہوں اس میں میرا مکان ایسا ہونا چاہیے، حالاں کہ اس مکان میں بظاہر کوئی کمی نہیں ہے، پھر بھی اس کا سب سامان نکلوایا اور پھر نیا بنایا؛ یہ نمائش کہلاتی ہے جو حرام ہے، اس کی شریعت بالکل اجازت نہیں دیتی۔

اور یہ بات بھی یاد رہے کہ نمائش کی کوئی انتہا نہیں ہے، اس سلسلہ میں آدمی کی حرص بڑھتی رہتی ہے اور جیسا کہ بتایا کہ ایک ٹائی تین ہزار ڈالر کی بھی آسکتی ہے، اور ایک سوٹ ایک لاکھ ڈالر کا بھی آئے گا، تب بھی کمی پوری ہونے والی نہیں ہے۔ اس لیے آدمی اپنی اصلی ضرورت پر نظر رکھے، شریعت بھی یہی چاہتی ہے اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی یہی ہے۔

اس کے علاوہ کوئی حق نہیں

۴۸۲ - وَعَن اَبِي عَمرو، وَيُقَالُ أَبو عبدِالله، وَيُقَالُ أَبُوليلى عُثْمَان بن عفان رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: لَيْسَ لِابْنِ آدم حَقٌّ فِي سِوٰى هٰذِهِ الْخِصَالِ؛ بَيْتٌ يَسْكُنُهُ وَثَوْبٌ يُوَارِيْ عَوْرَتَهُ، وَجِلْفُ الْخُبْزِ وَالْمَاءِ۔ (رواه الترمذي وقال: حديثٌ صحيحٌ)

وقَالَ الترمذي: سَمِعتُ أَبَا دَاوُد سُلَيْمَانَ بنِ سَالِم الْبَلْخِيَّ يَقُوْلُ: سَمِعْتُ

النَّضرَ بْنَ شُمَيْل يَقُوْلُ: الْجِلْفُ: الْخُبْزُ لَيْسَ مَعَهُ إِدَامٌ، وَقَالَ غَيْرُهُ: هُوَ غَلِيْظُ الْخُبْزِ. وقَالَ الْهَرَوِيُّ: الْمُرَادُ بِهِ هُنَا وِعَاءُ الْخُبْزِ، كَالْجَوَالِقِ والْخُرْجِ. والله أعلم.

ترجمہ:- حضرت عثمان بن عفانؓ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انسان کو چند باتوں کے سوا کوئی حق نہیں، ایک تو ایسا مکان جس میں رہائش اختیار کرے کہ اس میں گرمی، سردی، بارش، دھوپ سے اپنا بچاؤ کر لے۔ اور اتنا کپڑا جس سے اپنا بدن ڈھانپ لے اور اپنا سر چھپالے۔ اور روٹی کا موٹا ٹکڑا، اور پانی۔

افادات:- رہنے کا ایسا گھر جس میں رہائش کی ضرورت پوری ہوجائے، اس میں بنگلہ نہیں گنا جاتا۔ بس! اس کے علاوہ آدمی کا کوئی حق نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر آدمی کی اتنی ضرورت پوری ہوجائے تو آدمی کو دوسری کسی چیز کی حرص اور لالچ میں رہنا نہیں چاہیے، آدمی کو چاہیے کہ حرص اور لالچ سے اپنے آپ کو بچائے۔

فَضْلُ الزُّهْدِ فِي الدُّنْيَا وَالْحَثُّ عَلَى التَّقَلُّلِ مِنْهَا وَفَضْلُ الْفَقْرِ

دنیا کے معاملہ میں زہد اختیار کرنے کی فضیلت اور ساز وسامان میں کمی رکھنے کی ترغیب اور فقر کی فضیلت

﴿ مجلس ۵ ﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۹/ذی قعدۃ الحرام ۱۴۲۰ھ ۲۶/فروری ۲۰۰۰ء

انسان کا حقیقی مال

۴۸۳ - وعن عبد الله بن الشِّخِّيرِ - بِكَسْرِ الشِّيْنِ وَالْخَاءِ الْمُعْجَمَتَيْنِ. أَنَّهُ قَالَ: أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَهُوَ يَقْرَأُ (أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ) قَالَ: يَقُوْلُ ابْنُ آدَمَ: مَالِيْ، مَالِيْ، وَهَلْ لَكَ يَاابْنَ آدَمَ مِنْ مَالِكَ إِلاَّ مَا أَكَلْتَ فَأَفْنَيْتَ، أَوْ لَبِسْتَ فَأَبْلَيْتَ، أَوْ تَصَدَّقْتَ فَأَمْضَيْتَ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ سورۂ "أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ" کی تلاوت فرمارہے تھے۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا: انسان کہتا ہے: میرا مال، میرا مال؛ لیکن اے انسان! تیرے لیے تیرے مال میں سے اس کے علاوہ اور کیا ہے جو تونے کھایا اور ختم کیا، یا پہنا اور اس کو پرانا کیا، یا اللہ کے راستہ میں صدقہ کیا اور ذخیرہ کرلیا۔

افادات:- شروع باب میں سورۂ "أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ" کی تشریح آچکی ہے اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ مال ودولت اور دنیا کے ساز وسامان کی کثرت نے تم کو غفلت میں ڈال دیا ہے۔ اس لیے آدمی جو کماتا اور جمع کرتا ہے تو یوں سمجھتا ہے کہ میرا مال ہے، اور مال کی نسبت اپنی طرف کرتا ہے۔ اور ظاہری اعتبار سے وہ مال اس کی ملکیت میں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ مال کے ملکیت میں ہونے کی وجہ سے اس کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟ حقیقی فائدہ تو اسی وقت پہنچا ہوا سمجھا جائے گا جب وہ اس کو اپنی دنیا یا آخرت کی کسی ضرورت میں استعمال بھی کرے۔ اسی کو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ

اے انسان! تیرے لئے تیرے مال میں سے اس کے علاوہ اور کیا ہے جو تو نے کھایا اور ختم کیا، یا پہنا اور اس کو پرانا کیا، یا اللہ کے راستہ میں خرچ کیا اور ذخیرہ کرلیا۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی اگر اپنی بنیادی ضرورتوں میں اس مال کو استعمال کرتا ہے تب تو ٹھیک ہے کہ وہ مال اس کے لئے کارآمد ہوا۔ مثلاً کھانے پینے میں یا لباس میں استعمال کیا، یا اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کیا، تو وہ اس کے لئے بطور ذخیرہ کے اللہ تعالیٰ کے یہاں جمع ہوا اور اللہ تعالیٰ کے یہاں آخرت میں اس کا اجر و ثواب ملے گا۔ باقی یہ کہ نہ تو اس نے اپنی ضرورتوں میں استعمال کیا، نہ اللہ کے راستہ میں خرچ کیا تو زندگی بھر وہ مال اس کی ملکیت میں رہا لیکن سوائے اس کے کہ وہ اس مال کی نسبت اپنی طرف کرتا رہا اور خوش ہوتا رہا کہ یہ سب میرا مال ہے، اور کوئی فائدہ اور نفع اس کو نہیں پہنچا۔

دوسروں کے مال کا محافظ

اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کون ایسا ہے کہ اس کو دوسرے کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہر ایک کو اپنا ہی مال محبوب ہوتا ہے، دوسرے کے مال سے کیا محبت رکھنی؟ اگر کسی کے پاس مال دولت ہے تو اس کے ساتھ تعلق و محبت ہوتی ہے، کسی اور کے پاس چاہے کروڑوں اور اربوں کی دولت بھی ہو، تو اس سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ اس سے محبت ہوتی ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بھائی! اپنا تو وہی ہے جو کھالیا اور ختم کردیا، یا پہن لیا اور پرانا کردیا، یا پھر اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کردیا؛ باقی جو کچھ بھی ہے وہ سب دوسروں کا ہے۔ آدمی زندگی بھر یہ سمجھتا ہے کہ میں اس سب مال کا مالک ہوں، اور اسی کی طرف نسبت بھی کی جاتی ہے، اسی کے خزانے میں جمع رہتا ہے،

اور اس کے کھاتہ اور اکاؤنٹ میں محفوظ رہتا ہے، لیکن سوائے اس کے کہ وہ اس کی حفاظت کرتا رہتا ہے اور کچھ نہیں کرتا، جب موت آتی ہے تو وہی سب مال اس کے وارثوں کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، پھر وہ لوگ اس کو اپنے استعمال میں لاتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ حقیقی طور پر آدمی غور کرے تو اپنا مال تو وہی ہے جو دنیوی اعتبار سے یا اخروی اعتبار سے اپنے کام میں آیا، اگر اللہ تعالیٰ کے یہاں ذخیرہ بنایا ہے تو وہی اپنا ہے

اصل ضرورت بہت ہی کم ہے

یہ ارشاد فرما کر گویا اس بات کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے کہ اگر آدمی اپنی حقیقی ضرورت پر غور کرے تو اس کی اصلی ضرورت کتنی ہوتی ہے؟ مثلاً ایک آدمی نے بہت بڑا بنگلہ بنایا جس کے اندر سو کمرے بنائے، اور ہر ایک میں بیڈ ہے، اور بہتر سے بہتر بستر بھی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ایک وقت میں وہ ایک ہی کمرہ استعمال کرے گا اور ایک ہی بستر پر سوئے گا۔ سو کمرے ایک ہی وقت میں استعمال میں آنہیں سکتے، ضرورت تو ایک ہی سے پوری ہوتی ہے۔

اسی طریقہ سے اگرچہ کئی جوڑے لباس کے اس نے اپنے لئے بنوالئے، لیکن ایک وقت میں تو وہ ایک ہی جوڑا استعمال کرے گا، بلکہ اگر ایک سے زیادہ استعمال کرے تو لوگ کہیں گے کہ شاید اس کے دماغ میں خلل ہے اور عقل میں فتور ہے کہ ایک سے زیادہ جوڑے ایک ساتھ پہن لیے۔ تو ظاہر ہے وہ تو اچھا بھی نہیں سمجھا جاتا اور اس کو اس کے فتورِ دماغی پر محمول کیا جاتا ہے۔ تو چاہے جتنے بھی کپڑے ملکیت میں ہوں لیکن ایک وقت میں اس کی ضرورت میں تو ایک ہی آئے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ آدمی اگر حقیقی طور پر غور کرے تو اس کی ضرورت تو بہت کم میں

پوری ہوسکتی ہے۔بس! صرف حرص ہی ہے جس کی وجہ سے وہ سب کچھ جمع کر رہا ہے۔ اس کی طرف نبی کریم ﷺ نے متوجہ کیا کہ بھائی! آدمی اگر اس پر غور کرے تو وہ دنیا کی خاطر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کبھی نہیں کرے گا، اور دنیا کو ایک ضرورت کی چیز سمجھ کر ضرورت کے مطابق حاصل کرے گا، اور اسی کے مطابق خرچ کرے گا۔ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے کی فکر ہی نہیں کرے گا۔

ضرورت کی توضیح

پہلے بھی مَیں مثال سے سمجھا چکا ہوں کہ ہر مکان کے اندر بیت الخلاء ایک ضرورت کی چیز سمجھی جاتی ہے، بہت بڑا اور عمدہ سے عمدہ بنگلہ ہو، لیکن اس میں اگر بیت الخلاء نہیں ہے، تو یہ مکان کے اندر ایک طرح کا نقص ہے، لیکن ضرورت کی چیز ہونے کے باوجود کوئی آدمی اس میں مستقل رہائش اختیار نہیں کرتا، جب بھی قضائے حاجت کی ضرورت پیش آتی ہے اور پیشاب پاخانہ کا تقاضہ ہوتا ہے، تو جتنی دیر کا تقاضہ ہو، اتنی دیر کے لیے اس کو استعمال کرتا ہے۔اسی طرح سے مال و دولت بھی ایک ضرورت کی چیز ہے، ضرورت کے بقدر اس کو حاصل کیا جائے، اور ضرورت کے بقدر اس کو استعمال کیا جائے۔اگر تجارت اور کاروبار کی وجہ سے برکت کے طور پر اللہ تعالیٰ نے مال زیادہ دیا ہے تب بھی ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی۔ بس! استعمال تو اپنی ضرورت کے مطابق ہی کرنا ہے، اس سے زیادہ اگر استعمال کرے گا تو یہ فضول خرچی میں داخل ہے جو گناہ ہے۔اور اگر نافرمانی میں استعمال کرے گا تو اس کا گناہ ہونا تو ظاہر ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ آدمی کے پاس جو کچھ بھی ہے، سب کو اللہ تعالیٰ کا فضل ہی سمجھنا

چاہیے، اس میں اس کی کسی صلاحیت کو، اور اس کے کسی کمال کو دخل نہیں ہے، جو کچھ بھی ملا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملا ہے۔

مال و دولت بری چیز نہیں

ویسے قرآنِ پاک میں دنیا کو اللہ تعالیٰ کا فضل قرار دیا گیا ہے اگر وہ صحیح طریقے سے استعمال ہو: ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللهِ﴾ اسی طرح ارشاد ہے: ﴿وَمِنْهُم مَّنْ عَاهَدَ اللهَ لَئِنْ آتَانَا مِن فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ﴾ قرآنِ پاک میں اور بھی مختلف جگہوں پر مال کو اللہ تعالیٰ کا فضل بتایا گیا ہے۔ اور لفظِ خیر سے بھی تعبیر کیا گیا ہے: ﴿إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ﴾ تو اگر آدمی مال کو اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور اس کی اطاعت کے ساتھ حاصل کرے، اور اس کی خوشنودی و رضا کے مطابق ہی اس کو استعمال کرے؛ تو پھر یہ ساری فضیلتیں ہیں۔

اس لیے یہ نہ سمجھا جائے کہ مال و دولت اپنی ذات کے اعتبار سے بری چیز ہے بلکہ آدمی کا اس کے سلسلے میں جو نظریہ ہوتا ہے اسی کے مطابق حکم لگایا جاتا ہے۔ آدمی اگر اس کو اپنا مقصود بنالے کہ اسی کے لیے سب کچھ کرتا ہے اور آخرت مدنظر ہی نہیں رکھتا تو یہ بری چیز ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ دنیا کو ایک منزل اور گزرگاہ کے طور پر بقدر ضرورت صحیح طریقہ سے حاصل کرتا اور استعمال کرتا ہے تو پھر یہ بری چیز نہیں ہے۔

اب اگر کسی کو کاروبار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے برکت دی اور مال زیادہ مقدار میں ملا تو یہ سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ بھی ملتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے دینے سے ہی ملتا ہے، اس میں آدمی کی کوئی صلاحیت کارآمد نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے دیتا ہے۔ اسی لئے اس کو فضل سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فساد کا ارادہ نہ کرو

قارون کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے: ﴿وَابْتَغِ فِيْمَا آتَاكَ اللهُ﴾ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے اس کے ذریعہ سے آخرت کو حاصل کرو۔ اس کے پاس دولت بہت کثرت سے تھی، آج بھی مثال کے طور پر قارون کا خزانہ بولا جاتا ہے، اور اس زمانہ میں دولت خزانوں میں رکھی جاتی تھی اور اس کے اوپر بڑے بڑے تالے لگائے جاتے تھے اور اس کے خزانوں کی کنجیاں اُٹھانے کے لیے ایک پوری جماعت ہوتی تھی باری تعالیٰ کی طرف سے اس کو کہا گیا کہ اس دولت سے آخرت حاصل کرنے کی کوشش ہونی چاہیے: ﴿وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾ اور اپنی ضرورت کے لیے بھی استعمال کرو۔ شریعت یہ بھی نہیں کہتی کہ آپ کو مال ملا تو اس کو پھینک دو، بلکہ دنیا میں سے جو حصہ ملا ہے اس سے اپنی ضرورت پوری کیجئے ﴿وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللهُ إِلَيْكَ﴾ اور اپنی ضرورتوں کے بعد جو مال بچ جائے تو جیسے اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان و فضل کرتے ہوئے تمہیں عطا فرمایا، تم بھی لوگوں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو اور خرچ کرو۔ ویسے بھی آخرت کے اعتبار سے یہ چیز مفید ہے ﴿وَمَا تُقَدِّمُوْا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللهِ﴾ جو کچھ بھی تم خرچ کرکے اللہ تعالیٰ کے یہاں بھیج دوگے، وہ اللہ تعالیٰ کے خزانہ میں جمع ہو جائے گا اور وہاں تم کو ملے گا ﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللهِ بَاقٍ﴾ تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ ختم ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے یہاں جو ہے وہ باقی رہے گا اس لیے اگر باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس کی صورت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خزانہ میں جمع کرادو ﴿وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ﴾ اور دیکھو! اس مال کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہو، اگر مال اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے کاموں میں استعمال کیا جارہا ہے تو یہ ایک طرح کا فساد ہے، اس لئے کہا

گیا کہ فساد کا ارادہ نہ کرو۔

تو یہاں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اسی طرف متوجہ کیا ہے کہ آدمی اگر یہ سوچے کہ دنیا میں میرا حصہ تو صرف اتنا ہی ہے، تو پھر دنیا کے لیے اپنی زندگی کو برباد نہیں کرے گا، بلکہ بقدرِ ضرورت حاصل کر کے آخرت کی تیاری میں لگے گا۔ تو ''زہد'' کا مطلب ہوا کہ دنیا کی محبت کا دل میں نہ ہونا، اور بقدرِ ضرورت پر اکتفاء کرنا، دنیا میں بقدرِ ضرورت لگنا اور اس کے علاوہ اپنے اوقات وصلاحیت اور اللہ تعالیٰ نے جو بھی نعمتیں دی ہیں ان سب کو آخرت حاصل کرنے اور آخرت کمانے کے لئے استعمال کرنا۔

حُبِّ نبوی کے لیے فقر لازمی

۴۸۴ - وعن عبداللہ بن مغفّل رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: يَارَسُوْلَ اللهِ! وَاللهِ إِنِّي لَأُحِبُّكَ. فَقَالَ: أُنْظُرْ مَاذَا تَقُوْلُ؟ قَالَ: وَاللهِ إِنِّي لَأُحِبُّكَ. ثَلاَثَ مَرَّاتٍ. فَقَالَ: إِنْ كُنْتَ تُحِبُّنِي فَأَعِدَّ لِلْفَقْرِ تِجْفَافاً، فَإِنَّ الْفَقْرَ أَسْرَعُ إِلٰى مَنْ يُحِبُّنِي مِنَ السَّيْلِ إِلٰى مُنْتَهَاهُ. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن)

(التِّجْفَافُ) بِكَسْرِ التَّاءِ الْمُثناةِ فَوْقُ وَإِسْكَانِ الْجِيْمِ وَبِالْفَاءِ الْمُكَرَّرَةِ: وَهُوَ شَيْءٌ يُلْبَسُهُ الْفَرَسُ، لِيُتَّقٰى بِهِ الْأَذٰى، وَقَدْ يَلْبَسُهُ الْإِنْسَانُ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں آپ سے محبت رکھتا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا: ذرا دیکھو! کیا کہہ رہے ہو؟ (یعنی جو بول رہے ہو ذرا سوچ کر بولو؟) اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں آپ سے محبت رکھتا ہوں۔ تین مرتبہ اس نے یہ بات دہرائی۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تو مجھ سے محبت رکھتا ہے، تو پھر فقیری لازمی طور پر لگی ہوئی، اس کے لیے تیار ہو جا، اس لئے کہ جو

آدمی مجھ سے محبت رکھتا ہے اس کی طرف فقیری ایسی تیزی کے ساتھ آتی ہے جیسے سیلاب کا پانی نشیب کی طرف آتا ہے۔

خوش ہونے کی چیز

افادات:- ویسے ہی سیلاب کے اندر تیزی ہوتی ہے، اور نشیب والے حصہ میں اور زیادہ تیزی سے بہتا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ دیکھو! جو آدمی مجھ سے محبت رکھتا ہے اس کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے، گویا آدمی جتنا آخرت کی طرف راغب ہوگا اور نبی کریم ﷺ کے طریقوں کو جتنا زیادہ اختیار کرے گا، تو اِس قسم کی اتنی ہی آزمائشیں اس کو پیش آئیں گی، لیکن اس کی وجہ سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ یہ تو خوش ہونے کی چیز ہے کہ میں صحیح راہ پر چل رہا ہوں۔

حالات؛ صحیح منزل کی علامت

حضرت مولانا قاری صدیق صاحبؒ نے ایک مرتبہ تقریر میں فرمایا تھا اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے ملفوظات میں بھی ہے کہ آدمی ایک منزل کی طرف چلتا ہے، جیسے آدمی سورت سے ممبئی جانے کے لئے ٹرین میں سوار ہوا، جب ٹرین چلے گی اور کوئی اسٹیشن آئے گا تو آدمی پوچھے گا کہ بھائی! کون سا اسٹیشن آیا؟ سچین آیا، مرولی آیا تو اب اس کو اطمینان ہوگا کہ ممبئی جانے والے راستہ پر ہی یہ سارے اسٹیشن آتے ہیں، تو اب اس کو سکون واطمینان ہوگا کہ میں اپنی منزل کی طرف برابر آگے بڑھ رہا ہوں۔ اور اگر راستہ میں جو اسٹیشن آنے چاہئیں وہ نظر نہیں آرہے ہیں، دوسرے اسٹیشن نظر آرہے ہیں، مثلاً آپ نے دیکھا کہ کیم اور کوسمبا آیا۔ تو اب آپ پریشان ہوں گے کہ ممبئی جاتے ہوئے یہ اسٹیشن تو نہیں آتے! اب آپ سوچیں گے کہ میں منزل کی طرف آگے نہیں بڑھ

رہا ہوں، بلکہ یہ تو میں اپنی منزل سے دور ہو رہا ہوں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو راہ بتائی ہے، اگر آدمی اس پر چلے اور پھر جو حالات ان حضرات کو پیش آئے تھے وہی سب حالات اس کو بھی پیش آرہے ہیں تو اس کو سمجھنا چاہیے کہ میں صحیح راستہ پر چل رہا ہوں۔

آزمائش ناراضگی کی علامت نہیں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سے سب سے زیادہ آزمائش انبیاءِ کرام کی ہوتی ہے، پھر جو آدمی جتنا ان کے ساتھ مشابہت اختیار کرے گا اور جتنا زیادہ ان کے قریب ہونے کی کوشش کرے گا، اتنا ہی اس کی بھی آزمائش ہوتی ہے۔ لیکن آج کل تو مزاج ایسا بن گیا ہے کہ دین کی راہ میں اگر اس قسم کے حالات پیش آتے ہیں، تو اس کی وجہ سے دل گرفتہ ہو جاتے ہیں، مثلاً کسی کے اوپر کاروباری حالات آئے تو آکر کہتا ہے کہ مولوی صاحب! میں تو پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور رمضان کے روزے بھی برابر رکھتا ہوں، زکوٰۃ بھی دیتا ہوں؛ پھر بھی میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ گویا وہ یہ بتلانا چاہتا ہے کہ (نعوذ باللہ) وہ تو اللہ تعالیٰ پر احسان کر رہا ہے، پھر اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیوں ہو رہا ہے! حالانکہ اس کو تو یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب گویا ایک نوع کی آزمائش ہے۔ آدمی جتنا دیندار بننا چاہتا ہے اور دین کے اندر پختگی حاصل کرنا چاہتا ہے، اسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف طریقوں سے آزمائش ہوتی ہے۔ آزمائش کی وجہ سے آدمی یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہیں۔ دنیا میں کاروباری اعتبار سے، فقر کی وجہ سے، یا بیماری وغیرہ کے جتنے بھی حالات آتے ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی علامت نہیں ہیں۔ آدمی کو تو صرف یہ سوچنا چاہیے اور اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو صحیح طور پر ادا کر رہا ہوں یا نہیں۔ مَیں کسی گناہ

کا ارتکاب تو نہیں کر رہا ہوں۔ کسی معصیت میں تو مبتلا نہیں ہوں۔ آدمی اپنا جائزہ لینے کے بعد اگر اس نتیجے پر پہنچا کہ مَیں کسی معصیت اور گناہ میں یا کسی نافرمانی میں مبتلا نہیں ہوں، تو بس! یہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اور بڑے شکر کی چیز ہے۔

ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ بالکل اپاہج تھا، اس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور وہ اس حال میں بھی الحمد للہ پڑھ رہا تھا۔ کسی نے اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: کیا بات ہے کہ اس حالت میں بھی تو الحمد للہ کہہ رہا ہے؟ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں اس مصیبت میں گرفتار ہوں، کسی معصیت اور نافرمانی میں مبتلا نہیں ہوں۔

قابلِ اصلاح نظریہ

تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی پر کیسے ہی حالات آویں، اس کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ایسے وقت آدمی یہ سوچ لے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے معصیت اور گناہ میں نہیں ڈالا، میں گناہ سے بچا ہوا ہوں، اگرچہ مصیبت آئی۔ اور مصیبت تو انبیاء پر بھی آئی ہے، کوئی اس سے بچا ہوا نہیں ہے۔ اس لیے آج کل جو ایک مزاج بنتا جا رہا ہے کہ ذرا سی کوئی بات پیش آتی ہے تو آدمی فوراً پریشان ہو جاتا ہے، اور جہاں دو پیسے آئے تو تعبیر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہاتھ پکڑا۔ گویا نعوذ باللہ اب تک چھوڑ رکھا تھا۔ ہمارا یہ جملہ اور نظریہ بالکل درست نہیں ہے۔

اسلاف کا طرزِ عمل

بلکہ ہمارے اسلاف کے یہاں تو یہ حال تھا کہ ان کے پاس مال آتا تھا تو وہ ڈرتے تھے اور روتے تھے۔ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ والی روایت اسی باب میں پہلے گزر چکی ہے کہ جب ان کے پاس کھانا لایا گیا تو وہ رونے لگے، اور حضرت مصعب

بن عمیر رضی اللہ عنہ کا حال یاد کیا، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی حالت کا تذکرہ کیا کہ وہ دنیا سے ایسی حالت میں گئے کہ انہوں نے دنیا سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا۔ گویا اس پر ان کو خوشی بھی تھی کہ ان کو اپنی نیکیوں کا پورا بدلہ آخرت میں ملے گا، اور ہم ہیں کہ اپنے پھلوں کو یہیں توڑ رہے ہیں۔ دنیا کے آنے پر ان کو ایک طرح کی فکر رہتی تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہمارے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں مل گیا۔ اس لئے کہ کافر جو نیکی کے کام کرتا ہے اس کو ان کاموں کا بدلہ دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے، اس پر اچھے حالات آتے ہیں، اور آخرت کے واسطے اس کی کوئی نیکی باقی نہیں رکھی جاتی۔ لیکن اسلاف ایسے حالات سے خوش نہیں ہوتے تھے بلکہ ڈرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اس کا بدلہ نہ ہو۔

حُبِ مال وجاہ کی خطرناکی

۴۸۵- وعن کعب بن مالک رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مَا ذِئْبَانِ جَائِعَانِ اُرْسِلَا فِیْ غَنَمٍ بِاَفْسَدَ لَھَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ اِلَی الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِیْنِہٖ.

ترجمہ:- حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دو بھوکے بھیڑیوں کو اگر بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیا جائے تو وہ بکریوں کو اتنا خراب نہیں کریں گے، جتنا مال وجاہ کی لالچ ومحبت آدمی کے دین کو خراب کرتی ہے۔

افادات:- حبِ جاہ یعنی منصب وعہدہ اور کرسی کی محبت اور لالچ۔ اس روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مثال سے اس چیز کو سمجھایا ہے کہ اگر دو خونخوار اور بھوکے بھیڑیوں کو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیا جائے۔ اور بعض روایتوں میں ہے کہ بکریوں کے ایسے ریوڑ میں چھوڑ دیا جائے جس کے اوپر کوئی چرواہا بھی موجود نہ ہو، تو وہ دونوں ان بکریوں کو جتنا نقصان پہنچا سکتے ہیں، مال وجاہ کی محبت اور لالچ کی وجہ سے

آدمی کے دین کو اس سے بھی زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہیے کہ اپنے دل میں مال اور منصب کی محبت نہ رکھے۔

اور دیکھو! محبت رکھنا الگ چیز ہے، اور ضرورت کے لئے اس کو حاصل کرنا الگ چیز ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ ضرورت کے پیشِ نظر آدمی اس کو برتتا ہے، لیکن اس کی محبت دل میں نہیں ہوتی، تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

دنیا ایک راہ گزر ہے

۴۸۶-وعن عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ قَالَ نَامَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عَلٰى حَصِيْرٍ، فَقَامَ وَقَدْ اَثَّرَ فِيْ جَنْبِهٖ، قُلْنَا: يَارَسُوْلَ اللهِ! لَوِ اتَّخَذْنَا لَكَ وِطَآءً. فَقَالَ: مَالِيْ وَلِلدُّنْيَا؟ مَا أَنَا فِي الدُّنْيَا إِلَّا كَرَاكِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا. (رواہ الترمذی)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک چٹائی کے اوپر لیٹے ہوئے تھے، جب آپ اُٹھے تو آپ کے جسمِ اطہر کے اوپر چٹائی کے نشان تھے۔ اس پر ہم نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! اگر آپ اجازت دیں تو ہم آپ کے لیے کوئی نرم بستر تیار کرلیں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھے دنیا سے کیا لینا دینا؟ دنیا میں میرا حال اس سوار کی طرح ہے جو چلتے چلتے تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو اور اپنی سواری کو راحت پہنچانے کے لیے کسی درخت کا سایہ حاصل کرلیتا ہے اور پھر اس سایہ کو چھوڑ دیتا اور چل دیتا ہے۔

افادات:- جیسے ہم اور آپ بھی جب سفر کرتے ہیں اور کبھی موٹر گرم ہوگئی تو کہیں راستہ میں کسی درخت کے نیچے تھوڑی دیر کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تو اب کیا ہمیں یاد رہتا ہے کہ کون سے درخت کے نیچے کھڑے ہوئے تھے؟ اس درخت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے، بس! وقتی طور پر تھوڑی دیر کے واسطے اس سے فائدہ اُٹھالیا،

اسی طریقہ سے نبی کریم ﷺ بتلانا چاہتے ہیں کہ دنیا میں جو ہم آئے ہیں یہ ہماری آخری منزل نہیں ہے، بلکہ یہ تو راستہ کی ایک چیز ہے، جیسے راستہ چلتے ہوئے آدمی کسی چیز سے تھوڑی دیر کے لئے فائدہ اُٹھالیا کرتا ہے، کہ نہ اس کے ساتھ دل لگاتا ہے اور نہ اس جگہ کو یاد رکھتا ہے، بس وقتی طور پر جتنی دیر کے لئے فائدہ اُٹھایا ہے اتنی دیر کے لیے اس کے ساتھ تعلق رہتا ہے، جب چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے، تو وہ چیز اس کو یاد نہیں رہتی ہے۔ اسی طریقہ سے دنیا کے ساتھ ہمارا معاملہ ہونا چاہیے۔

خلاصۂ کلام

دنیا کے اندر کاروبار کرنے اور کھانے کمانے سے منع نہیں کیا گیا ہے، اصل بات یہ ہے کہ ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا کہ دنیا کو آخری منزل نہ سمجھا جائے، اسی کو اپنا مقصود نہ بنالیا جائے اور اسی کے لیے اپنی صلاحیتوں کو ضائع نہ کرے۔ یہ ضرورت کی ایک چیز ہے، اس لئے بقدرِ ضرورت اس کو حاصل کیجئے، پھر آپ کی پوری توجہ اور دھیان، آپ کی پوری سوچ اور ساری محنت آخرت کے لیے اور اللہ تعالیٰ کو راضی رکھنے کے لیے ہونی چاہیے۔

پانچ سوسال پہلے جنت میں داخلہ

۴۸۷- عن أَبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: يَدْخُلُ الْفُقَرَآءُ الْجَنَّةَ قَبْلَ الأَغْنِيَاءِ بِخَمْسِ مِائَةِ عَامٍ. (رواه الترمذی وقال: حدیث صحیح)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا فقراء جنت کے اندر اغنیاء (مالداروں) سے پانچ سو سال پہلے داخل ہوں گے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ جو اغنیاء اپنے اعمال کی وجہ سے جنت کے حقدار

ہیں وہ جنت کے اندر جائیں گے، لیکن چونکہ ان کے پاس مال اور دنیا کی دولت تھی اس لیے اس کا حساب تو دینا ہی پڑے گا۔ اس حساب وکتاب کے اندر مشغولی کی وجہ سے جنت میں پہنچنے میں ان کو پانچ سو سال کی تاخیر ہوجائے گی، جب کہ فقراء ان سے پانچ سو سال پہلے جنت میں چلے جائیں گے۔ حالانکہ دنیا کی زندگی اتنی نہیں تھی۔ دنیا کے اندر ان لوگوں نے جو دولت وثروت حاصل کی وہ تو چالیس پچاس سال تھی، لیکن اس کو وہاں پانچ سو سال تک بھگتنا پڑا کہ جنت کے اندر داخلہ میں دنیا کی اس دولت کی وجہ سے تاخیر ہوگئی۔ دنیا میں جو تھوڑی راحت اور کچھ عیش پا بھی لیا تو وہ دنیا کا عیش تھا، اس کے مقابلہ میں جنت کے پانچ سو سال کی راحت سے وہ محروم رہا۔ یہ بھی ایک سوچنے کی چیز ہے۔

مال کی کمی؛ جنت میں لے جانے والی

۴۸۸-عن ابن عباس وعمران بن الحُصَیْن رضی اللہ عنہما عن النَّبِی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: اطَّلَعتُ فِي الجَنَّةِ فَرَأَيتُ أَكثَرَ أَهلِهَا الفُقَرَآءَ، واطَّلَعتُ فِي النَّارِ فَرَأَيتُ أَكثَرَ أَهلِهَا النِّسَآءَ. (متفقٌ علیه من روایة ابن عباس. ورواه البخاری أیضاً من روایة عمران بن الحُصَین)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے جنت میں جھانکا تو جنت میں جانے والے اکثر فقراء ہیں۔ اور جہنم میں جھانکا تو جہنم میں اکثریت عورتوں کی ہے۔

افادات:- چونکہ ان کے پاس مال کم تھا، اور عام طور پر آدمی مال حاصل کرنے کے لیے ایسی چیزوں کا اور ایسی حرکتوں کا ارتکاب کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی ہوتی ہیں۔ اسی لیے شروع باب میں آیا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مَا الفَقرَ أَخشىٰ عَلَيكُم وَلٰكِن أَخشىٰ عَلَيكُمُ الدُّنيَا"، مجھے تمہارے متعلق فقر کا

اندیشہ نہیں ہے۔ اگر فقر کسی کے پاس ہے تو اس کی وجہ سے اس کو دینی اعتبار سے اتنا نقصان نہیں پہنچ سکتا، جتنا مال کی کثرت کی وجہ سے پہنچ سکتا ہے۔

اِس زمانہ کے ایک سوال کا جواب

اور جہنم میں اکثریت عورتوں کی ہوگی۔ ویسے دوسری روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ عورتوں کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو آپ نے نصیحت فرمائی جس میں یہی بات ارشاد فرمائی۔ تو عورتوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! ایسا کیوں؟

اور دیکھو! ایسا نہیں ہے کہ عورتیں؛ عورتیں ہیں اس لئے ان کو جہنم میں بھیجا جائے گا، بلکہ ان کی چند لغزشوں کی وجہ سے ان کو زیادہ مقدار میں جہنم میں بھیجا جائے گا۔ اور یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جب عورتوں کی بات آتی ہے تو آج کل بعض لوگ جو مرد و عورت کی مساوات کے دعویدار ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ عورت نے کون سا جرم کیا ہے جو اس کو جہنم میں زیادہ مقدار میں بھیجا جائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ عورت ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ جرم اور گناہ ان کو جہنم میں لیجانے والے ہیں، اس کی صراحت دوسری روایت میں موجود ہے۔ خود عورتوں نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! ایسا کیوں ہوگا کہ جہنم میں اکثریت عورتوں کی ہوگی؟

عورتوں کی دو بری عادتیں

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ''، تم لعن طعن زیادہ کرتی ہو۔ عام طور پر عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ لعنت و ملامت اور طعن و تشنیع اور بد دعائیں دینا ان میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ زبان کی بے احتیاطیاں جتنی عورتوں کی طرف سے ہوتی ہیں اتنی مردوں کی طرف سے نہیں ہوتیں، دوسروں کو تکلیف پہنچانے کے لیے ایسی بات بولے گی

کہ سامنے والے کے تن بدن میں آگ لگ جائے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کو متوجہ فرمایا کہ اس چیز سے اگر اپنے آپ کو بچاؤ گی تو جہنم سے بچنا آسان ہوگا۔

اور دوسری چیز ہے: "وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ" شوہر، جیون ساتھی، شریکِ حیات جس کو عربی زبان میں "عَشِيْرٌ" کہا جاتا ہے یعنی جس کے ساتھ زندگی گزار رہی ہو، ان کی ناشکری کرتی ہو۔ ناشکری کے لئے عربی زبان اور قرآن وحدیث میں لفظِ کفر استعمال کیا گیا ہے۔ کافر کو کافر اسی لئے کہتے ہیں کہ جس اللہ نے اس کو پیدا کیا اور اتنی ساری نعمتیں دیں اور بہت ساری چیزوں سے نوازا؛ اس کو چھوڑ کر دوسرے کی عبادت کرتا ہے؛ تو اس سے بڑا ناشکرا اور کون ہوگا؟ تو ناشکری کے لیے بھی عربی زبان میں لفظِ کفر استعمال کیا جاتا ہے۔ تو عورتوں میں ایک خرابی اور کمزوری یہ بھی ہے کہ شوہر بیچارہ اس کے ساتھ کتنا ہی احسان وبھلائی کا معاملہ کرے، اور اس کو کتنی ہی سہولت وراحت پہنچانے کی کوشش کرے، لیکن پھر بھی اگر کبھی کوئی بات پیش آتی ہے، تو حضرت گنگوہیؒ نے ترمذی شریف کی تقریر میں فرمایا کہ وہ کہتی ہے کہ تیرے گھر میں آکر میں نے دیکھا ہی کیا ہے؛ ایک چیتھڑا اور ایک ٹھیکرا۔ وہ کپڑے کو چیتھڑے سے تعبیر کرے گی، اور برتن کو ٹھیکرے سے تعبیر کرے گی۔

دنیا کے خوش بخت رو کے جائیں گے

۴۸۹ - وعن أسامة بن زيد رضی اللہ عنہ عن النَّبِي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: قُمْتُ على بَابِ الْجَنَّةِ فَكَانَ عَامَّةُ مَنْ دَخَلَهَا الْمَسَاكِيْنُ، وَأَصْحَابُ الْجَدِّ مَحْبُوْسُوْنَ، غَيْرَ أَنَّ أَصْحَابَ النَّارِ قَدْ أُمِرَ بِهِمْ إِلَى النَّارِ. (متفقٌ عليه)

ترجمہ:- حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

ارشادفرمایا: میں جنت کے دروازہ پر کھڑا رہا تو دیکھا کہ عام طور پر اس میں جانے والے مسکین ہیں، اورارباب ثروت (جو دنیا کے اندر خوش بخت سمجھے جاتے ہیں، مال ودولت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا خوش قسمت بنایا ہے، ایسے خوش بخت) لوگ روکے گئے ہیں۔ البتہ جن لوگوں کے لیے جہنم کا فیصلہ ان کے گناہوں کی وجہ سے ہو چکا تھا، ان کو جہنم میں ڈال دیا گیا۔

افادات:- اگرچہ وہ اپنے عمل کی وجہ سے جنت کے حقدار ہیں لیکن چوں کہ مال زیادہ تھا تو اس کا حساب تو دینا ہی ہے۔ اور غریبوں کے پاس مال ودولت نہیں تھی تو حساب وکتاب کے اندر مشغولی کے نتیجے میں جو تاخیر ہو سکتی تھی اس سے وہ بچ گئے، اور جلدی جنت میں پہنچ گئے۔ لیکن جو مالدار اور خوش بخت اپنی نیکیوں کی وجہ سے جنت کے حقدار تھے، ان کو جہنم میں نہیں بھیجا جائے گا اور وہ اولِ وہلہ میں جنت میں بھی نہیں جا پائیں گے، مال ودولت کا حساب وکتاب دینے میں ان کو کچھ دیر لگے گی۔ گویا حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ دیکھو! مال ودولت اگر کسی کو مل بھی جائے اور اس کو صحیح طریقہ سے استعمال بھی کرے۔ اگر جنت میں جانے کا فیصلہ ہو بھی گیا ہو؛ تب بھی حساب تو کہیں گیا ہی نہیں، مال کا حساب تو دینا ہی پڑے گا۔

شاعر کی سچی بات

۴۹۰ - وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: أَصْدَقُ كَلِمَةٍ قَالَهَا شَاعِرٌ كَلِمَةُ لَبِيدٍ: أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللهَ بَاطِلٌ. (متفقٌ علیه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشادفرمایا: سب سے سچی اور صحیح بات جو کسی شاعر نے کہی ہو وہ لبید شاعر کا یہ شعر ہے: "أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللهَ بَاطِلٌ"، اللہ کے علاوہ ہر چیز بے کار ہے۔

افادات:-لبید بن اُعصم عرب کا ایک شاعر گذرا ہے، اس نے یہ شعر کہا ہے۔ چوں کہ عام طور پر شاعروں کے کلام میں مبالغہ آرائی زیادہ ہوتی ہے، اس لیے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ سب سے عمدہ اور ایک دم صحیح بات جو کسی شاعر نے کہی ہو وہ یہ ہے: ’’اللہ کے علاوہ ہر چیز بے کار ہے اور ختم ہونے والی ہے، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات باقی رہنے والی ہے‘‘۔

بہرحال! آدمی آخرت ہی کے لیے محنتیں کرے، اور اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت کے لیے اپنی صلاحیت کو استعمال کرے۔ باقی اگر دنیا کے لیے محنتیں کرے گا تو دنیا ختم ہونے والی ہے۔

پورے باب کا نچوڑ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں اپنی عادت کے خلاف بہت ساری روایتیں ذکر کی ہیں۔ پچھلے ابواب میں اتنی کثرت سے روایتیں نہیں لائے تھے، لیکن یہ باب زہد کے بارے میں قائم کیا کہ آدمی کے دل میں دنیا کی محبت نہ ہو، دنیا سے بے رغبتی ہو۔ اس باب کے تحت بہت ساری روایتیں پیش فرمائیں، تاکہ اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔ اور جیسا کہ پہلے بتلایا تھا کہ ساری بیماریوں اور خرابیوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے، دنیا کی محبت ہی کے نتیجہ میں آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے، آخرت کو بھول جاتا ہے، آخرت کے اعمال کی طرف سے غفلت اور کوتاہی برتتا ہے اور گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس لیے آدمی جتنا اپنے دل کو دنیا کی محبت سے خالی رکھے گا اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوگا۔

زہد کا خلاصہ اتنا ہی ہے کہ مال کی محبت دل میں نہیں ہونی چاہیے۔ ایسا نہیں ہے کہ مال مت کماؤ، بلکہ آدمی کے پاس چاہے کتنا ہی مال ہو، لیکن دل میں دنیا اور مال

کی محبت نہیں ہے؛ تو وہ ''زاہد'' ہے۔ اور ایک آدمی کے پاس مال کچھ بھی نہیں ہے، لیکن اس کا دل مال کی محبت سے بھرا ہوا ہے؛ تو اس کو ''زاہد'' نہیں کہیں گے۔

میں نے پہلے بھی قصہ سنایا تھا، ملا علی قاریؒ نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو منیٰ کے بازار میں دیکھا جو ہزاروں کا کاروبار اور لین دین کر رہا تھا، لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا دل اللہ کی یاد سے غافل نہیں تھا۔ یعنی ہاتھ کاروبار میں مشغول تھے لیکن دل اللہ کی طرف متوجہ تھا۔ وہی بزرگ فرماتے ہیں کہ دوسرے آدمی کو دیکھا کہ کعبہ کا غلاف پکڑے ہوئے رو رہا تھا اور آنسو بہا رہا تھا، لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

تو اصل چیز یہی ہے کہ آدمی دل سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ تعلق رکھے اور آخرت کی طرف متوجہ ہو۔ باقی کاروبار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق مال کماتا ہے، تو اس سے منع نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق کمائے اور اس کی رضا کے مطابق ہی استعمال کرے؛ تب تو بات بنے گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق وسعادت عطا فرمائے۔

دعا

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگزر فرما۔ اے اللہ! دنیا اور مال کی محبت سے ہمارے قلوب کو پاک اور صاف فرما۔ اپنی معرفت ومحبت کے انوار سے ہمارے قلوب کو منور ومعمور فرما۔ اپنی یاد سے ہمارے دلوں کو آباد فرما۔ اے اللہ! آخرت کے لیے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کی اور آخرت ہی کو پیشِ نظر رکھنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ ہم سے راضی ہو جا۔ اپنی مرضیات پر زیادہ سے

زیادہ چلا کرنا مرضیات سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔ نبی کریم ﷺ کے طریقوں اور سنتوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی ہمیں توفیق وسعادت عطا فرما۔ اے اللہ! امتِ مسلمہ کے حال پر رحم فرما، امت کی اجتماعی وانفرادی پریشانیوں کو دور فرما۔ اور اے اللہ! ہمیں نبی کریم ﷺ کے طریقے پر صحیح طور سے گامزن ہونے کی توفیق عطا فرما۔

فَضْلُ الْجُوْعِ

وَخُشُوْنَةِ الْعَيْشِ

بھوک وفاقہ برداشت کرنے

اور

سادہ زندگی بسر کرنے کی فضیلت

﴿مجلس ۱﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۲۶/ذی قعدۃ الحرام ۱۴۲۰ھ ۴/مارچ ۲۰۰۰ء

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَ نَسۡتَعِیۡنُہٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّداً عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسۡلِیۡماً کَثِیۡراً کَثِیۡراً. أما بعد:-

أَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡمِ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔

فَخَلَفَ مِنۡ بَعۡدِہِمۡ خَلۡفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوَاتِ فَسَوۡفَ یَلۡقَوۡنَ غَیًّا.

اِلاَّ مَنۡ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَأُوۡلَئِکَ یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ وَلَا یُظۡلَمُوۡنَ شَیۡئاً.

عنوان کا خلاصہ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے باب قائم کیا تھا کہ دنیا کی محبت سے آدمی کو دور رہنا چاہیے، اس لیے کہ ساری برائیوں کی جڑ یہی ہے۔ اب دنیا کی محبت کن چیزوں سے بڑھتی ہے اور کون سا طریقہ اختیار کرنے سے دنیا کی رغبت کم ہوتی ہے، اس کی کچھ تدبیروں کو بتلانے کے لیے یہ باب قائم کیا ہے۔ بھوکا رہنے اور مشقت والی سادہ زندگی گزارنے کی فضیلت۔ اور کھانے پینے ولباس میں کم سے کم پر اکتفاء کرنے کی فضیلت۔ اور نفس کی خواہشات اور شہوتوں کو چھوڑنے کی فضیلت۔

عام طور پر آدمی جب نفس کی خواہشات کو پورا کرنا چاہتا ہے، اور کھانے پینے

اور پہننے کے معاملہ میں عیش وعشرت اور مرفہ الحالی (خوش حالی) کو مدنظر رکھتا ہے تو اسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اسے کچھ تدبیریں بھی اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ اس لئے کہ ظاہر ہے کہ یہ ساری چیزیں اسی وقت پوری ہو سکتی ہیں جب کہ آدمی کچھ مال حاصل کرے، اور اگر مال اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا مندی اور اس کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق حاصل نہیں ہو پاتا تو پھر اللہ کی ناراضگی والے طریقے اختیار کرتا ہے، اور پھر یہی چیز ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ اس لیے یہ باب قائم کر کے ایسی آیتیں اور احادیث پیش کرنا چاہتے ہیں جن میں اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ آدمی کو اپنی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل میں کم سے کم پر اکتفاء کرنا چاہیے۔

اس لیے کہ پہلے بھی بتلایا تھا کہ دنیا کی مثال راستہ کی ایک منزل کی طرح ہے، اور ہمارا سفر آخرت کی طرف ہے، اس لیے ہماری منزل آخرت ہے، اور دنیا ایک راہ گزر ہے، تو جیسے ایک مسافر اپنی راہ گزر میں اپنی ضرورتوں کے معاملہ میں کم سے کم پر اکتفاء کرتا ہے، اور اگر ان کے پورا کرنے کے سلسلے میں کچھ مشقت اور تکلیف ہوتی ہے تو وہ اس کو خوشی سے برداشت کرتا ہے، اسی طریقہ سے دنیوی زندگی میں آدمی کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ دنیا میرا اصلی ٹھکانہ نہیں ہے، اصلی ٹھکانہ تو آخرت ہے، لہٰذا دنیا میں تو آدمی کے پاس اتنا ہی سامان ہونا چاہیے جو اس کو آخرت تک پہنچا دے۔

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے مناقب

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن حضرات کو ایک ہی مجلس میں جنتی ہونے کی بشارت سنائی، ان میں یہ بھی ہیں، سقیفۂ بنو ساعدہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ جب مشورہ کے

لیے جمع ہوئے کہ آپ کے بعد اب کس کو اختیارات دئے جائیں اور کس کو حضور کا جانشین مقرر کیا جائے، اس موقعہ پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو تقریر فرمائی تھی اس میں انہوں نے لوگوں سے کہا تھا کہ میں تمہارے سامنے دو آدمیوں کو پیش کرتا ہوں، ان میں سے کسی ایک کو چن لو؛ ایک تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ (سیر اعلام النبلاء) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو "أَمِيْنُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ" اس امت کے امانت دار کا لقب دیا ہے، گویا وہ صفتِ امانت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ دراصل ایک وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ آپ ہمارے یہاں کسی آدمی کو بھیج دیجئے تاکہ ہم جزیہ کی رقم ان کے حوالہ کردیں، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں ایک ایسے آدمی کو بھیجوں گا جو اس امت کے امین ہیں۔ اس وقت بڑے بڑے لوگوں نے یہ تمنا کی کہ معلوم نہیں یہ قرعۂ فال کس کے نام نکلتا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو وہاں بھیج دیا۔ (سیر اعلام النبلاء)

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: تم میں سے ہر شخص ایسا ہے کہ میں اس کی کسی نہ کسی بات پر گرفت کرسکتا ہوں سوائے ابوعبیدہؓ کے (سیر اعلام النبلاء) یہ حضرت ابوعبیدہؓ کے فضائل ہیں۔

انہوں نے اسلام کی خاطر بڑی قربانیاں دیں۔ انہوں نے حبشہ کی ہجرت بھی کی، اس کے بعد مدینہ منورہ کی بھی ہجرت کی۔ غزوۂ بدر کے موقعہ پر ان کے والد لشکر کفار کی طرف سے لڑنے کے لیے میدان میں آئے تھے، ان کے والد ان کی تلاش میں رہے کہ میں اپنے بیٹے کو ختم کردوں۔ اور کئی مرتبہ ان کے والد ان کے سامنے آئے لیکن یہ طرح دے گئے۔ دراصل یہ اپنے ہاتھ سے اپنے والد کو قتل کرنا نہیں چاہتے تھے، اگرچہ ان کے کفر سے ناراض تھے لیکن پھر ایک مرتبہ ان کے والد سامنے آئے تو آخر

ایمان کفر پر غالب آیا، اور انہوں نے اپنے والد کو اسی غزوۂ بدر کے موقعہ پر قتل کر دیا، اس سے بڑی قربانی اور کیا ہو سکتی ہے۔ بہر حال ان کا بڑا اونچا مقام ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر میری دنیا سے روانگی کا وقت آیا اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ موجود ہوں گے تو میں اپنی جگہ پر ان کو مقرر کروں گا، اور اللہ کے یہاں اگر سوال ہوا تو میں عرض کروں گا کہ باری تعالیٰ! ایک ایسے آدمی کو مقرر کر کے آیا ہوں جس کو آپ کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کا امین قرار دیا ہے۔ (سیر اعلام النبلاء)

رومیوں کے ساتھ مسلمانوں کی جو لڑائیاں ہوئیں ان میں آخری اور فیصلہ کن جو جنگ ہوئی ہے وہ جنگِ یرموک کہلاتی ہے، اس جنگ میں سپہ سالار یہی تھے، انہی کے ہاتھوں رومیوں کو شکست ہوئی اور رومیوں کا تمام تسلط شام اور عرب کے علاقوں سے ختم ہوا۔ صحابہ میں ان کا بڑا اونچا مقام سمجھا جاتا ہے۔

فاتحِ روم کی زندگی کا حال

میں جو قصہ سنانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو شام کا گورنر مقرر کیا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ وہ جن لوگوں کو مختلف علاقوں کے اوپر حاکم اور گورنر مقرر کرتے تھے، ان کے حالات کی جستجو بھی کرتے رہتے تھے کہ وہ کس حالت میں ہیں، حکومت کی کرسی پر آ کر کہیں عیش و عشرت میں تو نہیں پڑ گئے، کہیں اپنی حالت میں تبدیلی تو نہیں کر لی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ چھپ کر بھی ان کی خبر گیری کرتے تھے، اور دوسرے لوگوں کے ذریعہ سے بھی احوال کی تحقیق کیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو کسی جگہ کا امیر مقرر کیا، پھر ان کو کسی ضرورت سے مدینہ منورہ بلایا، جب وہ مدینہ منورہ کے قریب پہنچے تو مدینہ میں داخل ہوں اس سے

پہلے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سوچ کر ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گئے کہ تحقیق کریں کہ کہیں کوئی مال و دولت تو ساتھ لے کر نہیں آئے ہیں، گویا راستہ ہی میں ان کی تلاشی لی۔ یہ حضرت عمر کا معاملہ تھا۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کے سفر پر گئے تو ایک موقعہ پر انہوں نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے کہا: مجھے اپنے گھر لے جاؤ۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ یہ میرے گھر آ کر معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ میرے گھر میں کیا ساز وسامان ہے۔ انہوں نے کہا: امیر المؤمنین! آپ میرے گھر آئیں گے تو سوائے آنسو بہانے کے اور کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کوئی بات نہیں، مجھے لے جاؤ۔ تشریف لے گئے، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے مکان میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ صرف تین چیزیں ہیں، ایک چمڑا ہے، لکڑی کا ایک پیالہ ہے، اور ایک مشکیزہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ کا سامان کہاں ہے؟ انہوں نے کہا: بس یہی سامان ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ ایک آدمی کو قبر تک پہنچانے کے لیے اتنا ہی سامان کافی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اور کیا کرنا ہے؟ دنیا تو ایک راہ گزر ہے، ایک دن ہر آدمی کو مرنا ہے، اور اس کے بعد اصل زندگی آخرت کی ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: آپ کا کھانا کیا ہے؟ تو ایک دیوار کی شگاف میں سے روٹی کے چند ٹکڑے نکالے اور کہا: یہ میرا کھانا ہے۔ (سیر اعلام النبلاء) یہ وہ شخص ہے جنہوں نے روم کو فتح کیا تھا اور روم کی سلطنت اس سے لرزتی تھی۔

تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد یہی حال تھا۔ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت تھی کہ ان حضرات کی نگاہوں میں دنیا کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ دنیا کی اس زمانے کی جو ''Super Power'' طاقتیں سمجھی جاتی تھیں وہ دو تھیں۔ ایک سلطنت کسریٰ شاہ ایران کی، اور دوسری قیصر شاہ روم کی۔ جب ان دونوں کو مسلمانوں نے فتح کر لیا تو

خوب دولت آئی، اس کے باوجود عام طور پر ان کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

مدائن کے گورنر کا حال

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ مدائن کے گورنر تھے، اس کے باوجود ان کا لباس ایک معمولی آدمی کی طرح کا ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ بازار سے گزر رہے تھے، باہر ملک سے کوئی تاجر آیا ہوا تھا اور اس کے پاس سامان تھا۔ وہ ان کو دیکھ کر یوں سمجھا کہ کوئی مزدور ہے تو ان سے کہا کہ میرا سامان اُٹھالو، انہوں نے اُٹھالیا، سامان اُٹھا کر جا رہے تھے، ساتھ میں وہ تاجر بھی چل رہا تھا۔ جب بازار سے گزرنے لگے تو لوگوں نے اس تاجر سے کہا کہ یہ تو یہاں کے گورنر ہیں۔ وہ بھی تعجب میں پڑ گیا اور اب ڈرنے لگا اور معذرت کرتے ہوئے کہنے لگا کہ مجھ سے گستاخی ہوگئی۔ انہوں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں نے نیکی کی نیت کر کے تمہارا سامان اُٹھایا ہے، میں نے جس نیت سے عمل خیر شروع کیا ہے اس کو پورا کر کے رہوں گا۔ پھر اس کو جہاں سامان پہنچانا تھا، وہاں تک پہنچایا۔ (سیر اعلام النبلاء)

اصل چیز یہی ہے کہ آدمی دنیا میں اپنی ضرورتیں کم سے کم رکھے، جتنی ضرورتیں بڑھائے گا اتنی ہی محنت کرنی پڑے گی، اور ہر وقت وہ یہی سوچے گا کہ زیادہ پیسہ کماؤں گا تب ہی تو یہ ساری ضرورتیں پوری ہوں گی۔ آدمی جتنا اپنے آپ کو شہوتوں میں لگائے گا اتنا ہی دنیا کمانے کے لیے محنت زیادہ کرنی پڑے گی اور دنیا کی محبت بڑھے گی، اسی لیے قرآن وحدیث میں عام طور پر اسی بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ آدمی اپنے نفس کی خواہشات کو روکے۔

دنیا کے لیے قربانیاں؛ آخرت کے لیے کیوں نہیں؟

اور ویسے اگر ہم دیکھیں تو دنیا حاصل کرنے کے لیے بھی آدمی اپنی بہت ساری

خواہشات کو قربان کرتا ہے۔ جو لوگ ملازمت کرتے ہیں وہ صبح جلدی گھر سے نکلتے ہیں، اگر بمبئی جارہا ہے تو فلائنگ (Flying) پکڑنے کے لئے، اور احمد آباد کی طرف جارہا ہے تو کوین (Queen) پکڑنے کے لیے جلدی سے اُٹھتا ہے۔ تو آخر وہ اپنی نیند کی قربانی دے ہی رہا ہے۔ کاروبار میں اپنی فیکٹری سنبھالنے کے لیے کتنی مشقتیں ہوتی ہیں، صبح گھر سے جاتا ہے تو دوپہر کا کھانا نہیں کھاتا، ناشتہ کر کے جاتا ہے اور شام کو آ کر کھانا کھاتا ہے۔ اور پھر کیسے کیسے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے اور کیسے کیسے حالات پیش آتے ہیں، ان کو خوش کرنے کے لیے کیا کیا تدبیریں اختیار کرتا ہے۔ اس کا جی تو نہیں چاہتا، لیکن یہ سب اس لیے کر رہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کمائی حاصل کرے۔ تو دنیوی اعتبار سے جس چیز کو وہ اپنی ترقی سمجھ رہا ہے اس کے حاصل کرنے کے لیے یہ ساری قربانیاں دیتا ہے، تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخرت کی نعمتیں جو اس دنیا سے کئی گنا بڑی اور دائمی ہیں، ان کے لیے آخر یہ سب کیوں نہیں ہوتا؟ دنیا کے لیے ہم صبح جلدی اُٹھ سکتے ہیں، نیند قربان کر سکتے ہیں، دنیا کے لیے ہم دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو جھکا سکتے ہیں، دنیا کی خاطر دوسروں کو خوش کرنے کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں، دنیا کے لیے ہم دوپہر کا کھانا چھوڑ سکتے ہیں، دوپہر کی نیند چھوڑ سکتے ہیں، اور بہت ساری خواہشات قربان کر سکتے ہیں، اگر کسی رشتہ دار کے یہاں شادی آئی اور اتوار کا دن نہیں ہے تو آپ نہیں جاتے، کہتے ہیں کہ میری دوکان کی گاہکی کا وقت ہے۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ بہت ساری چیزیں ہم چھوڑتے ہیں، اور ایسا نہیں ہے کہ ہم محنت نہیں کرتے اور مشقت نہیں اٹھاتے، لیکن یہ سب دنیا کے لیے کرتے ہیں۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب دنیا کے لیے ہم یہ سب کچھ کر سکتے ہیں تو آخرت کے لیے آخر ہم سے یہ سب کیوں نہیں ہوتا؟ حالاں کہ آدمی کو یہ سوچنا چاہیے کہ دنیا کی حقیقت ہی کیا ہے۔

عقلمندی کا طریقہ

ہم میں اور ہمارے اسلاف واکابر میں یہی فرق ہے کہ وہ یہی ساری چیزیں آخرت کے لیے کرتے تھے، ہم بھی وہی سب کرتے ہیں لیکن دنیا کے لیے کرتے ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم کس چیز کے لیے قربانی دیتے ہیں؟ ایک ایسی چیز کے لیے جو دنیا میں بھی ہمارے لیے زیادہ کام نہیں آتی، اور جس کو یہیں چھوڑ کر ایک دن جانا ہے۔ اور انہوں نے یہ ساری قربانیاں ایک ایسی چیز کے لیے دیں جو ہمیشہ ہمیش ان کے ساتھ آنے والی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی بھی دلانے والی ہے۔ عقلمندی اور دانشمندی کا طریقہ کون سا ہے۔ اس لئے قرآن وحدیث میں خاص طور پر ترغیب دی گئی کہ آدمی اپنے کھانے پینے اور لباس کی ضرورتیں کم سے کم رکھے، اور اپنی نفسانی خواہشات کو چھوڑنے کا اہتمام کرے اور خشونتِ عیش یعنی کھردری زندگی گزارنے کی کوشش کرے، ایسی زندگی جس میں آدمی بہت سادگی کے ساتھ رہتا ہو۔ اس باب میں علامہ نوویؒ ایسی ہی زندگی کی فضیلت بیان کرنا چاہتے ہیں۔

ناخَلَف اولاد کی دو بُری خصلتیں

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا۔ سورۂ مریم کی آیت ہے: ﴿فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ﴾ اس آیت سے پہلے بہت سارے انبیاء کا تذکرہ ہے اور ان کے حالات بتائے ہیں کہ وہ نمازوں کو قائم کرتے تھے، اس کے اوقات اور اس کی ساری چیزوں-فرائض، واجبات، سنن- اور اس کے سارے تقاضوں کا نہایت اہتمام کرتے تھے، اس کے بعد باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کے بعد ایسے ناخَلَف لوگ آئے (''خَلۡفٌ'' ایسی اولاد اور ایسے جانشین جو اپنے بڑوں کے اوصاف اور خوبیوں کے حامل نہ ہوں۔ ان کے

بڑے جو اچھے کام کرتے تھے ان اچھے کاموں کو وہ انجام نہ دیتے ہوں اور ان کے بڑوں میں جو خوبیاں تھیں، وہ ان سے متصف نہ ہوں؛ ایسے لوگوں کو عربی میں ''خَلْفٌ'' کہتے ہیں، جس کا اردو ترجمہ ہم ''ناخَلَف اور ناہنجار اولاد'' کرتے ہیں) ﴿أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ﴾ جنہوں نے نمازوں کو ضائع کیا ﴿وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ﴾ اور جنہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ﴿فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ یہ لوگ برا بدلہ پائیں گے ﴿إِلَّا مَنْ تَابَ﴾ (البتہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا کی زندگی میں موقعہ اور مہلت ہے) مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی، ایمان لائے، اور اچھے اعمال کیے۔ اگر بعد میں یہ صفات اختیار کرلیں، تو پھر وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے، ان کے اچھے اعمال کا بدلہ دینے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

اس آیت میں خاص طور پر دو چیزیں بیان کی ہیں ﴿أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ﴾ ﴿وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ﴾ نماز کو ضائع کیا اور اپنی خواہشات کی پیروی کی۔ معلوم ہوا خواہشات کی پیروی کرنا نہایت بُری چیز ہے جس کو چھوڑنا چاہیے۔

حقیقی دولت یہ نہیں، وہ ہے......

دوسرا ارشاد نقل کیا: ﴿فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ﴾ قارون کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بہت دولت دے رکھی تھی، صرف اس کے خزانوں کی کنجیاں اُٹھانے کے لئے طاقتور آدمیوں کی ایک پوری جماعت ہوتی تھی، ایک مرتبہ وہ اپنے ٹھاٹ باٹھ والے زیب و زینت کے لباس میں باہر نکلا ﴿قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا﴾ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آدمی دنیوی اعتبار سے خوشحال ہو، اور وہ اپنی خوشحالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اچھے لباس یا اچھی گاڑی اور سواری لے کر نکلے، تو اس کو

دیکھ کر بہت سے لوگوں کی رال ٹپکنے لگتی ہے، چناں چہ قارون بھی جب اس لباس میں نکلا تو وہ لوگ جو دنیوی زندگی کے خواہش مند تھے وہ کہنے لگے: ﴿يَالَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوْتِيَ قَارُوْنُ﴾ کاش ہمیں بھی ایسی دولت ملتی جو قارون کو دی گئی ہے ﴿إِنَّهُ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ﴾ وہ تو بڑا نصیب والا ہے۔ گویا اس کی ظاہری حالت کو دیکھ کر وہ بھی رال ٹپکانے لگے اور اس جیسی حالت کی اپنے لیے تمنا کرنے لگے ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ لیکن وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت عطا فرمائی تھی اور علم سے نوازا تھا، وہ دنیا کے خواہش مندوں کی بات سن کر کہنے لگے ﴿وَيْلَكُمْ﴾ تمہارا ناس ہو ﴿ثَوَابُ اللهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخرت کے اندر جو بدلہ ملنے والا ہے وہ ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو ایمان لائیں اور عمل صالح کریں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی دولت نہیں ہے، حقیقی دولت تو وہ ہے جو آخرت میں ملنے والی ہے، لیکن وہ ایمان اور اعمالِ صالحہ پر ملنے والی ہے۔ اس لیے آدمی کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

ہر نعمت کے متعلق سوال کیا جائے گا

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ﴾ پھر قیامت کے روز نعمتوں کے متعلق تم سے سوال کیا جائے گا۔ ویسے آدمی تمنا تو کرتا ہے کہ مجھے یہ ملے اور وہ ملے، دولت ملے، لیکن آدمی کو سوچنا چاہیے کہ دنیوی اعتبار سے جو کچھ بھی دیا جاتا ہے وہ سب اگرچہ اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ تمنا کرنے کے بعد اگر مل گیا تو کیا اس کا حق اور اس کا شکر بھی ادا کر سکو گے؟ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان تمام نعمتوں کے متعلق سوال ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے دی ہیں۔ ہر نعمت — چاہے تندرستی ہو، فرصت ہو، دولت ہو اور کھانا پینا لباس ہو، اس کے متعلق پوچھا

جائے گا کہ اس نعمت کا کیا حق ادا کیا۔

ایک قصہ

امام حاکم شہیدؒ نے مستدرک میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک لمبی روایت نقل فرمائی ہے جو صحیح سند کے ساتھ مروی ہے، اور اس کو امام منذریؒ نے الترغیب والترہیب میں نقل کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ گھر سے باہر تشریف لاکر فرمایا ابھی ابھی میرے دوست حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے تھے اور یہ فرمایا کہ پچھلی امتوں میں سے اللہ کا ایک بندہ اپنے گھر بار عزیز واقارب مال ودولت سب کچھ چھوڑ کر سمندر کے بیچ میں پہاڑ نما ایک ٹیلہ تھا اس میں جاکر عبادت کرنا شروع کردی، وہ سمندر اتنا وسیع تھا کہ اس ٹیلہ کی ہر جانب چار چار فرسخ دوری تک سمندر تھا، وہاں پر کوئی کھانے کی چیز نہیں تھی، اور سمندر کا پانی بھی بالکل نمکین تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس میں ایک انار کا درخت اُگادیا، اور انگلی کے برابر میٹھے پانی کا ایک چشمہ جاری کردیا، یہ عابد دن رات چوبیس گھنٹہ اپنی عبادت میں گزار دیتا اور چوبیس گھنٹے میں انار کا ایک پھل کھالیتا اور میٹھے پانی کے چشمہ سے ایک گلاس پانی نوش فرمالیتا، اسی حالت میں پانچ سو سال گزر گئے، پانچ سو سال کے بعد جب اس عابد کی موت کا وقت آیا تو اس نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے یہ دعا مانگی کہ سجدے کی حالت میں اس کی روح پرواز کرجائے، اور اس کی نعش کو مٹی وغیرہ ہر چیز پر حرام کردے، اور قیامت تک سجدے کی حالت میں صحیح وسالم رہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول فرمائی، سجدے کی حالت میں اس کی موت ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ نے وہاں ایسا انتظام کررکھا ہے کہ قیامت تک وہاں کسی انسان کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ قیامت کے دن اس عابد کو اللہ کے

دربار میں حاضر کیا جائے گا، تو اللہ پاک فرشتوں سے فرمائے گا کہ میرے بندے کو میرے فضل سے جنت میں داخل کردو، تو وہ عابد کہے گا: "رَبِّ بَلْ بِعَمَلِيْ" کہ اے میرے رب! بلکہ میرے عمل کے بدلے میں جنت میں داخل کر دیجئے، کیوں کہ میں نے پانچ سو سال تک ایسی عبادت کی ہے جس میں کسی قسم کی ریاکاری کا شائبہ بھی نہیں تھا، تو اللہ پاک پھر فرمائے گا کہ میری رحمت سے داخل کردو، تو یہ بندہ کہے گا کہ میرے عمل کے بدلے میں داخل کیجئے، تو اس پر اللہ پاک فرمائے گا کہ اس کے عمل اور میری دی ہوئی نعمتوں کا موازنہ کرو، تو موازنہ کر کے دیکھا جائے گا کہ اللہ نے جو اس کو بینائی عطا فرمائی ہے، صرف بینائی کی نعمت اس کی پانچ سو سال کی عبادت کا احاطہ کرلے گی، اس کے بعد پورے جسم میں کان کی نعمت، زبان کی نعمت، ہاتھ کی نعمت، ناک کی نعمت، پیر کی نعمت، دل و دماغ کی نعمت، ان سب کا بدل باقی رہ جائے گا، پھر ان کے علاوہ جو پانچ سو سال تک اللہ نے میٹھا پانی پلایا ہے اور انار کا پھل کھلایا ہے، ان تمام کا بدل باقی رہ جائے گا، تو اللہ پاک فرمائے گا کہ اس کی پانچ سو سال کی عبادت تو صرف نعمتِ بصر کے بدلے میں ختم ہوگئی، ہماری باقی نعمتوں کا بدل کہاں ہے؟ لہٰذا اس کو جہنم میں داخل کردو، تو فرشتے اسے گھسیٹ کر جہنم کی طرف لے جانے لگیں گے، تو وہ چلّانے لگے گا، اے میرے رب! محض اپنی رحمت سے مجھے جنت میں داخل فرما دیجئے، تو اللہ کی طرف سے کہا جائے گا کہ تجھے تو اپنی پانچ سو سال کی عبادت پر بڑا ناز تھا، اب تیری عبادت کہاں چلی گئی؟ اور خطرناک سمندر کے بیچ میں میں نے تجھے انار کے پھل کھلائے اور پانچ سو سال تک مسلسل میٹھا پانی پلایا، میری ان نعمتوں کے بدلے میں تم کیا لائے ہو؟ تو وہ کہے گا کہ اے اللہ! آپ اپنی رحمت سے مجھے جنت میں داخل فرمائیے، آپ کی رحمت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوسکتا ہے، پھر آخر میں جب حجت تمام ہوجائے گی تو اللہ

تعالیٰ فرمائے گا کہ میری رحمت و میرے فضل کے ذریعے اس کو جنت میں داخل کردو۔

......تو وہ عابد اپنے دل دل میں کہے گا کہ میں نے پانچ سو سال تک ایسی عبادت کی ہے جس میں ریا کاری کا شائبہ تک نہیں، اور اب اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے جنت میں داخل کر رہا ہے اور میری پانچ سو سال کی عبادت کا ذکر تک نہیں کیا، اللہ تعالیٰ دلوں کی باتوں کو جاننے والا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہے گا کہ اس کو جنت کے بجائے جہنم کی طرف لے جاؤ، اور جہنم سے اتنی دوری پر کھڑا کردو کہ اس کے اور جہنم کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہو، جب اتنی دوری پر کھڑا کر دیا جائے گا تو جہنم کی طرف سے گرم لُو چلے گی، جس سے اس عابد کا حلق خشک ہو جائے گا اور پیاس کے عالم میں سخت پریشانی میں مبتلا ہو جائے گا، اسی اثناء میں ایک دستِ غیب نمودار ہوگا جس میں ایک گلاس پانی ہوگا، یہ عابد اس کو دیکھ کر چلّا چلّا کر کہے گا کہ یہ پانی مجھے دے دیا جائے، تو ایک آواز آئے گی: پانی مل سکتا ہے مگر اس کی قیمت ہے، مفت میں نہیں ملے گا یہ عابد کہے گا کہ اس کی قیمت کیا ہے؟ تو آواز آئے گی کہ اس کی قیمت پانچ سو سال کی ایسی عبادت ہے جس میں کسی قسم کی ریا کاری کا شائبہ تک نہ ہو، تو یہ کہے گا کہ میرے پاس ایسی عبادت موجود ہے، لہٰذا میں پانچ سو سال کی عبادت دے دیتا ہوں مجھے یہ پانی پلا دیا جائے، چناں چہ پانچ سو سال کی عبادت کے بدلے میں یہ پانی خرید کر پی لے گا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کہے گا کہ اس کو پھر اب میرے پاس لاؤ، چناں چہ اللہ کے دربار میں حاضر کیا جائے گا تو اللہ پاک فرمائے گا کہ تجھے تو اپنی پانچ سو سال کی عبادت پر بڑا ناز تھا؟ اور اس کی قیمت ایک گلاس پانی تم نے خود تجویز کی ہے، اور ہم نے جو پانچ سو سال تک تم کو انار کا پھل کھلایا ہے، اور میٹھا پانی پلایا ہے، تم اس کے عوض میں کیا لائے ہو؟ تو وہ عابد اللہ کے دربار میں سربسجود ہو کر فریاد کرے گا کہ اے اللہ! اب بات سمجھ میں

آ گئی کہ تیری رحمت اور فضل کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا، چناں چہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت وفضل سے اس کو جنت میں داخل فرمادے گا۔ (انوارِ ہدایت صفحہ ۲۷۱، ۲۷۲)

تو حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت کا بھی ہم حساب نہیں دے سکتے۔ اس کے بالمقابل اگر ہم کسی کو مہینہ کے دو چار ہزار روپے دے کر ملازمت پر رکھتے ہیں تو اس کے آٹھ گھنٹے ایسے خریدتے ہیں کہ پوری مزدوری کراتے ہیں۔ اگر وہ ذرا بھی کمی کرے تو اس کو ڈانٹتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اتنی ساری نعمتیں دے رکھی ہیں، اس کے بعد ہم کیا کرتے ہیں؟ یعنی کوئی آدمی اگر اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی کرتا ہے تو ان نعمتوں کا بدلہ کہاں ادا ہوسکتا ہے؟ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ آدمی بہت کچھ تمنائیں کرتا ہے، لیکن یہ بھی سوچنا چاہیے کہ میں جن چیزوں کی تمنائیں کرتا ہوں، اگر مل بھی گئیں، تو کیا میں ان کا حق ادا کرسکوں گا؟ اس لئے باری تعالیٰ نے فرمایا: قیامت کے روز اللہ کی نعمتوں کے متعلق تم سے سوال کیا جائے گا۔ اس لئے پہلے تو ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا حق بھی ہم سے ادا ہو رہا ہے یا نہیں؟

دنیا کی وسعت اگر مطلوب ہوتی......

۴۹۱- وعن عائشة رَضِيَ الله عنها قَالَتْ: مَا شَبِعَ آلُ مُحَمَّدٍ ﷺ مِنْ خُبْزِ شَعِيْرٍ يَوْمَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ حَتّٰى قُبِضَ. (متفقٌ عليهِ)

وفِي رِوَايَة: مَا شَبِعَ آلُ مُحَمَّدٍ ﷺ مُنْذُ قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ مِنْ طَعَامِ الْبُرِّ ثَلَاثَ لَيَالٍ تِبَاعاً حَتّٰى قُبِضَ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے گھرانے والوں نے کبھی جَو کی روٹی بھی مسلسل دو دن پیٹ بھر کر نہیں کھائی، یہاں تک

کہ نبی کریم ﷺ کی وفات ہوئی۔

افادات:- جَو اس زمانہ میں سب سے گھٹیا اور کمتر چیز سمجھی جاتی تھی، وہ بھی نبی کریم ﷺ کے گھر والوں کو مسلسل دو روز پیٹ بھر کر میسر نہیں ہوئے۔ دوسری روایت میں ہے کہ جب سے نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے، آپ کے گھر والے کبھی گیہوں کی روٹی سے تین رات مسلسل شکم سیر نہیں ہوئے یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوئی۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کھانے پینے اور دنیا کی چیزوں کی وسعت اگر کوئی مطلوب چیز ہوتی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ذریعہ ہوتی، تو اس کے زیادہ حق دار نبی کریم ﷺ اور آپ کے گھر والے تھے، آپ ﷺ نے اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے جو حالت پسند کی اسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو رکھا، اگر آپ چاہتے تو دوسری حالت کا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ کیا جاتا۔

اس روایت سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! آپ کے گھر والوں کا بھوکا رہنا یہی وہ حالت ہے جو اللہ کے رسول ﷺ کے نزدیک پسندیدہ ہے، اور جب اللہ کے رسول اس حالت کو پسند کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ذریعہ بھی یہی حالت بنے گی، آج کل تو ہم اس طرح بھوکا رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اُمت کے لیے بھی پسندیدہ یہی ہے

۴۹۲ - وَعَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا أَنَّهَا كَانَتْ تَقُوْلُ: وَاللهِ يَاابْنَ أُخْتِيْ! إِنْ كُنَّا نَنْظُرُ إِلَى الْهِلَالِ، ثُمَّ الْهِلَالِ، ثَلَاثَةُ أَهِلَّةٍ فِيْ شَهْرَيْنِ، وَمَا أُوْقِدَ فِيْ أَبْيَاتِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ نَارٌ. قُلْتُ: يَا خَالَةُ! فَمَا كَانَ يُعِيْشُكُمْ؟ قَالَتْ: أَلْأَسْوَدَانِ: التَّمْرُ وَالْمَاءُ، إِلَّا أَنَّهُ قَدْ كَانَ لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ جِيْرَانٌ مِنَ الْأَنْصَارِ،

وَكَانَتْ لَهُمْ مَنَائِحُ وَكَانُوا يُرْسِلُونَ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ مِنْ أَلْبَانِهَا فَيَسْقِينَا.

(متفقٌ علیه)

ترجمہ:-حضرت عروہؒ (جو حضرت اسماءؓ کے بیٹے، حضرت زبیرؓ کے صاحب زادے اور حضرت عائشہؓ کے بھانجے ہیں، اپنی خالہ) ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ کہا کرتی تھیں: اللہ کی قسم اے میرے بھانجے! ہم ایک چاند دیکھتے، پھر دوسرا چاند دیکھتے، اس طرح تین چاند دو مہینے کے دوران ہوتے ہیں (مہینہ کے شروع میں چاند دیکھا پھر مہینہ آیا اس کا چاند دیکھا، پھر اس کے بعد والے مہینے کا چاند دیکھا، اس طرح تین چاند دیکھے تو درمیان میں دو مہینے گذرے) اور حال یہ ہوتا تھا کہ نبی کریم ﷺ کے گھروں میں آگ نہیں جلائی جاتی تھی، چولہا نہیں جلتا تھا (گویا پکانے کے لیے کوئی چیز ہوتی ہی نہیں تھی، اور یہ حضور اکرم ﷺ کی تمام ازواجِ مطہرات کے گھروں کا حال تھا) حضرت عروہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: خالہ جان! پھر کونسی چیز تمہیں زندہ رکھتی تھی؟ (کیا کھا کر زندہ رہتے تھے؟) تو حضرت عائشہؓ نے جواب میں فرمایا: "الأسودان" دو کالی چیزیں یعنی کھجور اور پانی (پانی بھی آپ کنویں میں دیکھیں تو اوپر سے کالا ہی نظر آتا ہے) البتہ نبی کریم ﷺ کے کچھ انصاری پڑوسی تھے جن کے دودھ دینے والے جانور تھے، وہ کبھی حضور ﷺ کے لیے دودھ بھیج دیتے تھے، وہ حضور ہم کو پلا دیتے تھے (روٹی یا گوشت اور سالن ایسی کوئی چیز مسلسل دو مہینے تک میسر نہیں آتی تھی۔)

افادات:- بتلانا چاہتے ہیں کہ زندگی گذارنے کی جو حالت اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبِ پاک ﷺ کے لیے پسند فرمائی وہ یہی ہے۔ اور جب یہ حالت حضور ﷺ کے لیے مطلوب اور محبوب رہی، تو اُمت کے لیے بھی یہی حالت محبوب ہوگی، اور حقیقتاً یہی حالت اللہ تعالیٰ کے یہاں پسندیدہ بھی ہے، لیکن ہم اپنی کمزوری کی وجہ سے اس

حالت کو برداشت نہیں کر سکتے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو گنجائش دی ہے، اس سے اس کی حد میں رہ کر ہم فائدہ اُٹھاتے رہیں، لیکن پھر اپنی اس حالت پر مغرور بھی نہ ہوں، بلکہ اپنی اس حالت کو پسند نہ کریں، پسند تو اسی حالت کو کرنا چاہیے۔

حضور کا زمانہ یاد آ گیا

۴۹۳ - وعن أَبِي سَعِيدٍ الْمَقْبُرِيِّ عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ: أَنَّهُ مَرَّ بِقَوْمٍ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ شَاةٌ مَصْلِيَّةٌ، فَدَعَوْهُ، فَأَبَى أَنْ يَأْكُلَ، وقَالَ: خَرَجَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مِنَ الدُّنْيَا وَلَمْ يَشْبَعْ مِنْ خُبْزِ الشَّعِيرِ. (رواه البخاري)

(الْمَصْلِيَّةُ) بفتح الميم: أيْ مشْوِيَّةٌ.

ترجمہ:- حضرت ابوسعید مقبری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا گزر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا، جو کھانے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے، اوران کے سامنے بھونی ہوئی بکری رکھی تھی، جب انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا تو ان کو بھی دعوت دی کہ آیئے! تشریف لایئے، آپ بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو جایئے۔ تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کھانے میں شریک ہونے سے انکار کر دیا، اوران کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت یاد آ گئی تو فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو دنیا سے ایسی حالت میں تشریف لے گئے کہ آپ نے جَو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی اور ہم بھونی ہوئی بکریاں کھائیں۔

افادات:- یہ ان کا ایک حال ہے کہ اس وقت وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت یاد آئی تو انہوں نے کھانے میں شریک ہونا پسند نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بھونی ہوئی بکری کھانا ناجائز ہے، یہاں تو بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ دیکھو! نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا

کیا حال تھا کہ آپ دنیا سے ایسی حالت میں تشریف لے گئے کہ جَو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غذا

۴۹۴- وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: لَمْ يَأْكُلِ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عَلىٰ خِوَانٍ حَتّٰى مَاتَ، وَمَا أَكَلَ خُبْزاً مُرَقَّقاً حَتّٰى مَاتَ. (رواہ البخاری)

وفي رِوَايَةٍ لَهٗ: وَلاَ رأى شَاةً سَمِيطاً بِعَيْنِهٖ قَطُّ.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی خِوَان پر کھانا نہیں کھایا، یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوگئی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی چپاتی (پتلی روٹی) بھی نہیں کھائی یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ کھال اتاری ہوئی بھونی ہوئی بکری آپ نے کبھی اپنی آنکھوں سے دیکھی بھی نہیں۔

افادات:- "خِوَانٌ" اس زمانہ کے اندر ایک تھالی سی بنی ہوئی ہوتی تھی اور اس کے نیچے پائے لگے ہوتے تھے، اس کے اوپر کھانا سجا کر خوشحال لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ وہ تھال زمین سے ذرا اونچا ہونے کی وجہ سے اس پر سے کھانا لینے کے لیے جھکنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، اُس زمانہ میں اس کا رواج بھی نہیں تھا۔ آگے تذکرہ آرہا ہے، بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بھونی ہوئی بکری پکوائی اور لوگوں کو کھلائی پھر فرمایا کہ یہ چیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی نہیں کھائی، اب تو خوشحالی کا زمانہ آیا ہے اس لیے تم کھا رہے ہو۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی چپاتی (پتلی روٹی) بھی نہیں کھائی یہاں تک کہ آپ کی

وفات ہوگئی۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ کھال اتاری ہوئی بھونی ہوئی بکری آپ نے کبھی اپنی آنکھوں سے دیکھی بھی نہیں، کھانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ چیزیں کھانا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ روایت میں موجود ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے دعوت میں یہ دونوں چیزیں لوگوں کو کھلائیں، لیکن یہ بھی فرمادیا کہ دیکھو! یہ چیزیں مطلوب نہیں ہیں، ان کی وجہ سے اترانے کی ضرورت نہیں ہے، مطلوب تو یہ ہے کہ آدمی سادہ زندگی گزارے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حال یہ تھا کہ آپ جس وقت دنیا سے رخصت ہوئے وہاں تک یہ چیزیں کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کھائیں۔

ہمارے لیے نمونہ

۴۹۵-عن النعمان بن بشیر رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: لَقَدْ رَأَيْتُ نَبِيَّكُمْ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَمَا يَجِدُ مِنَ الدَّقَلِ مَا يَمْلأُ بِهِ بَطْنَهُ. (رواه مسلم)

(الدَّقَلُ): تَمْرٌ رَدِيءٌ.

ترجمہ:- حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے تمہارے نبی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کو کبھی گھٹیا قسم کی کھجوریں بھی اتنی میسر نہیں ہوئیں جن سے آپ اپنا پیٹ بھر سکیں۔

افادات:- ''الدَّقَلُ'' یعنی وہ کھجوریں جو سوکھ گئی ہوں۔ ہمارے یہاں جو کھجوریں آتی ہیں ان میں کبھی کوئی پیشی سوکھی ہوئی نکل آتی ہے جو خراب قسم کی کھجور کہلاتی ہے۔ ایسی خراب اور گھٹیا قسم کی کھجور بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کبھی اتنی میسر نہیں ہوئی جس سے آپ اپنا پیٹ بھر سکیں؛ تو اعلیٰ قسم کی کھجوروں کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح اپنی زندگی گزاری کہ کھانے پینے کے معاملہ میں آپ کا یہ حال تھا، گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ایسی سادہ تھی۔ اب

ہمارے لیے تو نمونہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک ذات ہی ہے، ہم اگر اس کا ہو بہو پورا اقتداء نہ کرسکیں، تو کم سے کم کوشش تو یہی کرنی چاہیے، یا کم از کم ان حالات سے آگاہ اور باخبر تو ہونا چاہیے، اور اس حالت کو اپنے لیے پسند تو کرنا ہی چاہیے۔

بغیر چھنے آٹے کی روٹی

۴۹۶- وعن سهل بن سعد رضی اللہ عنہ قَالَ : مَارَأَى رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم النَّقِيَّ مِنْ حِيْنِ ابْتَعَثَهُ اللهُ تَعَالىٰ حَتّٰى قَبَضَهُ اللهُ تَعَالىٰ فَقِيْلَ لَهُ : هَلْ كَانَ لَكُمْ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مَنَاخِلُ؟ قَالَ مَا رَأَى رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مُنْخُلاً مِنْ حِيْنَ ابْتَعَثَهُ اللهُ تَعَالىٰ حَتّٰى قَبَضَهُ اللهُ تعالى. فَقِيْلَ لهُ: كَيْفَ كُنْتُمْ تأكُلُوْنَ الشَّعِيْرَ غَيْرَمَنْخُوْلٍ؟ قَالَ: كُنَّا نَطْحَنُهُ. فَيَطِيْرُمَا طَارَ، وَمَا بَقِيَ ثَرَّيْنَاهُ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی میدے کی روٹی نہیں دیکھی جب سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوئی۔ اس پر حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں چھلنی (جس میں آٹا چھانا جاتا ہے) نہیں ہوتی تھی؟ انہوں نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی چھلنی نہیں دیکھی جب سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوئی۔ پھر ان سے پوچھا گیا کہ بغیر چھنے ہوئے جَو کے آٹے کی روٹی تم لوگ کیسے کھاتے تھے؟ تو انہوں نے کہا کہ چھلنی تو نہیں تھی لیکن ہم جب جَو کا آٹا چکی کے اندر پیستے تھے تو اس کے بعد ہم اوپر سے پھونک مار دیتے تھے، جس سے بڑے بڑے چھلکے اُڑ جاتے تھے، اس کے بعد آٹے کو بھگا کر روٹی بنا لیتے تھے۔

افادات:- ہم لوگ تو گیہوں کا آٹا بھی چھان کر روٹی بناتے ہیں، اور آٹے کو چھان لینے کی وجہ سے میدہ زیادہ نرم ہوجاتا ہے۔ اور جَو کو جب پیسا جاتا ہے تو

اس میں بھوسہ ہوتا ہے، اور اس میں چھلکے زیادہ ہوتے ہیں، اس کے آٹے کو بغیر چھانے ہوئے گوندھا ہی نہیں جا سکتا، جیسے گیہوں کے جو چھلکے نکلتے ہیں تو صرف ان چھلکوں کو گوندھا نہیں جا سکتا، اس میں چکنا پن ہی نہیں ہوتا کہ آٹے کی طرح گوندھا جا سکے۔ جَو کے آٹے میں چھلکے اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ اس کو بغیر چھانے اور بغیر چھلکے نکالے ہوئے گوندھا ہی نہیں جا سکتا، اور آٹا جب تک گوندھا نہیں جائے گا وہاں تک روٹی نہیں بنے گی۔ تو جب انہوں نے یہ کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی چھلنی دیکھی ہی نہیں، تو پوچھنے والے نے پوچھا کہ جَو کی روٹی تم کھاتے تھے تو جَو کی روٹی بغیر چھلنی کے کیسے بنتی تھی؟ اس لئے کہ چھلکے نکالنے ضروری ہوتے ہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ اس پر پھونک مار دیتے تھے، جس سے موٹے موٹے چھلکے اُڑ جاتے تھے۔

اور جیسا کہ شروع میں کہا تھا کہ بھوک کی فضیلت اور مجاہدے والی سخت زندگی گزارنے کی فضیلت بیان کرنا چاہتے ہیں، اسی لئے یہ ساری روایتیں پیش کی ہیں۔ اور ظاہر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے لیے زندگی گزارنے کی جو حالت پسند فرمائی، اس سے بہتر حالت اور کونسی ہوگی؟ اس لیے ہم لوگوں کو بھی چاہیے کہ اگر اس پر عمل نہ کر سکیں تو کم سے کم بار بار ان چیزوں کو پڑھتے رہیں، اور دل و دماغ میں ان کو جمائے رکھیں، اس کی وجہ سے بھی بہت کچھ فرق پڑ سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ان چیزوں کو ایسا بھلا دیا جائے کہ خیال ہی نہ رہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کیسی تھی اور آپ کس طرح زندگی گزارتے تھے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق وسعادت عطا فرمائے

دعا

اے اللہ! نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقۂ زندگی کو اختیار کرنے کی ہمیں توفیق اور

ہمت عطا فرما۔ اے اللہ! اسی طریقِ زندگی کی محبت ہمارے دلوں میں پیدا فرما اور اسی کے لئے سعی ومحنت کرنے کی توفیق مرحمت فرما۔ اے اللہ! ہماری تمام ضرورتوں کی کفالت فرما۔

فَضْلُ الْجُوْع

وَخُشُوْنَةِ الْعَيْشِ

بھوک وفاقہ برداشت کرنے

اور

سادہ زندگی بسر کرنے کی فضیلت

﴿مجلس ۲﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب قائم کیا جس میں بتلانا چاہتے ہیں کہ فاقہ اور بھوک برداشت کرنے اور سادہ زندگی گذارنے کی کیا فضیلت ہے۔ اور کھانے پینے، لباس اور دوسری انسانی ضرورتوں میں آدمی کم سے کم پر اکتفاء کرے، اور اپنی نفسانی خواہشات کو چھوڑنے کا اہتمام کرے، تو اس کی کیا فضیلت ہے۔

چناں چہ اسی سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اور واقعہ ذکر کیا ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو گروہ انبیاء کے بعد انسانوں میں سب سے افضل سمجھے جاتے ہیں، وہ بھی شریک ہیں۔ اس واقعہ کے ذریعہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ یہ حضرات جو انسانیت کے افضل ترین افراد ہیں ان کی زندگی کیسی تھی اور وہ کھانے پینے اور ضروریات کی تکمیل کے معاملہ میں کتنا کم سے کم پر اکتفاء کرتے تھے اور کیسی مشقتیں اور مجاہدے، اور فقر و فاقہ برداشت کرتے تھے۔ ہمارے لیے ان حضرات کی زندگی ایک نمونہ ہے، اور ہمیں بھی انہیں کا اتباع اور پیروی کرنا چاہیے۔

افضل ترین افراد کی زندگی

۴۹۷- وَعَنۡ اَبِي هُرَيۡرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: خَرَجَ رَسولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذَاتَ يَوۡمٍ أَوۡ لَيۡلَةٍ فَإِذَا هُوَ بِأَبِي بَكۡرٍ وَعُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنۡهُمَا، فَقَالَ: مَا أَخۡرَجَكُمَا مِنۡ بُيُوتِكُمَا هٰذِهِ السَّاعَةَ؟ قَالَا: الۡجُوۡعُ يَا رَسُوۡلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ قَالَ: وَأَنَا، وَالَّذِي نَفۡسِي بِيَدِهٖ لَأَخۡرَجَنِي الَّذِيۡ أَخۡرَجَكُمَا، قُوما، فَقَامَا مَعَهٗ فَأَتٰى رَجُلاً مِنَ الۡأَنۡصَارِ، فَإِذَا هُوَ لَيۡسَ فِيۡ بَيۡتِهٖ، فَلَمَّا رَآتۡهُ الۡمَرۡأَةُ، قَالَتۡ مَرۡحَبًا وَأَهۡلًا، فَقَالَ لَهَا رَسُوۡلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: أَيۡنَ فُلَانٌ؟ قَالَت؟: ذَهَبَ يَسۡتَعۡذِبُ لَنَا الۡمَاءَ، إِذۡ جَاءَ الۡأَنۡصَارِيُّ، فَنَظَرَ إِلَى

رَسُوْلِ اللهِ ﷺ وَصَاحِبَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، مَا أَحَدٌ الْيَوْمَ أَكْرَمَ أَضْيَافاً مِنِّي فَانْطَلَقَ فَجَاءَ هُمْ بِعِذْقٍ فِيْهِ بُسْرٌ وَتَمْرٌ وَرُطَبٌ، فَقَالَ كُلُوْا، وَ أَخَذَ الْمُدْيَةَ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: إِيَّاكَ وَالْحَلُوْبَ فَذَبَحَ لَهُمْ، فَأَكَلُوْا مِنَ الشَّاةِ وَمِنْ ذٰلِكَ الْعِذْقِ وَشَرِبُوْا، فَلَمَّا أَنْ شَبِعُوْا وَرَوُوْا قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لِأَبِي بَكْرٍ وَ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا: والذی نفسی بیده، لَتُسْأَلُنَّ عَنْ هٰذَا النَّعِيْمِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُيُوْتِكُمْ الْجُوْعُ، ثُمَّ لَمْ تَرْجِعُوْا حَتّٰى أَصَابَكُمْ هٰذَا النَّعِيْمُ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ اپنے مکان سے باہر تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی باہر موجود ہیں حضور ﷺ نے ان دونوں حضرات سے پوچھا: اس وقت آپ دونوں کو گھروں سے باہر نکالنے کا باعث کیا چیز ہوئی؟ یعنی یہ وقت عام طور پر گھر سے نکلنے کا نہیں ہے، پھر تم اپنے گھروں سے باہر کیوں آئے؟ ان دونوں حضرات نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: ''اَلْجُوْعُ يَا رَسُوْلَ اللهِ'' بھوک کی شدت نے اس وقت ہم لوگوں کو اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا۔ بھوک اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے، اس اُمید پر باہر نکلے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ شاید کچھ انتظام فرمادے۔ اُن کے اس جواب کو سن کر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، تم دونوں کو جس چیز نے اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا، اسی چیز نے مجھے بھی اپنے گھر سے نکالا ہے، یعنی مجھ پر بھی بھوک کا وہی شدید حملہ ہے اور اسی کے تقاضے نے مجھ کو باہر نکالا ہے۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ان دونوں حضرات سے فرمایا: چلو۔ چناں چہ یہ دونوں حضرات نبی کریم ﷺ کے ساتھ چلے، آپ ایک انصاری صحابی کے یہاں ان کے باغ میں تشریف لے گئے (علامہ نوویؒ نے بتلایا ہے کہ ان انصاری صحابی کا نام ''أَبُو الْهَيْثَمِ بْنِ التَّيِّهَان'' تھا)

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب وہاں پہنچے تو وہ اپنے باغ کے مکان پر موجود نہیں تھے۔جب ان کی اہلیہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے یہاں آیا ہوا دیکھا تو عرض کیا: مَرْحَباً وَّأَهْلاً، خوش آمدید۔ گویا ان کا استقبال کیا کہ تشریف لائیے۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا: تمہارے شوہر کہاں ہیں؟ ان کی اہلیہ نے جواب دیا: وہ پینے کے لیے میٹھا پانی لینے باہر گئے ہوئے ہیں (چوں کہ عام طور پر وہاں میٹھا پانی میسر نہیں ہوتا تھا تو پینے کی ضرورت پوری کرنے کے لیے دور دراز علاقوں سے اس کا انتظام کیا جاتا تھا) کچھ ہی دیر میں وہ صحابی پہنچ گئے، جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے دونوں رفقاء کو اپنے باغ میں دیکھا تو مارے خوشی کے کہنے لگے: الحمد للہ۔ گویا آپ حضرات بار بار کہاں آتے ہیں، آپ کا میرے یہاں آنا میری سعادت کی بات ہے۔آج مجھ سے بڑھ کر شریف مہمانوں والا کوئی نہیں ہوسکتا۔آج میرے گھر جو شخصیت آئی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں آج کسی کے یہاں ایسے مہمان نہیں ہوں گے (اور ظاہر ہے کہ اُن کی بات اپنے جگہ پر سو فیصد درست تھی) چناں چہ ان حضرات کو آیا ہوا دیکھ کر میزبانی کے لیے فوراً گئے اور اپنے باغ میں سے کھجوروں کا ایک خوشہ توڑ کر لے آئے جس میں تازہ پکی ہوئی کھجوریں اور پک کر جو کھجوریں سوکھ جاتی ہیں، جن کو عام طور پر ہم استعمال کرتے ہیں، اور ادھ پکی کھجوریں تینوں قسم کی موجود تھیں، اور پورا خوشہ لا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے درخواست کی کہ آپ نوش فرمایئے۔ پھر انھوں نے چھری لی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھ گئے کہ وہ بکری یا اُس کا بچہ ذبح کرنا چاہتے ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاکید فرمائی: دودھ دینے والے جانور سے بچیو (مطلب یہ ہے کہ جو بکری اس وقت دودھ دے رہی ہے اس کو ذبح مت کرنا، اس لئے کہ اس وقت مقصد صرف گوشت خوری ہے اور جو بکری دودھ نہیں دے رہی ہے اس کو ذبح کرنے

سے بھی یہ مقصد حاصل ہو جائے گا۔اب اگر دودھ دینے والی بکری ذبح کرو گے تو گوشت کھانے کا مقصد تو حاصل ہو جائے گا لیکن دوسرے فائدہ سے محرومی ہو گی۔اس سے معلوم ہوا کہ ضرورتوں کی تکمیل میں بھی آدمی کو سوچ سمجھ کر فیصلہ اور مناسب انداز اختیار کرنا چاہیے۔دیکھئے! اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دودھ دیتی بکری ذبح کرنے سے منع فرمایا) چناں چہ انھوں نے ان حضرات کے لیے ایک بکری ذبح کی، گوشت پکایا، ان حضرات نے اس کو کھایا اور کھجور کا جو خوشہ توڑ کر لائے تھے اس میں سے بھی کھایا اور پھر پانی نوش کیا جب یہ حضرات کھا پی کر شکم سیر اور سیراب ہو گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: قسم ہے اس ذاتِ پاک کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، قیامت کے روز ان نعمتوں کے متعلق تم سے سوال کیا جائے گا۔(دیکھو! تم لوگوں کو بھوک نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا اور پھر تم اپنے گھروں کو واپس نہیں لوٹے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی۔اس کا بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہوگا۔ایسے موقع پر جب کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کر رہا ہو، اس کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ میں اللہ تعالیٰ کی جن نعمتوں کو استعمال کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ کے یہاں ان نعمتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا، یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم ہے۔)

ہر نعمت کا یہی حق ہے

دیکھو! شدت بھوک کی حالت میں یہ حضرات نکلے تھے، اس کے بعد یہ چیزیں میسر آئی تھیں، پھر بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو متوجہ کر رہے ہیں کہ یہ نعمتیں اگرچہ شدتِ بھوک میں میسر ہوئیں، پھر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں اور ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہو گا کہ تم نے ان نعمتوں کا کیا حق ادا کیا۔اس لئے جو آدمی اللہ تعالیٰ کی جو بھی

نعمتیں استعمال کررہا ہے، ان کو استعمال کرتے ہوئے ہرلمحہ اور ہر گھڑی اس کو یہ بات اپنے ذہن میں رکھنی چاہیے کہ میں اللہ تعالیٰ کی جن نعمتوں کو استعمال کررہا ہوں، کل کو اللہ تعالیٰ کے یہاں ان نعمتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ ہماری ان نعمتوں کا کیا حق ادا کیا؟ ہماری ان نعمتوں کو استعمال کرنے کے بعد تم نے ہماری کتنی اطاعت وفرمانبرداری کی ،اور ہماری نافرمانیوں سے اپنے آپ کو بچانے کا کتنا اہتمام کیا۔ تمام نعمتیں اسی لئے دی گئی ہیں کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کا اہتمام کرتے ہوئے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچانے کا بھی اہتمام کرے۔ گویا یہی ہر نعمت کا حق ہے۔

مثلاً ہم دنیا میں کسی کی روٹی کھاتے ہوں تو اگر چہ نہ اس نے ہمیں پیدا کیا، اور نہ دوسرے اعضاء دیئے، اور بہت ساری نعمتیں ہم اس کی استعمال بھی نہیں کرتے ، وہ تو صرف ہمیں کھلا پلا رہا ہے، اس کے باوجود ہم اس کا اتنا حق سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس کی بات مان لینی چاہیے؛ تو پھر اللہ تعالیٰ تو ان ساری نعمتوں کا پیدا کرنے اور دینے والا ہے اس کی اطاعت کا اور اس کی معصیت اور نافرمانی سے بچنے کا اہتمام ہمارے لیے کتنا ضروری ہے! اس کے حقوق کی ادائیگی کا تقاضہ یہی ہے۔

سابقین اوّلین کی زندگیوں کا حال

۴۹۸ - وَعَن خَالِد بن عُمَيْر العَدَوِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: خَطَبَنَا عُتْبَةُ بْنُ غَزوَانَ، وَكَانَ أَمِيْرًا عَلَى الْبَصَرَةِ، فَحَمِدَ اللهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: أَمَّا بَعدُ! فَإِنَّ الدُّنيَا قَدْ آذَنَتْ بِصُرْمٍ، وَوَلَّتْ حَذَّاءَ، وَلَمْ يَبْقَ مِنْهَا إِلَّا صُبَابَةٌ كَصُبَابَةِ الْإِنَاءِ يَتَصَابُّهَا صَاحِبُهَا، وإِنَّكُمْ مُنْتَقِلُونَ مِنْهَا إِلَى دَارٍ لَا زَوَالَ لَهَا فَانْتَقِلُوا بِخَيْرِ مَا بِحَضْرَتِكُمْ فَإِنَّهُ قَدْ ذُكِرَ لَنَا أَنَّ الْحَجَرَ يُلْقَى مِنْ شَفِيْرِ جَهَنَّمَ فَيَهْوِي فِيهَا سَبْعِيْنَ

عَاماً، لَا يُدْرِكُ لَهَا قَعْرًا، وَاللهِ لَتُمْلَأَنَّ أَفَعَجِبْتُمْ؟! وَلَقَدْ ذُكِرَ لَنَا أَنَّ مَا بَيْنَ مِصْرَاعَيْنِ مِنْ مَصَارِعِ الْجَنَّةِ مَسِيْرَةَ أَرْبَعِيْنَ عَاماً. وَلَيَأْتِيَنَّ عَلَيْهَا يَوْمٌ وَهُوَ كَظِيْظٌ مِنَ الزِّحَامِ، وَلَقَدْ رَأَيْتُنِي سَابِعَ سَبْعَةٍ مَعَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ، مَا لَنَا طَعَامٌ إِلاَّ وَرَقُ الشَّجَرِ، حَتّٰى قَرِحَتْ أَشْدَاقُنَا، فَالتَقَطْتُ بُرْدَةً فَشَقَقْتُهَا بَيْنِيْ وَبَيْنَ سَعْدِ بْنِ مَالِكٍ، فَاتَّزَرْتُ بِنِصْفِهَا، وَاتَّزَرَ سَعْدٌ بِنِصْفِهَا، فَمَا أَصْبَحَ الْيَوْمَ مِنَّا أَحَدٌ إِلاَّ أَصْبَحَ أَمِيْراً عَلٰى مِصْرٍ مِنَ الْأَمْصَارِ، وَإِنِّي أَعُوْذُ بِاللهِ أَنْ أَكُوْنَ فِيْ نَفْسِيْ عَظِيْمًا وَعِنْدَ اللهِ صَغِيْراً۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح: - حضرت خالد بن عمیر عدوی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ جو بصرہ کے امیر اور گورنر تھے انہوں نے ایک مرتبہ تقریر فرمائی جس میں پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد وثناء بیان کی، اس کے بعد فرمایا: دنیا نے ختم ہونے کا اعلان کیا ہے، اور بہت تیزی سے واپسی کے لیے اس نے پیٹھ پھیری ہے (یعنی وہ ختم ہو رہی ہے) اور اب دنیا کا اتنا ہی حصہ بچ گیا ہے جیسے کسی برتن میں کوئی کھانے پینے کی چیز رکھی ہو اور اس میں آخر میں کچھ بچا کھچا رہ جاتا ہے جس کو اس برتن کا مالک بڑی مشکل سے جمع کرتا ہے تا کہ اُس آخری حصہ سے بھی فائدہ اُٹھالیا جائے (دنیا جب سے بنی ہے اس وقت سے لے کر اس وقت ہمارے سامنے دنیا کا جو حصہ رہ گیا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی برتن میں کوئی پینے کی چیز ہو اور وہ پی جا چکی ہو اور آخر میں چند قطرے رہ جاتے ہیں جن کو برتن ٹیڑھا کر کے بڑی مشکل سے جمع کر کے آدمی فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے) اور تم اس دنیا سے ایک ایسے گھر کی طرف جانے والے ہو جو ختم ہونے والا نہیں ہے، اس لیے تمہارے سامنے جو چیزیں ہیں ان میں سے جو بہتر سے بہتر ہو اس کو حاصل کر کے جاؤ، اس لیے کہ ہمیں یہ بتلایا گیا (اور ظاہر ہے صحابہ کو بتلانے والے نبی کریم ﷺ ہی ہیں۔ گویا آپ ﷺ کی طرف سے یہ چیز ہمیں بتلائی گئی ہے)

کہ جہنم کی گہرائی اتنی زیادہ ہے کہ اگر کوئی پتھر جہنم کے اندر ڈالا جائے تو جہنم کی تہہ تک پہنچتے ہوئے ستر (۷۰) سال ہوں گے، بلکہ ستر (۷۰) سال تک وہ پتھر جہنم کے اندر جاتا رہے گا پھر بھی اس کی تہہ تک پہنچ نہیں سکے گا (اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جہنم کتنی گہری ہے) اور اللہ کی قسم! جہنم اتنی گہری ہونے کے باوجود انسانوں سے (ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے) بھر دی جائے گی۔ یہ ارشاد فرمانے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ لوگوں کو میری بات سن کر تعجب ہو رہا ہے، تو کہنے لگے کہ تمہیں تعجب ہوتا ہے؟ حالاں کہ یہی حقیقت ہے۔ اور ہمیں یہ بھی بتلایا گیا کہ جنت کے دروازوں کے دو کواڑوں کے درمیان کا فاصلہ چالیس سال کی مسافت کے برابر ہے (اتنے بڑے بڑے دروازے ہوں گے کہ چالیس سال تک آدمی چلتا رہے تو اس مسافت کو پورا کر سکتا ہے، ایسی جنت جس کے دروازوں کا یہ حال ہے) اس پر بھی ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ انسانوں کی بھیڑ سے بھری ہوئی ہوگی (جہنم بھی بھر دی جائے گی اور جنت بھی بھر دی جائے گی۔ اب جہنم کن لوگوں سے بھری جائے گی وہ بھی لوگ جانتے ہیں اور جنت میں کن کو بھیجا جائے گا وہ بھی سب کو معلوم ہے) پھر اپنے متعلق فرمایا کہ میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رفقاء میں میں ساتواں ہوں (یہ بہت قدیم الاسلام تھے، شروع میں اسلام لائے تھے) اور ہمارے لیے کھانے کے واسطے درختوں کے پتوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ درختوں کے پتے کھانے کی وجہ سے ہمارے منہ کے کنارے زخمی ہو گئے (کھانے کا تو یہ حال تھا۔ اور لباس کا کیا حال تھا اس کو بیان فرماتے ہیں کہ) مجھے ایک چادر کہیں سے ملی تو میں نے اس کے دو ٹکڑے کیے، آدھی کو میں نے اپنی لنگی بنالیا، اور آدھی کو حضرت سعد بن مالک -یعنی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں انہوں- نے اپنی لنگی بنالیا (گویا اوپر کے بدن کا حصہ ڈھانکنے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی) یہ تمام وہ حالات اور مجاہدے تھے جو ہم نے برداشت کیے۔ جنہوں نے یہ ساری مشقت برداشت کی تھی

ان میں سے آج ایک بھی ایسا نہیں مگر یہ کہ وہ کسی نہ کسی شہر کا گورنر ہے۔ (یعنی اُس وقت وہ حال تھا لیکن آج اللہ تعالیٰ نے یہ چیز بھی دی ہے۔ جب انہوں نے گورنری والی بات کی تو شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ کہیں اپنی بڑائی بیان کرنے کے لیے وہ یہ کہہ رہے ہیں، اس لیے فرمانے لگے کہ) میں اللہ تعالیٰ سے اس بات کی پناہ چاہتا ہوں کہ میں خود اپنی نگاہوں میں بڑا بنوں، اور اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں چھوٹا ہوؤں۔

افادات:- حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں۔ بصرہ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں آباد ہوا، اس کا نقشہ تیار کرنے کی ذمہ داری حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہی کے حوالہ کی تھی، ان کا مزار بھی بصرہ ہی میں ہے، ابھی قریبی زمانہ میں ہمارا وہاں جانا ہوا تھا تو بصرہ ہی میں جہاں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا مزار ہے، انہی کے قریب ان کا بھی مزار ہے۔ کچھ دنوں تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بصرہ کی امارت اور گورنری کی ذمہ داری بھی ان کے حوالے کی تھی۔

اس روایت کو لا کر یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ ان حضرات کی گزر بسر کیسی تھی اور وہ کس طرح زندگی گزارتے تھے۔ اس لیے کہ یہ حضرات جن کی فضیلت اور جن کی اسلام میں قدامت ان کے اونچے مقام کی دلیل ہے، ایسے اونچے مرتبہ والے حضرات گزر بسر کے اعتبار سے، معیشت کے اعتبار سے اس حالت میں تھے۔

بڑائی سے خدا کی پناہ

"وَإِنِّي أَعُوذُ بِاللّٰهِ أَنْ أَكُونَ فِي نَفْسِي عَظِيمًا" آدمی اپنی آپ کو بڑا سمجھے یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ اس کیفیت سے اور اپنے اندر اس قسم کا خیال پیدا ہونے سے میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں، صرف بیانِ واقعہ کے طور پر ایک چیز ذکر کی ہے، اور مَیں اللہ

تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں کہ اپنی نگاہوں میں بڑا ہوؤں اور اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں چھوٹا ہوؤں۔ یہ چیز پسندیدہ نہیں ہے۔ اسی لیے حدیثِ پاک میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ نے دُعا فرمائی: ''أَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْراً وَّفِيْ أَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْراً''۔ اے اللہ! مجھے اپنی نگاہوں میں چھوٹا بنا، اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بنا۔ یہاں لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بننے کی جو دُعا کی گئی ہے، وہ بھی بڑائی کے واسطے نہیں، بلکہ چھوٹا ہونے اور کم حیثیت ہونے کی وجہ سے لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں سے حفاظت کے واسطے یہ دعا مانگی گئی ہے، اس لیے کہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے۔

بہرحال! اس روایت میں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ ان حضرات کی کیا حالت تھی، یہ وہ حضرات تھے جن کا مقام اسلام کے اندر سب سے اونچا سمجھا جاتا ہے، ان حضرات کے کھانے پینے کا یہ حال تھا، گویا ہمیں بھی انہیں کی اتباع کرتے ہوئے اپنے کھانے پینے اور دوسری ضروریات کی تکمیل میں سادگی اور کم سے کم پر اکتفاء کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔

ایسے موقعہ پر آدمی خوش ہو

۴۹۹ - وعن أبي موسى الأشعري رضی اللہ عنہ قَالَ أخرجتْ لَنَا عَائِشَةُ رضی اللہ عنہا كِسَاءً وَإِزَارًا غَلِيظًا، قَالَتْ: قُبِضَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فِيْ هَذَيْنِ.

ترجمہ:- حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ہمارے سامنے ایک چادر اور ایک موٹی سی لنگی نکال کر بتائی، اور ارشاد فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کی وفات اسی لباس میں ہوئی ہے۔

افادات:- بوقتِ وفات نبی کریم ﷺ کے جسمِ اطہر پر ایک موٹے کپڑے کی لنگی اور ایک چادر تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ لباس میں کتنا زیادہ سادگی

اور کم سے کم پر اکتفاء کرنے کا اہتمام فرماتے تھے! حالاں کہ آخر میں تو فتوحات کا سلسلہ ہوا تھا اور بہت کچھ مال آتا تھا، اس کے باوجود اپنے لئے آپ ﷺ نے سادگی ہی کو پسند کیا، اور اسی لباس میں آپ ﷺ کی وفات ہوئی۔

ہم کو تو ہماری مرضی اور خواہش سے کم قسم کا کپڑا ملے، یا کھانے پینے میں اپنی خواہش سے کم چیز ملے تو اس پر ہم غمگین ہوجاتے ہیں کہ ہمیں ایسا کپڑا پہننا پڑا؟ ہمارا احساس یہ ہوتا ہے اور اس کو اپنے لیے بے عزتی سمجھتے ہیں، اپنی توہین اور انسلٹ سمجھتے ہیں، حالاں کہ بدرجۂ مجبوری ہی سہی اگر آدمی کو ایسی نوبت آئے تو یوں سوچے کہ نبی کریم ﷺ کے نمونہ پر چلنے کا ہمیں موقع ملا۔ ایسے موقعہ پر آدمی خوش ہو، نہ کہ ناراض ہو، لیکن ایسے موقعہ پر عام طور پر آدمی ناراض ہوتا ہے، اور ناراض ہی نہیں بلکہ نعوذ باللہ بہت سے لوگ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے بڑے خطرناک جملے استعمال کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی وہ ساری نعمتیں جواب تک استعمال کرتے رہے اس کا خیال بھی نہیں آتا اگر ایک موقعہ ایسا آیا تو ان کی زبان سے ناشکری کی باتیں نکلتی ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کھانے

۵۰۰- وعن سعد بن أَبِي وَقَّاصٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: إِنِّي لَأَوَّلُ الْعَرَبِ رَمَى بِسَهْمٍ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ، وَلَقَدْ كُنَّا نَغْزُوْ مَعَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ مَا لَنَا طَعَامٌ إِلاَّ وَرَقُ الْحُبْلَةِ، وَهٰذَا السَّمُرُ، حَتّٰى إِنْ كَانَ أَحَدُنَا لَيَضَعُ كَمَا تَضَعُ الشَّاةُ مَا لَهُ خَلْطٌ. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ (جو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، اور عشرۂ مبشرہ کا مقام تمام صحابہ میں سب سے اونچا ہے۔ فارس کو فتح کرنے والے اور کسریٰ کی سلطنت کو ختم کرنے والے اسلامی لشکر کے سپہ سالار یہی تھے) فرماتے ہیں کہ میں عرب

میں سب سے پہلا آدمی ہوں جس نے اللہ کے راستہ میں تیر چلایا۔ اور ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ غزوات کے اندر شریک ہوئے تھے اور ہمارے پاس کھانے کے لیے سوائے کیکر کے پتوں کے کچھ نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ درختوں کے پتے کھانے کی وجہ سے ہم میں کا ہر آدمی اس طرح پاخانہ کرتا تھا جیسے بکری کرتی ہے (بکری کا پاخانہ مینگنیوں کی شکل کا ہوتا ہے) جو نرم نہیں ہوتا۔

افادات:- ہجرت کے دوسرے سال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت اپنے چچازاد بھائی حضرت عبیدہ بن حارث یا ابوعبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں بھیجی تھی اور اس کا مقابلہ قریش کے ایک قافلہ سے ہوا جن کے تعاقب میں یہ حضرات گئے تھے، اس وقت معمولی سی جھڑپ ہوئی، اس جھڑپ میں سب سے پہلے تیر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے چلایا تھا۔ گویا اسلام میں اللہ کے راستہ میں سب سے پہلا تیر چلانے والے یہی ہیں۔ ان کے حق میں یہ ایک فضیلت وسعادت کی چیز ہے، اس لیے اُس کو ذکر کیا۔

اور اس روایت سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات کی زندگی کس طرح گزری تھی، اور کس طرح کی چیزیں ان کو کھانے کو میسر ہوتی تھی، ان حضرات نے ان چیزوں کے میسر نہ آنے کو کبھی بھی اپنے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں کمی اور قلت کا سبب نہیں سمجھا۔ ہمیں اگر کھانے کو کم ملا تو یوں کہتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ ناراض ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کسی اور سے اتنا زیادہ خوش نہیں تھے جتنا ان حضرات سے خوش تھے، پھر بھی ان کو کھانے پینے اور لباس کے لیے جو چیزیں ملی تھیں، وہ ہمیں ان روایتوں کے پڑھنے اور سننے سے معلوم ہوتا ہے۔

اپنے گھر والوں کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا

۵۰۱ - وعن أبي هريرة رضي الله عنه قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: أَللّٰهُمَّ اجْعَلْ

رِزْقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوْتاً. (متفق علیہ)

قَالَ أَهْلُ اللُّغَةِ وَالْغَرِيْبِ: مَعْنَى (قُوْتًا) أَيْ: مَا يَسُدُّ الرَّمَقَ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا فرمائی: اے اللہ! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گھرانے کی روزی بقدر ضرورت ہو۔

افادات:- "قُوْتٌ" یعنی اتنا جس سے جان بچ جائے، گویا اپنے خاندان اور اپنی ذریت کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی حال پسند کیا۔ اور ہم اپنی اولاد کے لیے کیا پسند کرتے ہیں اور ہم کیا دعائیں کرتے ہیں؟ ان کو خوب پیسے ملیں، خوب آرام سے رہیں، خوب مزے اُڑائیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اولاد کے لیے کیا دعا مانگی؟ ان کو بقدر ضرورت، جان بچ جائے اتنی روزی ملے۔ گویا یہی وہ حالت ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے گھرانے کے لیے پسند فرمایا۔ اور ظاہر ہے کہ جو حالت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے گھرانے کے لیے پسند فرمائی ہو، تو چونکہ ہر مسلمان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت اور تعلق ہوتا ہے، اس کا تقاضہ یہی ہے کہ اپنے لیے بھی اسی حالت کو پسند کرے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی بھوک کا حال

۵۰۲ - وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ وَاللهِ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، إِنْ كُنْتُ لَأَعْتَمِدُ بِكَبِدِي عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْجُوعِ، وَإِنْ كُنْتُ لَأَشُدُّ الْحَجَرَ عَلٰى بَطْنِي مِنَ الْجُوعِ، وَلَقَدْ قَعَدْتُ يَوماً عَلٰى طَرِيقِهِمُ الَّذِي يَخْرُجُونَ مِنْهُ فَمَرَّ بِي النَّبِي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَتَبَسَّمَ حِيْنَ رَآنِي، وَعَرَفَ مَا فِي وَجْهِي وَمَا فِيْ نَفْسِي، ثُمَّ قَالَ: أَبَا هِرٍّ! قُلْتُ: لَبَّيْكَ يَارَسُولَ اللهِ. قَالَ: اِلْحَقْ وَمَضٰى فَاتَّبَعْتُهُ، فَدَخَلَ فَاسْتَأْذَنَ، فَأَذِنَ لِي فَدَخَلْتُ، فَوَجَدَ لَبَناً فِي قَدَحٍ، فَقَالَ: مِنْ أَيْنَ هٰذَا اللَّبَنُ؟ قَالُوا: أَهْدَاهُ لَكَ فُلَانٌ أَوْ فُلَانَةٌ. قَالَ: أَبَا هِرٍّ.

قُلْتُ: لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللهِ. قَالَ: اِلْحَقْ إِلٰى أَهْلِ الصُّفَّةِ فَادْعُهُمْ لِيْ. قَالَ: وَأَهْلُ الصُّفَّةِ أَضْيَافُ الْإِسْلَامِ، لَا يَأْوُوْنَ عَلٰى أَهْلٍ وَلَا مَالٍ وَلَا عَلٰى أَحَدٍ، وَكَانَ إِذَا اَتَتْهُ صَدَقَةٌ بَعَثَ بِهَا إِلَيْهِمْ، وَلَمْ يَتَنَاوَلْ مِنْهَا شَيْئًا، وَإِذَا اَتَتْهُ هَدِيَّةٌ أَرْسَلَ إِلَيْهِمْ، وَأَصَابَ مِنْهَا، وَأَشْرَكَهُمْ فِيْهَا، فَسَاءَنِيْ ذٰلِكَ، فَقُلْتُ: وَمَا هٰذَا اللَّبَنُ فِيْ أَهْلِ الصُّفَّةِ! كُنْتُ اَحَقُّ أَنْ أُصِيْبَ مِنْ هٰذَا اللَّبَنِ شَرْبَةً أَتَقَوّٰى بِهَا، فَإِذَا جَاءُوْا وَأَمَرَنِيْ فَكُنْتُ أَنَا أُعْطِيْهِمْ؛ وَمَا عَسٰى أَنْ يَبْلُغَنِيْ مِنْ هٰذَا اللَّبَنِ، وَلَمْ يَكُنْ مِنْ طَاعَةِ اللهِ وَطَاعَةِ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بُدٌّ. فَأَتَيْتُهُمْ فَدَعَوْتُهُمْ، فَأَقْبَلُوْا وَاسْتَأْذَنُوْا، فَأَذِنَ لَهُمْ وَأَخَذُوْا مَجَالِسَهُمْ مِنَ الْبَيْتِ. قَالَ: يَا أَبَاهِرٍّ. قُلْتُ: لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ. قَالَ: خُذْ فَاعْطِهِمْ. قَالَ: فَأَخَذْتُ الْقَدَحَ، فَجَعَلْتُ أُعْطِيْهِ الرَّجُلَ فَيَشْرَبُ حَتّٰى يَرْوٰى، ثُمَّ يَرُدُّ عَلَيَّ الْقَدَحَ، فَأُعْطِيْهِ الرَّجُلَ فَيَشْرَبُ حَتّٰى يَرْوٰى، ثُمَّ يَرُدُّ عَلَيَّ الْقَدَحَ، فَأُعْطِيْهِ الرَّجُلَ فَيَشْرَبُ حَتّٰى يَرْوٰى، ثُمَّ يَرُدُّ عَلَيَّ الْقَدَحَ حَتّٰى انْتَهَيْتُ إِلَى النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَقَدْ رَوِيَ الْقَوْمُ كُلُّهُمْ، فَأَخَذَ الْقَدَحَ فَوَضَعَهُ عَلٰى يَدِهِ، فَنَظَرَ إِلَيَّ فَتَبَسَّمَ، فَقَالَ: أَبَاهِرٍّ. قُلْتُ: لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ، قَالَ: بَقِيْتُ أَنَا وَأَنْتَ. قُلْتُ: صَدَقْتَ يَا رَسُوْلَ اللهِ، قَالَ: اقْعُدْ فَاشْرَبْ، فَقَعَدْتُ فَشَرِبْتُ، فَقَالَ: اشْرَبْ، فَشَرِبْتُ، فَمَا زَالَ يَقُوْلُ: اشْرَبْ، حَتّٰى قُلْتُ لَا، وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا أَجِدُ لَهُ مَسْلَكًا! قَالَ: فَأَرِنِيْ، فَأَعْطَيْتُهُ الْقَدَحَ، فَحَمِدَ اللهَ تَعَالٰى، وَسَمّٰى وَشَرِبَ الْفَضْلَةَ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس اللہ کی قسم جس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں! میں بھوک کی وجہ سے اپنا کلیجہ زمین سے لگا دیا کرتا تھا اور کبھی بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھ لیتا تھا۔ ایک مرتبہ بھوک کی وجہ سے اس راستہ پر بیٹھ گیا جہاں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے صحابہ گزرا کرتے تھے کہ شاید میری ظاہر حالت دیکھ کر کسی کو ترس آئے اور مجھے کھانے

کے لیے کچھ ملے (بعض روایتوں میں ہے کہ حضور ﷺ سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ان سے کوئی آیت پوچھی کہ فلاں آیت کیا ہے؟ ان کا مقصد یہ تھا کہ میں پوچھوں گا اور بات کروں گا تو شاید اس دوران میری حالت کا ان کو کچھ اندازہ ہوگا اور محسوس کریں گے کہ شاید یہ بھوکے ہیں، اور مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے، لیکن میں نے جو آیت پوچھی تھی وہ بتا کر آگے چلے گئے) اس کے بعد پھر نبی کریم ﷺ آئے تو مجھے وہاں بیٹھا ہوا دیکھ کر اور میرے چہرے کو دیکھ کر ہی سمجھ گئے اور مسکرانے لگے (کہ بھوک کی حالت ہے اور میرے دل میں کیا تقاضہ ہے وہ بھی سمجھ گئے) چناں چہ نبی کریم ﷺ نے کہا: "یَاأَبَاهِرٍّ" (ابو ہریرہ کے نام کو مختصر کر کے بولا جاتا ہے) میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: آجاؤ۔ یہ کہہ کر آپ تو تیزی سے آگے بڑھ گئے اور میں آپ ﷺ کے پیچھے لپکا، آپ گھر میں داخل ہو گئے، میں نے اندر داخل ہونے کی اجازت چاہی، تو مجھے بھی داخل ہونے کی اجازت دے دی، میں بھی گھر میں داخل ہوا۔ جب آپ ﷺ گھر میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک پیالے میں دودھ ہے (بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ جن زوجۂ مطہرہ کے یہاں آپ تشریف لے گئے تھے، ان سے پوچھا کہ کوئی چیز ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! فلاں انصاری صحابی نے ہدیہ کے طور پر ایک پیالہ دودھ کا بھیجا ہے) تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے ابو ہریرہ! میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! حاضر ہوں۔ آپ نے فرمایا: جاؤ! صفہ والوں کو بلا کر لاؤ۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: صفہ والے درحقیقت مسلمانوں کے مہمان تھے، ان کے پاس نہ اپنا کوئی گھر تھا، نہ کوئی کھانے پینے کا انتظام تھا (مسجد میں پڑے رہتے تھے، علم حاصل کرنے کا مشغلہ تھا اور ان کے کھانے پینے کی ذمہ داری مسلمانوں کی تھی، جس کو جو میسر آتا تھا اُن کی تواضع کر دیا کرتا تھا) اور حضور اکرم ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ اگر آپ کے گھر کوئی چیز آتی اور بھیجنے والا کہلواتا کہ یہ صدقہ کی ہے تو

نبی کریم ﷺ اس میں سے کچھ بھی تناول نہیں فرماتے تھے بلکہ وہ پورا کے پورا صفہ والوں کے لیے بھیج دیتے تھے۔ اور اگر کوئی ہدیہ آتا تھا تو حضور ﷺ ان صفہ والوں کو اپنے گھر بلوا لیتے تھے اور اس کھانے پینے کی چیز میں ان کو بھی شریک فرما لیتے تھے، آپ ﷺ خود بھی نوش فرماتے تھے اور ان کو بھی کھلاتے تھے (اب یہ دودھ جو آیا ہوا تھا اس کے متعلق گھر والوں نے بتلایا کہ ہدیہ میں آیا ہے، تو اپنی عادتِ شریفہ کے مطابق حضور ﷺ نے کہا: اے ابوہریرہ! جاؤ؛ صفہ والوں کو بلا لاؤ۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں تو دیکھ چکا تھا کہ کیا چیز ہے، اور کس لیے بلوایا جا رہا ہے، صرف ایک پیالہ دودھ تھا، اس لئے جب مجھے ان کو بلانے کے لیے فرمایا تو) میں اپنے جی میں سوچنے لگا کہ صفہ والوں کی تعداد کے مدِنظر اس دودھ کی کیا حیثیت ہے؟ (وہ تو کئی آدمی ہیں اور دودھ کا تو صرف ایک ہی پیالہ ہے) میں ہی زیادہ حق دار تھا کہ اس دودھ کو پیوں اور اس کے ذریعہ سے قوت حاصل کروں (جب حضور ﷺ نے محسوس فرما ہی لیا کہ میں بھوکا ہوں تو صفہ والوں کو بلوانے کی کیا ضرورت تھی، مجھے ہی پلا دیتے۔ اور اس لیے بھی یہ سوچنے لگا کہ) جب میں ان کو بلا کر لاؤں گا اور وہ آئیں گے تو (چوں کہ مجھے ہی یہ خدمت حوالہ کی گئی ہے تو) مجھ سے ہی فرمائیں گے کہ ان کو پلاؤ۔ اور مجھے امید نہیں ہے کہ میرے حصے میں اس میں سے کچھ بھی آئے (اس لیے کہ ظاہر ہے جس کو پلانے کی خدمت دی جائے، خود اس کا نمبر آخر میں ہوا کرتا ہے، اس لیے مجھے جی میں بہت بُرا معلوم ہوا) لیکن میں کیا کرتا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک ﷺ کی اطاعت کے بغیر چارۂ کار بھی تو نہیں تھا۔ یہ سب سوچتے ہوئے میں گیا اور ان کو بلا لیا، چناں چہ وہ لوگ آئے اور نبی کریم ﷺ سے گھر میں داخلے کی اجازت طلب کی۔ تو نبی کریم ﷺ نے ان کو اجازت دے دی۔ جب وہ لوگ داخل ہو کر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے ابوہریرہ۔ میں نے کہا: لبیک یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں۔ آپ نے کہا: یہ پیالہ لو اور ان کو دو (انھوں نے جو سوچا تھا وہی ہوا۔ اب یہاں

پر بھی آپ ﷺ کی بات پر عمل کئے بغیر چارۂ کار نہیں تھا) میں نے پیالہ لیا اور صفہ والوں میں سے ایک کے ہاتھ میں پیالہ تھما دیا، اس نے اس پیالہ میں سے پیا یہاں تک کہ بالکل شکم سیر اور سیراب ہوگیا، جب پیٹ بھر کر پی لیا، تو اس نے وہ پیالہ مجھے واپس کیا، میں نے دوسرے کو دیا، اس نے پیا، یہاں تک کہ وہ شکم سیر ہوگیا۔ یہاں تک کہ جب سب پی چکے، اور حضور ﷺ سب سے آخر میں تشریف فرما تھے، وہاں تک میں پہنچ گیا (تمام صفہ والے پیٹ بھر کر فارغ ہو چکے تھے) تو میں نے آپ ﷺ کے دستِ مبارک میں وہ پیالہ دے دیا۔ نبی کریم ﷺ نے میرے ہاتھ میں سے وہ پیالہ لیا اور اپنے ہاتھ پر رکھا اور مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے (میرے دل کی بات حضور سمجھ گئے تھے) اور (مسکرا کر) فرمایا: اے ابو ہریرہ۔ میں نے کہا: لبیک یا رسول اللہ۔ فرمایا: اب تو میں اور تم دو ہی رہ گئے ہیں۔ میں نے کہا: جی ہاں اے اللہ کے رسول! آپ نے سچ فرمایا۔ پھر آپ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ اور اب تم پیو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں بیٹھا اور میں نے پیا، جب میں پی چکا اور واپس کرنے لگا تو حضور ﷺ نے فرمایا اور پیو۔ حضور ﷺ بار بار فرماتے رہے: اور پیو، اور پیو، اور پیو؛ یہاں تک کہ حضور ﷺ اتنا اصرار کرتے رہے کہ آخر میں مجبور ہو کر میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اب تو اندر جانے کا راستہ ہی نہیں ہے۔ جب میں نے یہ کہا تو حضور ﷺ نے فرمایا: ذرا مجھے بھی یہ پیالہ دکھاؤ کہ اندر کتنا دودھ رہ گیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے وہ پیالہ نبی کریم ﷺ کو دیا تو حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی (کہ اس نے سب کی ضرورتیں پوری فرمائیں) اور بسم اللہ کہہ کر بچا ہوا دودھ خود نوش فرمایا۔

افادات:- بھوک کی وجہ سے کلیجہ میں درد کی کیفیت محسوس ہوتی ہے، تو ایسے موقعہ پر آدمی کلیجہ دباتا ہے۔ تو سکون حاصل کرنے کے لیے کلیجہ جس طرف ہوتا ہے بدن کے اس حصہ کو زمین کے ساتھ لگا کر پڑا رہتا تھا۔ اور کبھی بھوک کی وجہ سے پیٹ پر

پتھر باندھ لیتا ہے۔ میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ بھوک کی وجہ سے پیٹ اندر کی طرف جاتا ہے، کمر جھک جاتی ہے، اور کام کرنے اور چلنے میں مشقت لاحق ہوتی ہے، تو اس خلاء کو پُر کرنے کے لیے اوپر سے پتھر رکھ کر باندھا جاتا تھا تاکہ اس کی وجہ سے سہارا ہو اور چلنے پھرنے میں آسانی رہے، قوت وطاقت رہے۔

روایت سے مستنبط کچھ آداب

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی کو بلایا گیا ہو، وہ بھی جب پہنچے، تو اندر آنے کے لیے اس کو اجازت لینی چاہیے، صرف بلا لینا ہی کافی نہیں ہے۔ اگرچہ اس میں تفصیل ہے، بعض حضرات فرماتے ہیں کہ بلانے والا اگر اپنے مکان میں ایسی جگہ بیٹھا ہوا ہے جہاں پردہ کی ضرورت ہے تو اجازت لینی چاہیے۔ اور اگر بلانے والا ایسی جگہ بیٹھا ہے جہاں پردہ نہیں ہے تو اس کا بلا لینا ہی کافی ہے، ازسرِنو اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

اور اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس کے ہاتھ میں پہلے پیالہ ہوتا تھا وہ فارغ ہونے کے بعد دوسرے کو نہیں دیتا تھا بلکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ہی میں دیتا تھا۔ اور ادب یہی ہے کہ جب کوئی آدمی کسی برتن میں ہمیں کھانے پینے کی کوئی چیز دے تو اس چیز کو کھا کر جب ہم اپنی ضرورت سے فارغ ہو جائیں اور اس میں کچھ بچا ہوا ہو تو وہ کسی دوسرے کو نہیں دینا چاہیے، بلکہ جس نے ہمیں دیا ہے اسی کو واپس کرنا چاہیے۔ الَّا یہ کہ اس نے ہدایت کی ہو کہ آپ فلاں کو دیدینا تو الگ بات ہے۔ ورنہ ہمارا فریضہ یہی ہے کہ ہم اسی کو واپس دیں۔

اور یہ اس وقت ہے جب کسی دوسرے کے گھر میں ہو۔ آپ اگر اپنے گھر میں

ہوں اور اپنی چیز ہو اور آپ نے اپنے گھر والوں یا اپنے بیٹے سے منگوائی ہو، تو آپ مالک ہیں جس کو دینا چاہیں دے سکتے ہیں۔ کسی دوسرے کے گھر میں ہوں تو وہ ہماری ملکیت نہیں ہے۔

ہمارے حضرت مفتی صاحبؒ کو دیکھا کہ مجلس میں کبھی پینے کے لئے مولانا ابراہیم صاحب پانڈور مدظلہ یا اور کوئی، ٹھنڈا مشروب یا کوئی اور چیز لے کر آتا تو آپ فارغ ہو کر اسی کو واپس دیتے جو لے کر آیا ہوتا، لوگ بہت چاہتے تھے کہ ہمیں ملے، لیکن کسی دوسرے کو نہیں دیتے تھے۔

بہر حال! اس روایت کو لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ان حضرات کی زندگی کس طرح گذرتی تھی اور اس بات کی ترغیب دینا چاہتے ہیں کہ آدمی کو اپنی ضروریات پورا کرنے کے معاملہ میں ایسا ہی انداز اختیار کرنا چاہیے۔

فَضْلُ الْجُوْعِ

وَخُشُوْنَةِ الْعَيْشِ

بھوک وفاقہ برداشت کرنے

اور

سادہ زندگی بسر کرنے کی فضیلت

﴿مجلس ۳﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے باب چل رہا تھا بھوک برداشت کرنے کی فضیلت اور سادہ زندگی گذارنے، کھانے پینے میں کم سے کم پر اکتفاء کرنے کا، اور آدمی اگر اپنی نفسانی خواہشات کو چھوڑ دے تو اس پر کیا مقام ملے گا۔ اس سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی مبارک زندگیوں کے نمونے پیش کر رہے ہیں۔

بھوک کی وجہ سے بے ہوشی

۵۰۳- وعن محمد بن سیرین عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ قَالَ: لَقَدۡ رَأَيۡتُنِي وَإِنِّي لَأَخِرُّ فِيمَا بَيۡنَ مِنۡبَرِ رَسُوۡلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم إِلىٰ حُجۡرَةِ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا مَغۡشِياً عَلَيَّ، فَيَجِيئُ الۡجَائِيۡ، فَيَضَعُ رِجۡلَهُ عَلىٰ عُنُقِيۡ، وَيَرَى أَنِّي مَجۡنُوۡنٌ وَمَا بِيۡ مِنۡ جُنُوۡن، مَا بِيۡ إِلاَّ الۡجُوۡعُ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر شریف اور حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے درمیان- جس کو ریاض الجنۃ کہتے ہیں- زمین کے اوپر بیہوش ہو کر گر جاتا تھا۔ آنے والے آتے اور میری گردن پر یہ سمجھ کر پاؤں رکھتے کہ مجھے جنون طاری ہے، حالاں کہ وہ جنون نہیں ہوتا تھا، بلکہ بھوک کی وجہ سے بے ہوش ہو کر میں گر جایا کرتا تھا۔

افادات:- (۱) اس زمانہ میں جنون کی ایک قسم ہوا کرتی تھی جس میں اگر آدمی بیہوش ہو جاتا تو اس کا علاج گردن کی ایک رگ دبانے سے کیا جاتا تھا، جس سے جنون میں افاقہ ہوتا تھا اور بیہوشی ختم ہو جاتی تھی۔

(۲) اور ظاہر ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ہی ان حضرات کو دینے کے لیے کچھ ہوتا تو آپ ضرور عنایت فرما دیتے اور ان کو فاقوں کی نوبت نہ آتی، لیکن جیسا کہ پہلے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھرانے کا حال بھی کیا تھا۔

بنیادی ضرورتوں کے لیے زرہ گروی رکھی

۵۰۴- وعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَدِرْعُهُ مَرْهُوْنَةٌ عِنْدَ يَهُوْدِيٍّ فِي ثَلَاثِيْنَ صَاعاً مِنْ شَعِيْرٍ. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ایسی حالت میں ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک یہودی کے پاس سے تیس صاع جَو خریدے تھے اور اس کی قیمت کے بدلہ میں اعتماد اور بھروسہ کے طور پر اپنی زرہ گروی رکھی تھی (اور وہ زرہ چھڑائی نہیں گئی، اسی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی۔)

افادات:- ظاہر ہے کہ آدمی کے پاس جب اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اتنی رقم نہ ہو، تب ہی گروی رکھنے کی نوبت پیش آتی ہے۔ اس روایت کو پیش کر کے بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اتنا مال بھی موجود نہیں تھا کہ اپنے گھر والوں کے نفقہ کو ادا کرنے اور ان کے کھانے پینے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جس سے سامان لیا کرتے تھے، اس کی قیمت بھی نقد ادا کر سکیں، اسی لیے زرہ کو گروی رکھنے کی ضرورت پیش آئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھرانے کا دن ایسی حالت میں گزرتا......

۵۰۵- وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: رَهَنَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دِرْعَهُ بِشَعِيْرٍ، وَمَشَيْتُ إِلَى النَّبِي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بِخُبْزِ شَعِيْرٍ وَإِهَالَةٍ سَنِخَةٍ، وَلَقَدْ سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ: (مَا أَصْبَحَ لِآلِ مُحَمَّدٍ صَاعٌ وَلَا أَمْسَى) وَإِنَّهُمْ لَتِسْعَةُ أَبْيَاتٍ۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جَو کے بدلے میں اپنی زرہ گروی رکھی تھی (حضرت عائشہؓ کی روایت اوپر آئی اس میں بھی یہی تھا) اور ایک

مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جَو کی روٹی اور ایسی چربی لے کر حاضر ہوا جس کا مزہ طویل زمانہ تک پڑے رہنے کی وجہ سے بدل گیا تھا۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سنا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گھرانے والوں کے پاس نہ صبح کے وقت کوئی چیز ایک صاع کے برابر ہوتی تھی اور نہ شام کے وقت ہوتی تھی۔ (یعنی ایسی حالت میں دن گزرتا کہ اتنی مقدار بھی اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے ان کے پاس نہیں ہوتی تھی) حالاں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نو (۹) گھرانے تھے۔ (نو (۹) ازواجِ مطہرات تھیں، کسی کے گھر میں ضرورت کے لئے کوئی چیز موجود نہیں ہوا کرتی تھی)

افادات:- "اِهَالَةٌ" اس چربی کو کہتے ہیں جس کو پگھلا کر ضرورت کے وقت استعمال کرنے کے لئے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ جب جانور کو ذبح کیا جاتا تھا، اس سے جو چربی نکلتی تھی اس کو وہ حضرات پگھلا کر رکھ لیا کرتے تھے۔ اور "سَنِخَةٌ" کھانے کی ایسی چیز کو کہتے ہیں کہ دیر تک پڑے رہنے کی وجہ سے جس کا ذائقہ بدل جائے۔ یہاں "اِهَالَةٌ سَنِخَةٌ" کہا گیا یعنی ایسی پگھلائی ہوئی چربی جس کا مزہ بدلا ہوا ہو۔

اب ظاہر ہے کہ اگر اس سے اچھا کوئی کھانا پاس ہوتا یا خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کوئی چیز میسر ہوتی تو یہ حضرات ایسی چیز لے کر کیوں حاضر ہوتے۔ معلوم ہوا کہ نہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کچھ تھا، اور نہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس کوئی عمدہ چیز ہوتی تھی۔

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی سادگی کا ایک اور نمونہ

۵۰۶- وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ: لَقَدْ رَأَيْتُ سَبْعِيْنَ مِنْ أَهْلِ الصُّفَّةِ، مَا مِنْهُمْ رَجُلٌ عَلَيْهِ رِدَآءٌ، إِمَّا إِزَارٌ وَإِمَّا كِسَآءٌ، قَدْ رَبَطُوْا فِيْ أَعْنَاقِهِمْ مِنْهَا مَا يَبْلُغُ نِصْفَ السَّاقَيْنِ، وَمِنْهَا مَا يَبْلُغُ الْكَعْبَيْنِ فَيَجْمَعُهُ بِيَدِهٖ كَرَاهِيَةَ أَنْ تُرَى عَوْرَتُهٗ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ستّر (۷۰) اہلِ صفہ ایسے دیکھے کہ ان میں سے (کسی کے بدن پر پورا جوڑا نہیں ہوتا تھا۔ اور اس زمانہ میں دو چادریں جوڑے کے طور پر استعمال کی جاتی تھیں، ایک لنگی کے طور پر اور دوسری بدن کے اوپر کے حصہ کو ڈھانکنے کے لئے۔) کسی کے پاس صرف لنگی ہوتی تھی، یا صرف ایک بڑی چادر ہوتی تھی جس کو اپنی گردن میں باندھ لیتے تھے۔ کسی کی چادر اتنی ہوتی تھی کہ آدھی پنڈلی تک پہنچتی تھی، کسی کی ٹخنوں تک آتی تھی۔ اور چوں کہ ایک ہی چادر ہوتی تھی تو کھلنے سے بچانے کے لیے وہ اس کو اپنے ہاتھ سے پکڑے رہتے تھے۔ (بدن چھپانے کے لیے پورا لباس بھی ان میں سے کسی کے پاس نہیں ہوتا تھا۔ اس سے ان حضرات کی سادہ زندگی کا پتہ چلتا ہے۔)

افادات:- پہلے بھی آچکا ہے کہ اہلِ صفہ وہ حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تھے جنہوں نے اپنے آپ کو علم دین سیکھنے کے لئے فارغ کر رکھا تھا، نہ ان کا کوئی گھر اور مکان تھا، نہ گھر والے، بیوی بچے تھے۔ مسجد نبوی میں ایک چبوترہ تھا وہیں وہ حضرات چوبیس گھنٹے پڑے رہتے تھے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کھانے کی کوئی چیز آتی تو آپ ان کو عنایت فرما دیتے تھے، اسی سے ان کی ضرورت پوری ہو جاتی تھی، ورنہ بھوکے رہتے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بستر

۵۰۷- وعن عائشة رضی اللہ عنہا قَالَتْ كَانَ فِرَاشُ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مِنْ أَدَمٍ حَشْوُهُ لِيْفٌ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بستر چمڑے کا تھا اس کے اندر کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔

افادات:- چھال یعنی کھجور کے درخت میں جالی دار ایک چیز لٹکی ہوئی

ہوتی ہے جیسے ناریل کے درخت میں بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایسی چیز لٹکا کرتی ہے۔ درخت کے تنے پر جو چھال ہوتی ہے وہ مراد نہیں ہے، اس لئے کہ وہ اس کام کی نہیں ہوتی کہ اس کو بھرا جائے، بلکہ مراد وہ لٹکی ہوئی چیز ہے جو کچھ نرم بھی ہوتی ہے اور وہ حضرات اس کو تکیہ اور بستر میں بھرنے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے، جیسے آج کل روئی استعمال کی جاتی ہے۔

بایں ہمہ ہیچ افسوس ندارد

۵۰۸ - وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: كُنَّا جُلُوساً مَعَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ إِذْ جَاءَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ، فَسَلَّمَ عَلَيْهِ، ثُمَّ أَدْبَرَ الْأَنْصَارِيُّ، فَقَالَ رَسُولُ الله ﷺ يَا أَخَا الْأَنصَارِ! كَيْفَ أَخِي سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ؟ فَقَالَ: صَالِحٌ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: مَن يَعُوْدُهُ مِنْكُم؟ فَقَامَ وَ قُمْنَا مَعَهُ، وَنَحْنُ بِضْعَةَ عَشَرَ، مَا عَلَيْنَا نِعَالٌ، وَلَا خِفَافٌ، وَلَا قَلَانِسُ، وَلَا قُمُصٌ، نَمْشِي فِي تِلْكَ السِّبَاخِ، حَتّٰى جِئْنَاهُ، فَاسْتَأْخَرَ قَوْمُهُ مِنْ حَوْلِهِ حَتّٰى دَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَأَصْحَابُهُ الَّذِيْنَ مَعَهُ. (رَوَاهُ مُسْلِم)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ایک انصاری صحابی آئے، اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کو سلام کیا، اس کے بعد جب وہ جانے لگے تو نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا: اے انصاری بھائی! ہمارے بھائی سعد بن عبادہ کا کیا حال ہے؟ (وہ بیمار چل رہے تھے) انہوں نے کہا: اب ٹھیک ہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے اہلِ مجلس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میں سے کون ان کی عیادت کے لیے آتا ہے؟ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ کے اس ارشاد پر اس مجلس میں جتنے بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے، سب ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے (ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ

ساتھ چلنے کی دعوت دیں تو صحابہ میں سے کون انکار کرسکتا تھا) ہم دس سے کچھ زیادہ لوگ تھے (تیرہ (۱۳) سے انیس (۱۹) تک کے عدد کے لیے لفظ "بضعةَ عشر" بولا جاتا ہے) اور ہمارا حال یہ تھا کہ نہ ہمارے پاس جوتے تھے، نہ موزے تھے، نہ ٹوپیاں تھیں، نہ کُرتے تھے (سب کا حال ایسا تھا) ہم ایسی نمکین زمین میں چل رہے تھے جس میں سبزہ نہیں تھا یہاں تک کہ جب ہم حضرت سعد بن عبادہؓ کے یہاں پہنچے تو اس وقت ان کے قبیلے کے لوگ ان کو گھیر کر بیٹھے ہوئے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہمیں آتا ہوا دیکھ کر وہ لوگ کھڑے ہو گئے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے ساتھی ان کے قریب بیٹھ گئے۔

افادات:- اس روایت کو لا کر یہ بتلانا ہے کہ یہ حضرات اس حال میں زندگی گزار رہے ہیں کہ نہ ان کے پاس جوتا ہے، نہ موزہ ہے، نہ کُرتہ ہے اور نہ ٹوپی ہے، اور اس پر بھی ان کو کوئی غم یا افسوس نہیں ہے۔ اور ہم لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر ہمارے پاس جوتا نہ ہو تو ہم بہت افسوس کرتے ہیں۔ لیکن اگر نماز کی جماعت فوت ہو جائے، نماز چھوٹ جائے، شریعت کے حکم کے معاملہ میں ہم سے کوتاہی ہو رہی ہے، تو کبھی ہمیں افسوس اور غم نہیں ہوتا ہے، اور کبھی ہمارا جی نہیں دُکھتا اور اس پر کبھی رونا نہیں آتا۔ اور اگر کبھی ایک وقت کھانا نہ ملا ہو، یا ہماری مرضی کے مطابق لباس نہ ہو، تو ہم شکوے شکایت کرتے اور رونے لگتے ہیں۔ ان حضرات کی زندگی کا اگر ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ان سارے حالات کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری سیرت میں اور صحابۂ کرامؓ کے حالات میں کہیں یہ نہیں ملے گا کہ کسی کی زبان سے کوئی ایسا جملہ نکلا ہو کہ نعوذ باللہ کیا اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہے، اور ہمیں اپنی مرضی کے مطابق کوئی چیز نہ ملے تو یہ جملہ ہماری زبان پر آتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہے۔ گویا اس کو ناراضگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

ایسے لوگ آئیں گے

۵۰۹- وعن عمران بن الحُصَیْنِ رضی اللہ عنہما عن النبی ﷺ اَنَّہٗ قَالَ: خَیْرُکُمْ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ .قَالَ عِمْرَانُ : فَمَا اَدْرِیْ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ مَرَّتَینِ أَوْثَلاَثاً . ثُمَّ یَکُوْنُ بَعْدَھُمْ قَوْمٌ یَشْھَدُوْنَ وَلاَ یُسْتَشْھَدُوْنَ، وَیَخُوْنُونَ وَلَا یُؤْتَمَنُونَ، وَیَنذِرُوْنَ وَلَا یُوفُوْنَ، وَیَظْھَرُ فِیْھِمُ السَّمَنُ.

ترجمہ:-حضرت عمران بن حصینؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، اس کے بعد وہ لوگ جو میرے بعد ہوں گے، پھر وہ لوگ جو ان کے بعد ہوں گے(حضرت عمرانؓ فرماتے ہیں: مجھے یاد نہیں رہا کہ نبی کریم ﷺ نے ”ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ “دومرتبہ ارشاد فرمایا، یا تین مرتبہ۔) پھر ان کے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو گواہی دینے کے لیے آگے بڑھیں گے، حالانکہ ان کو گواہی کے لیے بلایا نہیں جائے گا۔ اور جب ان کے پاس کوئی امانت رکھی جائے گی تو وہ خیانت کریں گے۔ اور وہ لوگ نذریں اور منتیں مانیں گے لیکن اس کو پوری نہیں کریں گے۔ اور ان میں موٹاپا نمایاں ہوگا۔

افادات:-آج کل ہمارے سماج میں یہ مزاج بنا ہوا ہے کہ کوئی موقع آتا ہے تو نذر مان لی جاتی ہے، مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں کام ہوجائے گا تو میں یوں کروں گا، لیکن جب وہ کام ہوجاتا ہے تو یاد بھی نہیں رہتا کہ میں نے نذر مانی ہے جس پورا کرنا ضروری ہے۔

یہاں تو اس روایت کو اسی لئے لائے ہیں کہ وہ لوگ کھانے پینے کے ایسے عادی ہوں گے کہ ان کے جسم موٹے ہوں گے۔ گویا کھانے پینے کی اتنی کثرت جو آدمی کے جسم کو موٹا بنانے کا ذریعہ بنے، اس کو نبی کریم ﷺ نے برائی کے طور پر شمار کروایا، اور نبی کریم ﷺ کے بعد جو برا زمانہ آنے والا ہے اس کی علامت کے طور پر ذکر کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ چیز پسندیدہ نہیں ہے۔آج کل اس کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اور لوگ یہ جملہ بولتے رہتے ہیں کہ خوب کھاؤ اور جان بناؤ۔حالاں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو ناپسند فرمایا ہے۔لہٰذا اگر آدمی کو سب کچھ میسر ہو تب بھی بقدرِ ضرورت پر اکتفاء کرنا چاہیے، آدمی کھانے پینے میں اتنا آگے نہ بڑھے کہ اس کے موٹاپے کا ذریعہ بنے۔

خرچ کرنے کی ترتیب

۵۱۰-وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: يَا ابْنَ آدَمَ، إِنَّكَ أَن تَبْذُلَ الفَضْلَ خَيْرٌ لَكَ، وَإِنْ تُمْسِكْهُ شَرٌّ لَكَ، وَلَا تُلَامُ عَلٰى كَفَافٍ، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِي، وَقَالَ: حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ)

ترجمہ:-حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے آدم کی اولاد! اگر تو اپنا زیادہ مال خرچ کردے تو یہ تیرے لئے بہت اچھا ہے، اور اگر رو کے رکھے تو برا ہے۔اور بقدرِ ضرورت (دنیوی ضرورتوں میں) جو کچھ خرچ کرے اس میں (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) کوئی ملامت نہیں ہے۔اور خرچ کرنے کے معاملہ میں جن کی تم پر ذمہ داری ہے ان سے شروعات کرو۔

افادات:-"فضل" یعنی اپنی دنیوی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد جو مال بچ جائے، اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کو جمع کر کے نہ رکھو، بلکہ اس کو نیکی کے کاموں میں خرچ کردو؛ یہی بہتر ہے۔اگر اس کو رہنے دوگے تو یہ تمہارے لئے برا ہے، اس لیے کہ تمہاری ضرورتیں تو پوری ہورہی ہیں، اب جو زائد بچ رہا ہے یہ تمہاری ضرورتوں میں استعمال نہیں ہورہا ہے، اگر آپ اس کو نیکی کے کاموں میں خرچ نہیں کروگے تو چھوڑ کر جاؤگے، آپ کے تو کسی کام آنے والا نہیں ہے، لیکن اگر نیکی کے

کاموں میں خرچ کردوگے تو وہ سب اللہ تعالیٰ کے یہاں جمع ہوجائے گا۔اس لیے ظاہر ہے کہ چھوڑ کر جانے کے مقابلہ میں خرچ کرنا ہی اچھا ہے۔

اور یہ بھی فرمایا: خرچ کرنے کے معاملہ میں جن کی تم پر ذمہ داری ہے ان سے شروعات کرو۔ مطلب یہ ہے کہ بال بچے، والدین، اور دوسرے ایسے رشتہ دار جن کا نفقہ اور خرچہ واجب ہے، یا جن پر خرچ کرنے کی فضیلت آئی ہے؛ آدمی کو ایسے لوگوں سے شروعات کرنی چاہیے، اور پھر دوسرے لوگوں کو دینا چاہیے۔ گویا خرچ کرنے کا بھی ایک خاص انداز بتایا گیا ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ جب آپ خرچ کرنے کا سلسلہ شروع کریں تو دوسروں کو تو خوب دے رہے ہیں اور جن کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے، یا جن کا نفقہ آپ پر واجب ہے، ایسوں کو تو پوچھتے ہی نہیں۔

جس کو تین چیزیں ملیں

۵۱۱ - وعن عُبَيْدِاللهِ بْنِ مِحْصَنٍ الأَنْصَارِي الْخَطْمِيِّ رضي الله عنه قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم: مَنْ أَصْبَحَ مِنْكُمْ آمِناً فِي سِرْبِهِ، مُعَافًى فِي جَسَدِهِ، عِنْدَهُ قُوتُ يَوْمِهِ، فَكَأَنَّمَا حِيزَتْ لَهُ الدُّنيا بِحَذَافِيرِهَا. (رَوَاه الترمذي، وقال: حديث حسن)

(سِرْبُهُ) بكسر السين المهملة: أي نَفْسُهُ، وقِيْلَ قَومُه

ترجمہ:- حضرت عبید اللہ بن مِحْصَنْ انصاریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے جو آدمی ایسی حالت میں صبح کرے کہ وہ اپنی قیام گاہ میں بالکل امن سے ہے (یعنی اس کو کوئی خوف اور خطرہ نہیں ہے، اس کی جان مال سب محفوظ ہے) اور اس کے جسم میں عافیت ہے (کسی قسم کی بیماری میں مبتلا نہیں ہے) اور ایک دن کے کھانے پینے کا اس کے پاس انتظام ہے؛ تو گویا اس کے لیے ساری دنیا اکٹھی کر کے دے دی گئی ہے۔

افادات:- یعنی دنیا کی ساری ضرورتیں اس کو حاصل ہیں، اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اگر وہ کسی پاس ہے بھی تو وہ سب زائد ہے۔

میری ضرورت کا مجھ تک پہنچ جاتا ہے

ہمارے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کا جملہ صوفی اقبال صاحب مہاجر مدنیؒ نے ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ مجھے تجارت کا شوق ہوا، حضرت کے سامنے تذکرہ کیا تو حضرت نے فرمایا: دیکھو! سہارنپور میں جتنے کارخانے اور دکانیں ہیں، میں یوں سمجھتا ہوں کہ یہ سب میری ہیں، اور ان پر جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور چلا رہے ہیں وہ سب میرے کارندے ہیں، حساب و کتاب کی ذمہ داری انہوں نے اپنے سر لے رکھی ہے، اور میری ضرورت کا مجھ تک پہنچ جاتا ہے، باقی سب اپنے کام کاج کی وجہ سے وہ لوگ لے لیتے ہیں۔

غور طلب حقیقت

حقیقت یہی ہے کہ کسی کے پاس اگر کروڑوں کی جائیداد بھی ہو، تو اس میں سے چوبیس گھنٹے کے ایک دن میں خود اس کے کام کا کیا ہے؟ صرف وہی ہے جو اس دن اس کی ضرورت میں استعمال ہو رہا ہے، باقی جو کچھ بھی ہے وہ سب زائد ہے۔ کہنے کو تو یوں کہا جائے گا کہ وہ اس کا مالک ہے، لیکن خود اس کے استعمال میں نہیں آ رہا ہے۔ جیسے ایک آدمی کے پاس بڑا بنگلہ ہے جس میں سو کمرے ہیں، ہر کمرے میں بیڈ (Bed) بستر بنا ہوا ہے، اور بہترین طریقے سے سجایا گیا ہے، تب بھی ایک وقت میں ایک ہی جگہ سوئے گا، باقی ننانوے تو خالی پڑے رہیں گے۔ اگر سو جوڑے کپڑے بنائے گا، تو ایک وقت میں تو ایک جوڑا ہی پہنے گا، باقی ننانوے جوڑے رکھے رہیں گے، بلکہ اگر ایک ساتھ دو جوڑے پہن لے گا تو سب کہیں گے کہ سیٹھ صاحب کے دماغ میں خلل آ گیا ہے۔

کھانا پینا کتنا ہی زیادہ تیار کیا جائے، ایک وقت میں اپنی ضرورت جتنی ہے اور تندرستی بھی ساتھ دے رہی ہے، تو جتنا تقاضہ ہے اس سے زیادہ نہیں کھا سکتا بقیہ سب اس کے حق میں بےکار ہے۔ تو غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ آدمی جتنا بھی مال و دولت جمع کرتا ہے، اس میں سے خود اس کے استعمال میں کتنا آتا ہے، اس کی بنیادی ضرورتیں جتنے مال سے پوری ہو جاتی ہیں، اس کے علاوہ سب زائد ہے۔

حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے یہ تین چیزیں عطا فرما دیں تو یوں سمجھے کہ میری سب ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں اور ساری دنیا ملی ہوئی ہے۔

کامیاب ترین آدمی

۵۱۲ - وعن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ، وَكَانَ رِزْقُهُ كَفَافاً، وَقَنَّعَهُ اللهُ بِمَا أَتَاهُ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اسلام لایا اور اس کی روزی بقدرِ ضرورت ہے، اور پھر جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کو دیا ہے اس پر قناعت اور صبر سے کام لیتا ہے؛ تو وہ کامیاب ترین آدمی ہے۔

افادات:- دراصل سب سے بڑی دولت قناعت ہے۔ اگر کسی کے پاس تھوڑا سا ہی مال ہے لیکن قناعت کی صفت حاصل ہے تو کوئی پریشانی نہیں ہے۔ اور اگر بہت بڑی مقدار میں دولت موجود ہے، لیکن قناعت نہیں ہے تو ہمیشہ پریشان رہے گا۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے قناعت کی دولت مانگے۔ حضور اکرم ﷺ نے دعا بتلائی ہے: "أَللّٰهُمَّ قَنِّعْنِيْ بِمَا رَزَقْتَنِيْ وَبَارِكْ لِيْ فِيْمَا أَعْطَيْتَنِيْ وَاخْلُفْ عَلٰى كُلِّ غَائِبَةٍ لِيْ بِخَيْرٍ" طواف میں رکن یمانی سے لے کر حجر اسود کے درمیان پڑھی جاتی ہے،

جیسے ﴿رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً﴾ پڑھی جاتی ہے، ایسے ہی جب حجر اسود قریب آتا ہے اس وقت یہ دعا بھی حدیث میں آئی ہے۔ اے اللہ! جو روزی تو نے مجھے دی ہے اس پر قناعت عطا فرما، اور جتنا دیا ہے اس میں برکت فرما۔

خوش خبری ہے اس کے لیے

۵۱۳- وعن أبي محمد فُضَالَةَ بنِ عبيدٍ الأنصاري رضی اللہ عنہ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَقُوْلُ: طُوْبىٰ لِمَنْ هُدِيَ لِلإِسْلَامِ، وَكَانَ عَيْشُهُ كَفَافًا وَقَنِعَ.

ترجمہ:- حضرت فضالہ بن عبید انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میں نے ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ خوش خبری ہے اس آدمی کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی توفیق عطا فرمائی، اور اس کو بقدرِ ضرورت روزی عطا فرمائی، اور اس پر وہ قناعت کرتا ہے۔ (مطلب یہ ہے کہ جو آدمی بقدرِ ضرورت پر قناعت کرے وہ قابلِ مبارکباد ہے۔)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے گھرانے کی راتیں

۵۱۴- وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَبِيْتُ اللَّيَالِيَ الْمُتَتَابِعَةَ طَاوِياً، وَأَهْلُهُ لَا يَجِدُوْنَ عَشَاءً، وَكَانَ أَكْثَرُ خُبْزِهِمْ خُبْزَ الشَّعِيْرِ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کئی راتیں مسلسل ایسی گزارتے تھے کہ آپ بھوکے ہوتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے گھر والوں کو رات کا کھانا میسر نہیں آتا تھا، اور جب کھانا میسر ہوتا تھا، تو وہ بھی عام طور پر جَو کی روٹی ہوتی تھی (دوسری کوئی چیز کبھی کبھار استعمال کرنے کی نوبت آتی تھی)

اہلِ صفہ کی بھوک پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی

۵۱۵ - وعن فُضَالَةَ بْنِ عبيدٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم كَانَ إِذَا صَلَّى

بِالنَّاسِ، يَخِرُّ رِجَالٌ مِنْ قَامَتِهِمْ فِيْ الصَّلاَةِ مِنَ الخَصَاصَةِ. وَهُمْ أَصْحَابُ الصُّفَّةِ. حَتّٰى يَقُوْلَ الأَعْرَابُ: هٰؤُلَآءِ مَجَانِيْن. فَإِذَا صَلَّى رَسُوْلُ اللهِ ﷺ انصَرَفَ إِلَيْهِمْ، فَقَالَ: لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا لَكُمْ عِنْدَ اللهِ تَعَالىٰ لَأَحْبَبْتُمْ أَنْ تَزْدَادُوْا فَاقَةً وَحَاجَةً. (رواہ الترمذی)

الخَصَاصَةُ: الْفَاقَةُ وَالْجُوْعُ الشَّدِيْدُ

ترجمہ:- حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھاتے تھے تو بہت سے لوگ نماز کے درمیان بھوک کی وجہ سے بیہوش ہو کر گر جاتے تھے، اور وہ صفہ والے ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ دیہات سے جو لوگ آتے تھے وہ ان حضرات کو دیکھ کر کہتے تھے کہ ان پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہے۔ (جیسے کسی کو مرگی کا مرض ہوتا ہے تو وہ بیہوش ہو کر گر جاتا ہے۔ تو وہ لوگ بھی ان حضرات کو ایسا ہی سمجھتے تھے کہ ان کو بھی وہی بیماری ہے۔) پھر جب نبی کریم ﷺ نماز سے فارغ ہو کر ان کی طرف متوجہ ہوتے تھے تو آپ ان کو تسلی دیتے ہوئے فرماتے: تمہارے اس مجاہدے پر اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہارے لئے بطورِ اجر وثواب کے جو کچھ رکھا ہوا ہے وہ اگر تم جان لو، تو تم دل سے اس بات کو پسند کرنے لگو کہ تمہارا یہ فاقہ اور ضرورت اور زیادہ بڑھ جائے۔

افادات:- یعنی اس وقت فاقہ کی یہ حالت ہے کہ تم بیہوش ہو کر گر رہے ہو لیکن اس پر اللہ تعالیٰ نے جو اجر وثواب رکھا ہے وہ اگر معلوم ہو جائے تو تم یہ تمنا کرنے لگو کہ اس تکلیف میں اور اضافہ ہو جائے۔ دیکھئے! نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ کی اس حالت کو دیکھ کر رنج کا اظہار نہیں فرمایا، بلکہ بطورِ تسلی کے ارشاد فرمایا کہ یہ تو ایسی چیز ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہیں جو کچھ ملنے والا ہے اگر اس کا پتہ چل جائے تو اس میں اور زیادتی کی تمنا کرو۔

بھرا ہوا سب سے بُرا برتن

۵۱۶ - وعن أَبِيْ كَرِيْمَةَ المقدام بن معديكرِبَ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَقُوْلُ: مَا مَلأَ آدَمِيٌّ وِعَاءً شَرًّا مِنْ بَطْنٍ، بِحَسْبِ ابْنِ آدَمَ أُكُلَاتٌ يُقِمْنَ صُلْبَهُ، فَإِنْ كَانَ لَا مَحَالَةَ فَثُلُثٌ لِطَعَامِهِ، وَثُلُثٌ لِشَرَابِهِ، وَثُلُثٌ لِنَفسِهِ۔

(رواه الترمذي)

(أُكُلَاتٌ) أَيْ: لُقَمٌ

ترجمہ:- حضرت مقداد بن معدیکرب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ انسان نے اپنے پیٹ سے برا اور کوئی برتن نہیں بھرا (یعنی پیٹ ایک ایسا برتن ہے جس کو بھرنا برا ہے) اور انسان کے لیے چند لقمے کافی ہیں جو اس کی پیٹھ کو سیدھا کردیں (یعنی اتنا کھانا جس سے آدمی ذرا ٹٹار ہو کر چل سکے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ) اگر زیادہ ہی کھانا ہے تو اتنا کھاؤ کہ اپنے پیٹ کا ایک حصہ کھانے کے لیے، ایک حصہ پینے کے لیے، اور ایک حصہ سانس کے لیے (یعنی زیادہ سے زیادہ کھانا ہے تو اتنا کھائے کہ ایک تہائی پیٹ بھرے۔)

سادگی ایمان کا حصہ ہے

۵۱۷- وعن أَبي أُمَامَةَ إِياس بن ثعلبةَ الأنصاري الحارثي رضی اللہ عنہ قَالَ: ذَكَرَ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَوْماً عِنْدَهُ الدُّنْيَا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: أَلَا تَسْمَعُوْنَ؟ أَلَا تَسْمَعُوْنَ؟ أَنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الإِيْمَانِ، أَنَّ البَذَاذَةَ مِنَ الإِيْمَانِ. يَعْنِيْ: التَّقَحُّلَ.

الْبَذَاذَةُ: بِالْباءِ الموحدة والذَّالَيْنِ الْمُعْجَمَتَيْنِ۔ وهِيَ رَثَاثَةُ الْهَيْئَةِ وَتَرْكُ فَاخِرِ اللِّبَاسِ۔ وَأَمَّا التَّقَحُّلُ: فَبالقافِ وَالْحَاءِ: قَالَ أَهْلُ اللُّغَةِ: الْمُتَقَحِّلُ

هُوَ الرَّجُلُ الْيَابِسُ الْجِلْدِ مِنَ خُشُوْنَةِ الْعَيْشِ وَتَرْكِ التَّرَفُّهِ۔

ترجمہ:- حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے دنیا (کی مال و دولت) کا تذکرہ کیا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا سنتے نہیں؟ کیا سنتے نہیں؟ سادگی ایمان کا حصہ ہے، سادگی ایمان کا حصہ ہے۔

افادات:- "بِذَاذَةٌ" سادہ لباس اور سادہ زندگی۔ یعنی لباس میں آدمی فخر و مباہات اور بڑائی سے اپنے آپ کو بچائے، اور رہن سہن میں سادگی اختیار کرے۔ اور آدمی اپنی حالت ایسی بنائے کہ سادہ زندگی کی وجہ سے اور کھانے پینے کے اندر عیش و عشرت کو چھوڑ دینے کی وجہ سے آدمی کی کھال خشک ہوجائے، یعنی سادہ کھانا استعمال کرے، زیادہ روغنی کھانا جب استعمال کرے گا تو کھال نرم ہوگی۔

عنبر مچھلی کا قصہ

۵۱۸- وعن أبي عبد الله جابر بن عبد الله رضی اللہ عنہما قَالَ: بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، وأَمَّرَ عَلَيْنَا أَبَا عُبَيْدَةَ رضی اللہ عنہ نَتَلَقَّى عِيْرًا لِقُرَيْشٍ، وَزَوَّدَنَا جِرَابًا مِنْ تَمْرٍ لَمْ يَجِدْ لَنَا غَيْرَهُ، فَكَانَ أَبُو عُبَيْدَةَ يُعْطِيْنَا تَمْرَةً تَمْرَةً، فَقِيْلَ: كَيْفَ كُنْتُمْ تَصْنَعُوْنَ بِهَا؟ قَالَ: نَمَصُّهَا كَمَا يَمَصُّ الصَّبِيُّ، ثُمَّ نَشْرَبُ عَلَيْهَا مِنَ الْمَاءِ، فَتَكْفِيْنَا يَوْمَنَا إِلَى اللَّيْلِ، وَكُنَّا نَضْرِبُ بِعِصِيِّنَا الْخَبَطَ ثُمَّ نَبُلُّهُ بِالْمَاءِ فَنَأْكُلُهُ، قَالَ: وَانْطَلَقْنَا عَلَى سَاحِلِ الْبَحْرِ، فَرُفِعَ لَنَا عَلَى سَاحِلِ الْبَحْرِ كَهَيْئَةِ الْكَثِيْبِ الضَّخْمِ، فَأَتَيْنَاهُ فَإِذَا هِيَ دَابَّةٌ تُدْعَى الْعَنْبَرَ، فَقَالَ أَبُو عُبَيْدَةَ: مَيْتَةٌ، ثُمَّ قَالَ لَا بَلْ نَحْنُ رُسُلُ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَفِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَقَدِ اضْطُرِرْتُمْ فَكُلُوا، فَأَقَمْنَا عَلَيْهِ شَهْرًا، وَنَحْنُ ثَلَاثُ مِئَةٍ حَتّٰى سَمِنَّا، وَلَقَدْ رَأَيْتُنَا نَغْتَرِفُ مِنْ وَقْبِ عَيْنِهِ بِالْقِلَالِ الدُّهْنَ وَ

نَقْطَعُ مِنْهُ الْفِدَرَ كَالثَّوْرِ أَوْ كَقَدْرِ الثَّوْرِ، وَلَقَدْ أَخَذَ مِنَّا أَبُو عُبَيْدَةَ ثَلَاثَةَ عَشَرَ رَجُلاً فَأَقْعَدَهُمْ فِيْ وَقْبِ عَيْنِهِ وَأَخَذَ ضِلَعاً مِنْ أَضْلَاعِهِ فَأَقَامَهَا ثُمَّ رَحَلَ أَعْظَمَ بَعِيْرٍ مَعَنَا فَمَرَّ مِنْ تَحْتِهَا وَتَزَوَّدْنَا مِنْ لَحْمِهِ وَشَائِقَ، فَلَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِيْنَةَ أَتَيْنَا رَسُوْلَ اللهِ ﷺ فَذَكَرْنَا ذٰلِكَ لَهُ فَقَالَ: هُوَ رِزْقٌ أَخْرَجَهُ اللهُ لَكُمْ، فَهَلْ مَعَكُمْ مِنْ لَحْمِهِ شَيْءٌ فَتُطْعِمُوْنَا؟ فَأَرْسَلْنَا إِلٰى رَسُوْلِ اللهِ ﷺ مِنْهُ، فَأَكَلَهُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح وافادات:- حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے ہم صحابہ کا ایک لشکر بھیجا اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو ہمارا امیر بنایا آپ نے ہمیں قریش کے ایک قافلہ کی ٹوہ لگانے کے لئے بھیجا تھا اور توشہ کے لیے آپ ﷺ نے ہمیں (پورے لشکر کو جو تقریباً ساڑھے تین سو (۳۵۰) آدمی تھے) چمڑے کی ایک تھیلی دی جس میں کھجوریں بھری ہوئی تھیں، اور کوئی چیز توشہ کے طور پر دینے کے لیے تھی ہی نہیں۔

(حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ) حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ہم میں سے ہر ایک کو روزانہ ایک ایک کھجور دیتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ اس ایک کھجور کا کیا کرتے تھے؟ تو انہوں نے کہا: جس طرح بچہ کے منہ میں کھجور دی جائے تو وہ چوستا رہتا ہے، ایسے ہی ہم اس کھجور کے دانے کو چوستے رہتے تھے، اور اس پر پانی پی لیتے تھے چوبیس گھنٹے کے لیے ہمیں وہی کافی ہو جاتا تھا۔ اور ہم اپنی لکڑیوں کے ذریعہ سے درختوں کے پتے جھاڑ لیا کرتے تھے اور اسی کو پانی میں بھگا کر کھا لیتے تھے۔

(حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ) پھر ہم سمندر کے کنارے پہنچے تو وہاں ہمیں ایک چھوٹا سا ٹیلا نما نظر آیا، جب ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ تو ایک بڑا جانور تھا جس کو عنبر کہا جاتا ہے (یہ وہیل مچھلی کی ایک قسم ہے) وہ کنارے پر پڑی ہوئی تھی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے پہلے تو کہا: یہ کوئی مردار جانور ہے، پھر فرمایا: نہیں! بلکہ یہ تو سمندری مچھلی ہے۔ اور ہم اللہ کے راستہ میں نبی کریم ﷺ کے بھیجے ہوئے ہیں اور ویسے بھی اضطراری حالت میں ہیں جس میں مردار کھانا جائز ہے،

اس لیے کھاؤ۔ چنانچہ ہم نے ایک مہینہ وہاں قیام کیا، اور ہم تین سو آدمی تھے، ہم اسی کو کھاتے رہے یہاں تک کہ اس کو کھانے کی وجہ سے ہم موٹے ہو گئے۔

(بخاری شریف کی روایت میں یہ ہے کہ فاقوں کی وجہ سے ہمارے جسموں میں جو کمزوری آ گئی تھی، اور ہمارے جسم جو دبلے ہو گئے تھے اس مچھلی کو کھانے کی وجہ سے وہ دبلا پن دور ہو گیا۔ موٹاپے کا مطلب یہی ہے۔)

پھر فرماتے ہیں کہ اس مچھلی کی آنکھ کا کھڈّا (گڑھا) اتنا بڑا تھا کہ ہم مٹکے بھر کر اس میں سے تیل نکالتے تھے، اور اسی سے گوشت پکاتے تھے۔ اور حضرت ابو عبیدہؓ نے ہم میں سے تیرہ آدمیوں کو چنا اور ان کو اس آنکھ کے گڑھے میں بٹھایا۔ جس کی آنکھ کا گڑھا اتنا بڑا ہو کہ تیرہ آدمی آرام سے اندر بیٹھ سکتے ہوں، وہ مچھلی کتنی بڑی ہو گی! اور فرماتے ہیں: اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی کو لے کر کمان کی طرح کھڑا کیا، اور ہمارے پاس جو سب سے اونچا اونٹ تھا اس کو اس کے نیچے سے گزارا۔

حضرت قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ

اس روایت میں تو صرف یہی ہے، لیکن دوسری روایت میں ہے کہ اس اونٹ پر ہم میں سے جو سب سے اونچا آدمی تھا اس کو سوار کرایا۔ یہ حضرت قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما تھے۔ یہ بہت اونچے آدمی تھے، ان کے متعلق لکھا ہے کہ جب سواری پر سوار ہوتے تھے تو ان کے پاؤں زمین پر لگتے تھے۔ اور یہ بہت زیادہ بہادر بھی تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باڈی گارڈ کے طور پر آگے آگے یہی رہتے تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر مستقل باب قائم کیا ہے۔

قیصرِ روم کو دنداں شکن جواب

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک مرتبہ قیصرِ روم نے دو آدمی بھیجے، ایک

بہت اونچا تھا اور دوسرا بہت پہلوان تھا۔ گویا وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر اس کا جواب ہو تو دو۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اونچے آدمی کا جواب دینے کے لئے انہی (حضرت قیس بن سعد بن عبادہ) کو بلایا۔ جب یہ آئے تو انہوں نے اوپر لمبا کرتہ پہنا ہوا تھا، نیچے سے اپنا پائجامہ نکالا اور اس سے کہا کہ اس کو پہنو، جب اس نے پہنا تو وہ گلے تک پہنچتا تھا۔

اور پہلوان ومضبوط آدمی کا جواب دینے کے لیے حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ (جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں ان) کو بلایا اور پہلوان کے مقابلہ کے لیے بھیجا، انہوں نے اس پہلوان سے کہا: میں یہاں بیٹھتا ہوں تو مجھے میری جگہ سے ہلا دے۔ چناں چہ وہ بیٹھے تو اس نے بہت کوشش کی لیکن ذرہ برابر بھی ہلا نہیں سکا۔ پھر اس سے کہا: اچھا! اب تو بیٹھ۔ جب وہ بیٹھا تو انہوں نے ایک انگلی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اوپر اُٹھا لیا۔ ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سکّے کو ہاتھ میں لے کر مسلتے تھے تو اس کے اوپر جو چھاپ ہوتی ہے اس کو مٹا دیتے تھے۔

تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو سب سے اونچے اونٹ پر سوار کرایا اور ان کے ہاتھ میں ایک نیزہ دیا اور اس کو اونچا رکھنے کو کہا اور اس پسلی کے نیچے سے -جو کمان کی طرح بنا کر کھڑی کی تھی- گزرنے کے لیے کہا، اس طرح اس کے نیچے سے یہ گزرے تب بھی نیزہ اس پسلی کو نہیں لگا۔ (اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مچھلی کتنی بڑی ہوگی!)

(حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ) اس کے بعد بھی وہ گوشت اتنا بچا کہ ہم اپنے ساتھ باندھ کر واپس لے گئے۔ جب ہم مدینہ منورہ پہنچے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی ہے جو خاص تمہارے لیے بھیجی تھی۔ پھر پوچھا: تمہارے پاس اس کا کچھ گوشت بچا ہوا ہے؟ بتایا گیا کہ ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے وہ گوشت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لا کر پیش کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

بھی اس کو تناول فرمایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کرتہ کی آستین

۵۱۹-وعن أسماء بنت يزيد رضي الله عنها قالت: كَانَ كُمُّ قَمِيْصِ رَسُوْلِ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم إلى الرُّصْغِ. (رواه ابو داود والترمذی، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:-حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کرتے کی آستین؛ کہنی اور ہتھیلی کے درمیان آدھے ہاتھ تک تھی۔

افادات:-اس سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اتنا کپڑا ابھی نہیں تھا کہ آستین گٹوں تک پوری بنائی جا سکے۔

فَضۡلُ الۡجُوۡع

وَخُشُوۡنَۃِ الۡعَیۡشِ

بھوک وفاقہ برداشت کرنے

اور

سادہ زندگی بسر کرنے کی فضیلت

﴿مجلس ۴﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس باب میں سادہ زندگی بسر کرنے، بھوک وفاقہ برداشت کرنے اور کھانے پینے اور لباس میں کم سے کم مقدار پر اکتفاء کرنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اور اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ آدمی اپنی خواہشات اور نفسانی تقاضوں کو چھوڑے۔ اسی سلسلہ میں نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی زندگی کے نمونے پیش کئے کہ وہ حضرات کھانے پینے اور لباس میں کتنے کم پر اکتفاء کرتے تھے، اور کیسے فاقوں کو برداشت کرتے تھے۔

دورِ نبوت کا ایک اہم واقعہ

۵۲۰- وعن جابر رضی اللہ عنہ قَالَ: إِنَّا كُنَّا يَوْمَ الْخَنْدَقِ نَحْفِرُ، فَعَرَضَتْ كُدْيَةٌ شَدِيدَةٌ، فَجَاؤُوا إِلَى النَّبِي ﷺ فَقَالُوا: هٰذِهِ كُدْيَةٌ عَرَضَتْ فِي الْخَنْدَقِ، فَقَالَ: (أَنا نَازِلٌ) ثُمَّ قَامَ وَبَطْنُهُ مَعْصُوبٌ بِحَجَرٍ، وَلَبِثْنَا ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ لاَ نَذُوقُ ذَوَاقاً فَأَخَذَ النَّبِيُّ ﷺ الْمِعْوَلَ، فَضَرَبَ فَعَادَ كَثِيباً أَهْيَلَ أَوْ أَهْيَمَ، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ، ائْذَنْ لِي إِلَى الْبَيْتِ، فَقُلْتُ لِامْرَأَتِي: رَأَيْتُ بِالنَّبِي ﷺ شَيْئاً مَا فِي ذٰلِكَ صَبْرٌ فَعِنْدَكِ شَيْءٌ؟ فَقَالَتْ: عِنْدِي شَعِيرٌ وَعِنَاقٌ فَذَبَحْتُ الْعِنَاقَ وَطَحَنْتُ الشَّعِيرَ حَتّٰى جَعَلْنَا اللَّحْمَ فِي الْبُرْمَةِ، ثُمَّ جِئْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَالْعَجِينُ قَدِ انْكَسَرَ، وَالْبُرْمَةُ بَيْنَ الْأَثَافِيِّ قَدْ كَادَتْ تَنْضُجُ، فَقُلْتُ: طُعَيِّمٌ لِي، فَقُمْ أَنْتَ يَا رَسُولَ اللهِ وَرَجُلٌ أَوْ رَجُلاَنِ، قَالَ (كَمْ هُوَ)؟ فَذَكَرْتُ لَهُ، فَقَالَ: (كَثِيرٌ طَيِّبٌ قُلْ لَهَا لاَ تَنْزَعِ الْبُرْمَةَ، وَلاَ الْخُبْزَ مِنَ التَّنُّورِ حَتّٰى آتِيَ) فَقَالَ: (قُومُوا) فَقَامَ الْمُهَاجِرُونَ وَالأَنْصَارُ، فَدَخَلْتُ عَلَيْهَا فَقُلْتُ: وَيْحَكِ قَدْ جَاءَ النَّبِيُّ ﷺ وَالْمُهَاجِرُونَ

وَالأَنْصَارُ وَمَنْ مَعَهُمْ !قَالَتْ:هَلْ سَأَلَكَ؟قُلْتُ: نَعَمْ، قَالَ:(اُدْخُلُوا وَلَا تَضَاغَطُوا)فَجَعَلَ يَكْسِرُ الْخُبْزَ،وَيَجْعَلُ عَلَيْهِ اللَّحْمَ،وَيُخَمِّرُ الْبُرْمَةَ.

وَالتَّنُّورُإِذَاأَخَذَمِنْهُ،وَيُقَرِّبُ إِلىٰ أَصْحَابِهِ ثُمَّ يُنْزَعُ، فَلَمْ يَزَلْ يَكْسِرُ وَيَغْرِفُ حَتّٰى شَبِعُوْاوَبَقِيَ مِنْهُ،فَقَالَ:(كُلِي هٰذَا وَأَهْدِيْ،فَإِنَّ النَّاسَ أَصَابَتْهُمْ مَجَاعَةٌ)

وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ جَابِرٌ : لَمَّاحُفِرَ الْخَنْدَقُ رَأَيْتُ بِالنَّبِي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خَمَصاً، فَانْكَفَأْتُ إِلىٰ امْرَأَتِيْ،فَقُلْتُ :هَلْ عِنْدَكِ شَيْئٌ ؟ فَإِنِّي رَأَيْتُ بِرَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خَمَصاًشَدِيْداً فَأَخْرَجَتْ إِلَيَّ جِرَاباًفِيْهِ صَاعٌ مِنْ شَعِيْرٍ،وَلَنَا بُهَيْمَةٌ دَاجِنٌ فَذَبَحْتُهَا، وَطَحَنَتِ الشَّعِيْرَ، فَفَرَغَتْ إِلىٰ فَرَاغِيْ، وَقَطَعْتُهَا فِيْ بُرْمَتِهَا، ثُمَّ وَلَّيْتُ إِلىٰ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَقَالَتْ: لاتَفْضَحْنِيْ بِرَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَمَنْ مَعَهُ، فَجِئْتُهُ فَسَارَرْتُهُ، فَقُلْتُ :يَارَسُوْلَ الله! ذَبَحْنَا بُهَيْمَةً لَنَا وَطَحَنْتُ صَاعاً مِنْ شَعِيْرٍ فَتَعَالَ أَنْتَ وَ نَفَرٌ مَعَكَ فَصَاحَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَقَالَ يَا أَهْلَ الْخَنْدَقِ:إِنَّ جَابِراً قَدْ صَنَعَ سُؤْراً فَحَيَّهَلابِكُمْ)فَقَالَ النَّبِي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لاتُنْزِلُنَّ بُرْمَتَكُمْ وَلاَ تَخْبِزَنَّ عَجِيْنَكُمْ حَتّٰى أَجِيئَ، فَجِئْتُ ، وَجَاءَ النَّبِي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَقْدُمُ النَّاسَ، حَتّٰى جِئْتُ امْرَأَتِيْ فَقَالَتْ :بِكَ وَبِكَ!فَقُلْتُ قَدْ فَعَلْتُ الَّذِيْ قُلْتِ. فَأَخْرَجَتْ عَجِيْناً، فَبَصَقَ فِيْهِ وَبَارَكَ، ثُمَّ عَمِدَ إِلىٰ بُرْمَتِنَا فَبَصَقَ وَبَارَكَ، ثُمَّ قَالَ: ادْعِيْ خَابِزَةً فَلْتَخْبِزْ مَعَكِ، وَاقْدَحِيْ مِنْ بُرْمَتِكُمْ، وَلاَ تَنْزِلُوْهَا)وَهُمْ أَلْفٌ،فَأُقْسِمُ بِاللهِ لَأَكَلُوْا حَتّٰى تَرَكُوْهُ وَانْحَرَفُوْا، وَإِنَّ بُرْمَتَنَا لَتَغِطُّ كَمَاهِيَ،وَإِنَّ عَجِيْنَنَا لَيُخْبَزُ كَمَا هُوَ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ خندق کے دن ہم لوگ کھدائی کا کام کررہے تھے (سردی کا زمانہ تھا، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جس ٹولی اور جماعت

میں تھے اور اس جماعت کو کھدائی کے لیے جو حصہ حوالہ کیا گیا تھا اس کی) کھدائی کے دوران ایک جگہ پر سخت چٹان نکل آئی (بہت کوششیں کیں، بہت کلہاڑیاں اور اوزار استعمال کیے، لیکن سارے ہتھیار جواب دے گئے اور کند ہو گئے لیکن وہ چٹان ٹوٹنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ جو حضرات یہ کام کررہے تھے انہوں نے آپس میں کہا کہ ہم چاہیں تو سخت چٹان کو چھوڑ کر دوسری طرف سے کھدائی کر سکتے ہیں، لیکن اس میں یہ ہوگا کہ نبیٔ کریم ﷺ نے جو خط کھینچا ہے اس سے ہٹنا پڑے گا اور ہم حضور اکرم ﷺ کی اجازت اور حکم کے بغیر وہاں سے ہٹ نہیں سکتے، اس لئے) یہ حضرات نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ایسی صورتِ حال ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: میں آتا ہوں (اور میں خود اتر کر اس پتھر کو توڑوں گا۔ یہ بات یاد رہے کہ اس کھدائی میں نبی کریم ﷺ بھی بذاتِ خود شریک تھے اور جو مٹی نکلتی تھی وہ اٹھا کر باہر پھینکنے کا کام خود فرماتے تھے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے خود نبی کریم ﷺ کے شکمِ مبارک پر دیکھا کہ مٹی اُٹھا کر پھینکنے کی وجہ سے پورا پیٹ مٹی سے چھپ گیا تھا) آپ اپنی جگہ سے اُٹھے، اس وقت نبی کریم ﷺ کے شکمِ مبارک پر پتھر بندھا ہوا تھا (اور یہ کیوں تھا؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ) تین دن گزر چکے تھے لیکن کوئی چیز چکھنے کو نہیں ملی تھی (دوسرے صحابہ کرامؓ نے بھی پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے تھے اور حضور اکرم ﷺ کے پیٹ مبارک پر بھی بھوک اور فاقہ کی وجہ سے پتھر بندھا ہوا تھا آپ اندر اترے) پھاوڑا لیا اور اس کے ذریعہ سے اس چٹان کو مارا، آپ کے اس ضرب لگانے کی وجہ سے وہ چٹان بالکل ریت کی طرح ہوگئی۔

دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے تین ضربیں لگائیں، پہلی ضرب سے ایک تہائی حصہ، اور دوسری ضرب سے دوسرا ایک تہائی، اور آخری ضرب سے آخری بچا ہوا حصہ ٹوٹا، اور ہر ضرب پر ایک روشنی نمودار ہوتی تھی۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے وہ روشنی دیکھی،

تو پوچھا: اے اللہ کے رسول! کچھ روشنی نظر آئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: اچھا! کیا تم نے بھی وہ روشنی دیکھی؟ کہا: جی ہاں۔ اس پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پہلی ضرب پر جو روشنی نکلی اس میں مَیں نے شام کے قیصر کے سرخ محلات دیکھے، دوسری روشنی میں مدائن کے سفید محلات دیکھے اور پھر تیسری روشنی میں صنعاء کا علاقہ دیکھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے بتایا گیا کہ یہ سب آپ کے لیے فتح ہوگا، یہ سن کر صحابہ کرامؓ نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

(اس وقت کچھ منافقین بھی وہاں موجود تھے۔ اب ایسے موقع پر جبکہ کھانے پینے کے لالے پڑ رہے تھے، دشمن سر پر چڑھائی کے لیے تیار تھا، اور کھدائی کا کام بھی خود ہی کرنا پڑ رہا تھا، ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ اگر ایسی بشارت سنائی جائے کہ اس زمانہ کی دو بڑی طاقتیں جو سپر پاور (Super Power) سمجھی جاتی تھیں وہ فتح ہوں گی تو یہ کیسے عقل میں آنے والی بات ہے؟ منافقین نے وہی کہا جو ایمان ویقین کی دولت سے محروم لوگ باتیں کیا کرتے ہیں۔

اور ایمان کی اتنی بڑی قیمت کیوں ہے؟ جنت کی قیمت ایمان ہی ہے؛ اس لئے کہ ایمان کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایسے حالات جو اس بات کی صداقت کی تائید نہیں کر رہے ہیں لیکن اللہ کا نبی وحی کی بنیاد پر ایک بات کہہ رہا ہے جو حالات کے خلاف ہے، اس کے باوجود اس بات کو مان لینا اور یقین کر لینا کہ ایسا ہی ہے۔ بظاہر اس کے بالکل خلاف نظر آ رہا ہو تب بھی اس کو یقین کے ساتھ بالکل سچا سمجھنا، یہی عین ایمان ہے ورنہ حالات موافق ہوں اور کوئی بات کہی جائے تو عقل بھی اس کی تائید کرتی ہے، اور آدمی ویسے بھی وہ بات مان لیتا ہے۔ تو منافقین نے جب یہ سنا تو وہ ٹھٹھا واستہزاء کرنے لگے کہ دیکھو! کھانے کا تو ٹھکانہ نہیں ہے اور ان کو قیصر وکسریٰ کے محل نظر آ رہے ہیں کہ وہ فتح ہوں گے۔ اسی کو سورۂ احزاب میں ذکر کیا گیا ہے: ﴿وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ

وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ﴾ جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے وہ ایسی بات کر رہے تھے کہ اللہ اور رسول نے ہم کو جو باتیں کہی ہیں وہ دھوکے کی بات ہے، وہ خالی سبز باغ دکھا رہے ہیں۔)

(خیر! وہ چٹان ٹوٹ گئی، اور کھدائی کا کام مکمل ہوا۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ کے شکمِ مبارک پر پتھر بندھا ہوا جب میں نے دیکھا تو مجھ سے نہیں رہا گیا، میں نے اپنے دل ہی دل میں ایک بات سوچی کہ گھر جا کر معلوم کروں اور کھانے کی کوئی چیز ہو تو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کروں۔ چوں کہ نبی کریم ﷺ کی مجلس میں جب حاضری دی جاتی تھی تو وہاں سے گھر جانے کے لیے اجازت لینا ضروری تھا، اور پھر یہاں تو جنگ کی تیاریوں کے لیے آئے ہوئے تھے، تو اجازت لینا اور زیادہ ضروری ہو گیا تھا) اس لیے میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے گھر جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں، مجھے کام ہے (حضور ﷺ نے اجازت دے دی۔ وہ اپنے گھر آئے) اور اپنی بیوی سے کہا: مَیں نے نبی کریم ﷺ پر وہ چیز دیکھی (یعنی بھوک وفاقہ کا وہ اثر دیکھا) کہ مجھ میں برداشت کی طاقت نہیں رہی، تیرے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے (تاکہ ہم حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کر سکیں؟) اس پر ان کی بیوی نے جواب دیا: کچھ جَو پڑے ہوئے ہیں (وہ ایک صاع، یعنی ساڑھے تین سیر تھے) اور بکری کا ایک بچہ ہے (حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ) مَیں نے بکری کا وہ بچہ ذبح کیا اور بیوی نے وہ جَو پیس کر آٹا تیار کیا اور اس کو گوندھا اور میں نے گوشت کے ٹکڑے کر کے ہنڈیا میں ڈالے، اور پھر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایسی حالت میں حاضر ہوا کہ آٹے کا خمیر ٹوٹ چکا تھا (مطلب یہ ہے کہ آٹا اس قابل ہو گیا تھا کہ اس کی روٹی بنائی جا سکے) اور ہنڈیا میں گوشت پکنے کے قریب تھا۔ مَیں نے حضور کی خدمت میں آ کر (چپکے سے) عرض کیا کہ تھوڑا سا کھانا گھر پر حاضر ہے، اے اللہ کے

رسول! آپ اور آپ کے ساتھ ایک دو آدمی تشریف لائیے (وہ کھانا اتنا زیادہ نہیں تھا کہ سب کے لیے کافی ہوتا، ورنہ ان حضرات کو تو سب کو دعوت دینے میں بھی کوئی تأمل نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے مصلحت کے پیشِ نظر یہ عرض کیا کہ آپ اپنے ساتھ ایک دو آدمیوں کو لے کر گھر تشریف لائیے، تھوڑا سا کھانا موجود ہے، نوش فرمائیے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ) نبی کریم ﷺ نے مجھ سے پوچھا: جس کو آپ تھوڑا سا کھانا کہتے ہیں وہ کتنا ہے؟ مَیں نے بتلا دیا، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: یہ تو بہت زیادہ اور بہت عمدہ چیز ہے۔ پھر حضور ﷺ نے حضرت جابر سے ایک بات تاکید کے طور پر ارشاد فرمائی کہ اپنی بیوی سے کہنا کہ ہنڈیا کو چولہے پر سے نہ اُتارے اور تنور میں سے روٹی نہ نکالے جب تک کہ میں نہ آ جاؤں۔ یہ فرما کر حضورِ اکرم ﷺ نے صحابہ کرام سے کہا: چلو (اعلان کرادیا کہ جابر کے یہاں کھانے کی دعوت ہے، سب چلو) وہاں پر جتنے حضراتِ صحابہ موجود تھے (ایک ہزار سے زیادہ لوگ تھے) وہ سب حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ اُٹھے (حضرت جابر تو آگے نکلے اور حضور ﷺ پیچھے تشریف لے جارہے ہیں، یہ جلدی جلدی اپنے گھر پہنچے اور بیوی سے کہنے لگے کہ حضورِ اکرم ﷺ تو مہاجرین وانصار جتنے بھی وہاں تھے سب کو لے کر آرہے ہیں۔ گویا ان پر ایک پریشانی کی سی کیفیت تھی کہ اب کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ کھانا ان سب کے لیے تو کافی نہیں ہوسکتا ہے) اس پر ان کی اہلیہ نے ان سے پوچھا (اور یہ اس کی سمجھ داری کی بات ہے) تم سے حضور ﷺ نے حالات پوچھے تھے؟ کہا: ہاں (اور مَیں نے بتلا دیا تھا اس کے باوجود بھی حضور ﷺ نے سب کو بلا لیا۔ دوسری روایتوں میں ہے کہ اس پر ان کی بیوی نے کہا کہ پھر تو فکر کی بات نہیں) چناں چہ حضور ﷺ تشریف لائے (راوی نے یہاں ذرا اختصار سے کام لیا ہے، ورنہ دوسری روایتوں میں ہے کہ نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور آپ نے کچھ پڑھنے کے بعد ہنڈیا اور آٹے کے اندر اپنا لعابِ دہن ڈالا، اور ان کی اہلیہ سے

فرمایا کہ تم ایک اور عورت روٹی پکانے والی بلالو۔ پھر آپ نے ہنڈیا کا ڈھکن بھی بند کر دیا اور حضرت جابرؓ سے کہا کہ) سب سے کہو کہ ایک ساتھ نہ آئیں (مکان میں اتنی گنجائش بھی نہیں تھی، دس دس آدمی آتے جائیں۔ چناں چہ دس دس کو اندر بلایا جاتا تھا، اور تنور سے روٹیاں نکلتی تھی) تو نبیٔ کریم ﷺ خود اپنے دستِ مبارک سے توڑ توڑ کر برتن میں رکھ کر ہنڈیا میں سے اس کے اوپر شوربہ اور گوشت کی بوٹیاں ڈالتے تھے، اس کے بعد ہنڈیا کو ڈھانپ دیتے تھے اور آٹے پر بھی کپڑا اڑلوا دیتے تھے۔ اس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باری باری آتے رہے اور کھاتے رہے، یہاں تک کہ سب شکم سیر ہو گئے (حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد بھی کھانا بچ گیا۔ بلکہ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ مَیں ہنڈیا کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ شروع میں جتنا تھا اتنا ہی رہ گیا ہے، کچھ بھی کم نہیں ہوا ہے) پھر حضور اکرم ﷺ نے ان کی اہلیہ کو بھی تاکید کی کہ تم بھی کھاؤ اور دوسرے پڑوسیوں کو بھی ہدیہ کے طور پر بھیجو (اس لیے کہ آج کل فاقہ چل رہا ہے، اور دوسرے لوگوں کے پاس بھی کھانے کا انتظام نہیں ہے)

اسی روایت کو دوسری سند سے پیش کیا ہے اس میں کچھ الفاظ کا فرق ہے، جس میں کچھ دوسری چیزیں بیان کی گئی ہیں جو میں آپ کے سامنے ذکر کر چکا ہوں۔

غزوۂ خندق کا پس منظر

افادات:- خندق ایک غزوہ کا نام ہے۔ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں مشرکین اور دشمنانِ اسلام کے ساتھ مختلف لڑائیاں ہوئیں، جن لڑائیوں میں نبی کریم ﷺ بہ نفسِ نفیس شریک ہوئے؛ ان کو غزوہ کہتے ہیں۔ تو خندق بھی ایک ایسی ہی لڑائی ہے جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ۵ سنہ ھ میں پیش آئی، اور اس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ

اس سے پہلے مدینہ منورہ کے اندر یہودیوں کا ایک قبیلہ بنونضیر کے نام سے آباد تھا، اس کی شرارتوں کی وجہ سے اس کے ساتھ جنگ کی نوبت آئی اور اس قبیلے کے رہنے والے لوگوں کو وہاں سے جلاوطن کیا گیا۔ ان کے ساتھ جب جنگ ہوئی اور انہوں نے دیکھا کہ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے پر راضی ہو گئے کہ آپ ہمارے لیے جو سزا تجویز کریں گے ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے کہا کہ تم اپنے ساتھ اونٹوں پر اٹھا کر جتنا بھی مال وسامان لے جا سکتے ہو؛ لے جاؤ اور مدینہ چھوڑ دو۔ تمہارے مکانات اور زمینوں پر مسلمان قابض ہوں گے۔ چناں چہ اس پر عمل ہوا اور ان کو مدینہ منورہ سے جلاوطن کیا گیا، ان میں کے کچھ لوگ خیبر میں جا کر آباد ہوئے، کچھ لوگ اُردن کے علاقہ میں جا کر آباد ہوئے۔ خیبر میں جا کر آباد ہونے والوں میں قبیلہ بنونضیر کے کچھ سردار قسم کے لوگ بھی تھے، جس میں حیی بن اخطب وغیرہ افراد تھے۔ حیی بن اخطب کو اپنی جلاوطنی پر بڑا طیش اور ناراضگی تھی اور وہ کسی نہ کسی طریقہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ چناں چہ وہ یہودیوں کے چالیس آدمیوں کا ایک وفد لے کر مکہ مکرمہ گیا اور مشرکینِ مکہ سے گفتگو کی کہ آپ لوگ مدینہ پر چڑھائی کریں، ہم آپ لوگوں کا ساتھ دیں گے۔ اور مشرکین کو مسلمانوں کے خلاف بہت زیادہ بھڑکایا۔ ویسے مکہ والے پہلے سے مسلمانوں کے دشمن تو تھے ہی، اور اس سے پہلے بھی وہ مدینہ منورہ پر چڑھائی کر چکے تھے، اور ان کے ساتھ غزوۂ بدر، غزوۂ اُحد وغیرہ کئی جنگیں ہو چکی تھیں، اب ان یہودیوں نے آ کر دوبارہ ان کو آمادہ کیا۔ ویسے تو انہوں نے مکہ والوں کے دل کی بات ہی کہی تھی لیکن مزید پختگی حاصل کرنے کے لیے مکہ والوں نے ان سے کہا کہ آپ لوگ اہلِ کتاب ہیں (یہ لوگ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے اور تورات کو ماننے والے تھے) تو اب یہ بتاؤ کہ ہم

جس مذہب کو مانتے ہیں اور اس پر چلتے ہیں؛ وہ اچھا ہے، یا مسلمان جس مذہب کو مانتے ہیں اور اس پر چلتے ہیں؛ وہ اچھا ہے؟ یہ لوگ ہمارے بتوں کی برائی کرتے ہیں اور ہم کو مشرک بتلاتے ہیں۔ اب یہودی اہلِ کتاب ہونے کے ناتے سے یہ بات تو اچھی طرح جانتے تھے کہ بتوں کی پوجا کرنا بہت ہی برا کام ہے، اور نبی کریم ﷺ پر اگرچہ ایمان نہیں لائے تھے لیکن اپنی کتاب تورات میں نبی کریم ﷺ کے متعلق جو پیشین گوئیاں تھیں اور آپ ﷺ کی جو علامتیں ان کی کتاب میں بتائی گئی تھیں، اس کی بنیاد پر ان کو اس بات کا یقین تھا کہ نبی کریم ﷺ آخری پیغمبر ہیں، اور ان کا ضمیر ان باتوں کو سمجھتا تھا کہ مسلمان جس دین اور مذہب کو مانتے ہیں وہ درست ہے، اور مکہ والوں کا مذہب غلط ہے، اس کے باوجود اپنے ضمیر کے خلاف انہوں نے کہا کہ تمہارا مذہب صحیح ہے، تم حق پر ہو اور وہ باطل پر ہیں۔ پھر مکہ والوں نے اتنی سی بات پر ہی اطمینان کا اظہار نہیں کیا، بلکہ کہا کہ چلو آؤ! ہم سب کعبہ کا غلاف پکڑ کر آپس میں معاہدہ کریں کہ جب تک مسلمانوں کو ختم نہیں کریں گے، وہاں تک ہم سب مل کر ان کا مقابلہ کریں گے۔ چناں چہ یہودیوں کے چالیس آدمیوں کا جو وفد آیا تھا وہ اور مکہ کے ذمہ دار اور سردار سب مل کر حرم میں گئے اور کعبہ شریف کا پردہ پکڑ کر آپس میں معاہدہ کیا کہ جب تک ہم نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو شکست نہیں دیں گے، ان کو ختم نہیں کریں اور ان کا قلع قمع نہیں کریں گے، وہاں تک ان کے ساتھ ہماری برابر لڑائی رہے گی، اور اس کے لیے ایک دوسرے کا پورا پورا ساتھ دیں گے۔

یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی شانِ حلم ہے کہ اللہ کے دشمن، اللہ کے گھر کا پردہ پکڑ کر، اللہ کے محبوب رسول کو ختم کرنے کا معاہدہ کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے، اور وہ قادر ومختار ہے، اس کے باوجود ان کو ڈھیل دے رہا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا

کہ اس معاہدہ کا آگے چل کر کیا حال ہونے والا ہے، اس وقت سب کو پتہ چلے گا۔

بہرحال! اس طرح بات پکی ہوئی، اس کے بعد یہ لوگ مکہ مکرمہ کے آس پاس مشرکین کے جو قبائل۔ غِطْفان، سُلَیم اور اسلم غیرہ۔ آباد تھے، ان کے پاس گئے اور ان سے بھی ساتھ دینے کو کہا۔ ویسے ان کو تو مسلمانوں کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں تھی اس لیے ان کو رشوت اور لالچ دی کہ اگر تم لوگ لڑائی میں ہمارا ساتھ دو گے تو خیبر کے اندر جو کھجوریں پیدا ہوتی ہیں، اس کی ایک سال کی پوری پیداوار ہم تمہیں دیں گے۔ ان کو دشمنی سے کوئی لینا دینا نہیں تھا لیکن ان کو کھجوروں کا جو لالچ دیا گیا، اس بنیاد پر انہوں نے بھی ساتھ دینے کی حامی بھر لی، یہ سب طے ہو گیا، اس کے بعد مکہ مکرمہ سے باقاعدہ ایک بڑا لشکر روانہ ہوا، اور اس میں غِطْفان کے قبائل بھی شریک ہوئے، اُدھر سے یہودی بھی آئے، گویا ایک متحدہ محاذ (National Alliance) مسلمانوں کے مقابلہ کے واسطہ وجود میں آیا۔ جب یہ لوگ مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے تھے تو دس ہزار کا مجمع تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ ایمان لے آئے تھے، لیکن مکہ مکرمہ ہی میں تھے، انہوں نے ابھی تک ہجرت نہیں کی تھی۔ ویسے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہجرت کی اجازت طلب کی تھی لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا کہ ابھی وہیں رہو، اور تم سب سے آخر میں ہجرت کرو گے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نبوت کو ختم کیا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ تم پر ہجرت کو ختم کرے گا۔ اس لیے وہ مکہ مکرمہ ہی میں رہتے تھے اور مکہ والے مسلمانوں کے خلاف جو تدبیریں اور سازشیں کرتے تھے ان سب کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا کرتے تھے۔ جب یہ لشکر روانہ ہوا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ایک تیز رفتار سوار بھیج کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع دی کہ یہاں سے ان لوگوں کا دس ہزار کا لشکر روانہ ہو چکا ہے۔ خیبر کے یہودیوں نے یہ سب تدبیریں کی ہیں اور وہ بھی ساتھ دینے والے ہیں۔ جب

یہ اطلاع مدینہ منورہ پہنچی تو نبی کریم ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو مشورہ کے لیے جمع کیا کہ دس ہزار کا لشکر ہے، ان کے مقابلہ کے لیے کیا تدبیر اختیار کی جائے۔ اس سے پہلے غزوۂ اُحد کے موقع پر مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا تھا اور اِس وقت کے مشورہ میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے جو اصل فارس کے رہنے والے تھے۔ ان کے اسلام کا بھی بڑا لمبا چوڑا قصہ ہے جو آپ نے حکایاتِ صحابہ میں تفصیل سے پڑھا اور سنا ہوگا۔ وہ غلام بنا کر لائے گئے اور جب نبی کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اس مشورہ کی مجلس میں وہ بھی تھے۔ اب یہاں سوال یہ تھا کہ دشمن اتنی بڑی تعداد میں چڑھ کر آرہا ہے، اس کا مقابلہ کس طرح کیا جائے؟ تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ ہمارے یہاں فارس میں دستور یہ ہے کہ ایسے موقع پر شہر کے آس پاس اتنی بڑی خندق کھود دی جاتی ہے کہ دشمن اس کو آسانی سے پار نہ کر سکے، اور وہیں رہ کر اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ دشمن اندر اتر کر بھی اوپر آنے نہ پائے، گویا خندق کو دشمن کے لیے آڑ بنادی جاتی ہے۔ جب انہوں نے یہ مشورہ دیا تو سب نے ان کی رائے کو پسند کیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ مکہ مکرمہ کی طرف سے آنے والے راستہ پر جہاں سے لوگ مدینہ منورہ میں داخل ہوتے ہیں، اس پورے حصہ پر ایک گہری خندق کھود دی جائے۔

چناں چہ حضورِ اکرم ﷺ نے بہ نفسِ نفیس اس پورے حصہ کا خط کھینچا۔ اوپر کے علاقہ سے وادئ بطحان اور راطونہ تک خط کھینچا گیا تھا، جو تقریباً ساڑھے تین میل سے لمبی، اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ فٹ چوڑی اور اتنی گہری کہ تر زمین نظر آگئی جو تقریباً پندرہ فٹ ہوتی ہے؛ ایسی گہری خندق کھودنا طے ہوا۔ اور نبی کریم ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی دس دس کی ٹولیاں اور جماعت بنائی، اور ہر ایک جماعت کو کچھ کچھ

حصہ کھودنے کا کام سونپ دیا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ پہاڑی علاقہ ہے، وہاں کی کھدائی بھی کوئی آسان کام نہیں تھا اس کے باوجود اتنی لمبی چوڑی اور اتنی گہری خندق حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے صرف چھ دن میں مکمل کر دی۔ اور وہ فقر و فاقہ کا زمانہ تھا، جب خندق کھودی جا رہی تھی اس زمانہ میں بھی مسلمانوں کے پاس کھانے پینے کی سہولتیں نہیں تھیں اس لئے پیٹ پر پتھر باندھ کر یہ کام کر رہے تھے۔ یہ واقعہ جو اوپر روایت میں ذکر ہوا ہے وہ اسی خندق کے کھودنے کے دوران پیش آیا ہے۔

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور ہم

بہر حال! اس روایت کو لانے کا مقصد یہی ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی زندگی تھی کہ تین تین دن گزر جاتے تھے اور فاقہ رہتا تھا، کھانے کو کچھ میسر نہیں ہوتا تھا، اس کے باوجود کوئی شکایت نہیں تھی، اور اپنی اس حالت پر کوئی افسوس نہیں تھا۔ ہمارے یہاں تو صورت حال یہ ہوتی ہے کہ اگر ایک آدھ وقت خدانخواستہ کھانا نہ ملے تو معلوم نہیں کیسی کیسی باتیں ہم زبان پر لے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی شکایتیں ہونے لگتی ہیں، کفریہ کلمات آدمی زبان سے نکالنے لگ جاتے ہیں۔ درحقیقت یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضراتِ صحابہ کی زندگی سے ہمیں سبق لینا چاہیے کہ ان کے ساتھ یہ معاملہ کوئی ایک آدھ دن کے واسطے نہیں تھا، بلکہ ان کی پوری زندگیاں اسی طرح گزری ہیں، حالاں کہ دنیوی نعمتوں کے بھی وہ ہم سے زیادہ حقدار تھے، لیکن انہوں نے اسی حالت کو اپنے لیے پسند کیا۔ پہلے بھی آچکا کہ تین تین چاند اس حالت میں طلوع ہوتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا، لیکن کسی کے متعلق کسی جگہ آپ کو یہ بات نہیں ملے گی کہ شکایت کا کوئی کلمہ ان کی

زبان سے نکلا ہو۔ بلکہ اس حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری بجالاتے تھے۔ اور ہم تو یوں سمجھتے ہیں کہ فقر وفاقہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی وجہ سے آتا ہے، اور زیادہ پیسے ملیں اور اچھی حالت ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی علامت ہے۔ یہ سب علامتیں ہم نے اپنے طور پر مقرر کر رکھی ہیں، جو بالکل درست نہیں، بلکہ احادیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا اسے بھی دیتے ہیں جس سے ناراض ہوں اور اس کو بھی دیتے ہیں جس سے راضی ہوں۔ مؤمن کو بھی دیتے ہیں، کافر کو بھی دیتے ہیں۔ بلکہ قرآنِ کریم میں سورۂ زخرف میں ہے جس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کمزور قسم کے مؤمنوں کے ایمان سے بچل جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو کافروں کو اللہ تعالیٰ اتنا دیتے کہ ان کے گھروں کی چھتیں، سیڑھیاں، دروازے اور ان کی مسہریاں اور پلنگ بھی سونے چاندی کے ہوتے، لیکن اگر ایسا ہوتا تو بہت سے کمزور مسلمان یوں سمجھتے کہ چلو بھائی! پاٹلی (فرقہ) بدل دو، وہیں اچھا ہے۔ یعنی ہمارے ایمان کی حفاظت کا لحاظ کرتے ہوئے ان کافروں کو اتنا کم دیا گیا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ ان کو اور زیادہ دیتے۔

برکت کا ایک قصہ

۵۲۱-وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ أَبُوطَلْحَةَ لِأُمِّ سُلَيْمٍ: قَدْ سَمِعْتُ صَوْتَ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضَعِيْفاً أَعْرِفُ فِيْهِ الْجُوْعَ. فَهَلْ عِنْدَكِ مِنْ شَيْئٍ. فَقَالَتْ: نَعَمْ. فَأَخْرَجَتْ أَقْرَاصاً مِنْ شَعِيْرٍ، ثُمَّ أَخَذَتْ خِمَاراً لَهَا، فَلَفَّتِ الْخُبْزَ بِبَعْضِهٖ، ثُمَّ دَسَّتْهُ تَحْتَ ثَوْبِيْ وَرَدَّتْنِيْ بِبَعْضِهٖ ثُمَّ أَرْسَلَتْنِيْ إِلٰى رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فَذَهَبْتُ بِهٖ، فَوَجَدْتُ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جَالِساً فِي الْمَسْجِدِ، وَمَعَهُ النَّاسُ، فَقُمْتُ عَلَيْهِمْ، فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: أَرْسَلَكَ أَبُوْطَلْحَةَ؟ فَقُلْتُ: نَعَمْ فَقَالَ: أَلِطعامٍ؟

فَقُلْتُ: نَعَمْ ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: قُوْمُوْا. فَانْطَلَقُوْا وَانْطَلَقْتُ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ حَتّٰى جِئْتُ أَبَاطَلْحَةَ فَأَخْبَرْتُهُ، فقَالَ أَبُوْ طَلْحَةَ: يَاأُمَّ سُلَيْمٍ! قَدْجَاءَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بِالنَّاسِ وَلَيْسَ عِنْدَنَا مَا نُطْعِمُهُمْ ؟ فَقَالَت: أللهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ. فَانْطَلَقَ أَبُو طَلْحَةَ حَتّٰى لَقِيَ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ فَأَقْبَلَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَعَهُ حَتّٰى دَخَلاَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: هَلُمِّي مَا عِنْدَكِ يَا أُمَّ سُلَيْمٍ. فَأَتَتْ بِذٰلِكَ الْخُبْزِ، فَأَمَرَ بِهِ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فَفُتَّ، وَعَصَرَتْ أُمُّ سُلَيْمٍ عُكَّةً فَأَدَمَتْهُ، ثُمَّ قَالَ فِيْهِ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ يَقُوْلَ، ثُمَّ قَالَ: (ائْذَنْ لِعَشْرَةٍ) فَأَذِنَ لَهُمْ فَأَكَلُوْا حَتّٰى شَبِعُوْا ثُمَّ خَرَجُوْا، ثُمَّ قَالَ: (ائْذَنْ لِعَشْرَةٍ) فأَذِنَ لَهُمْ حَتّٰى أَكَلَ الْقَوْمُ كُلُّهُمْ وَشَبِعُوْا وَالْقَوْمُ سَبْعُوْنَ رَجُلاً أَوْ ثَمَانُوْنَ.

وفي رواية: فَمَا زَالَ يَدْخُلُ عَشْرَةٌ، وَيَخْرُجُ عَشْرَةٌ حَتّٰى لَمْ يَبْقَ مِنْهُمْ أَحَدٌ إِلاَّ دَخَلَ، فَأَكَلَ حَتّٰى شَبِعَ، ثُمَّ هَيَّأَهَا فَإِذَا هِيَ مِثْلُهَا حِيْنَ أَكَلُوْا مِنْهَا.

وفي رواية: فَأَكَلُوْا عَشْرَةً عَشْرَةً، حَتّٰى فَعَلَ ذٰلِكَ بِثَمَانِيْنَ رَجُلاً، ثُمَّ أَكَلَ النَّبِيُّ ﷺ بَعْدَ ذٰلِكَ وَأَهْلُ الْبَيْتِ، وَتَرَكُوْا سُؤْراً۔

وفي رواية: ثُمَّ أَفْضَلُوْا مَا بَلَغُوْا جِيْرَانَهُمْ۔

وفي رواية عن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: جِئْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَوْماً، فَوَجَدْتُهُ جَالِساً مَعَ أَصْحَابِهِ، وَقَدْ عَصَبَ بَطْنَهُ بِعِصَابَةٍ، فَقُلْتُ لِبَعْضِ أَصْحَابِهِ: لِمَ عَصَبَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بَطْنَهُ؟ فَقَالُوا: مِنَ الْجُوْعِ، فَذَهَبْتُ إِلٰى أَبِي طَلْحَةَ، وَهُوَ زَوْجُ أُمِّ سُلَيْمٍ بِنْتِ مِلْحَانَ۔ فَقُلْتُ: يَاأَبَتَاه! قَدْرَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ عَصَبَ بَطْنَهُ بِعِصَابَةٍ، فَسَأَلْتُ بَعْضَ أَصْحَابِهِ، فَقَالوا: مِنَ الْجُوْعِ۔ فَدَخَلَ أَبُوْ طَلْحَةَ عَلٰى أُمِّي، فَقَالَ: هَلْ مِنْ شَيْءٍ ؟ قَالَت: نَعَمْ، عِنْدِيْ كِسَرٌ مِنْ خُبْزٍ وَتَمَرَاتٌ، فَإِنْ جَاءَنَا

رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَحْدَہٗ أَشْبَعْنَاہُ، وَإِنْ جَآءَ آخَرُ مَعَہٗ قَلَّ عَنْہُمْ.... وَذَکَرَ تَمَامَ الْحَدِیْثِ۔

ترجمہ مع تشریح:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے حضرت اُمِ سلیم رضی اللہ عنہا سے کہا (یہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا؛ حضرت انسؓ کی والدہ ہیں، حضرت انسؓ کے باپ کا نام مالک تھا، ان کے انتقال کے بعد اُن کی والدہ حضرت اُمِ سلیم رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوطلحہؓ کے ساتھ نکاح کیا تھا۔ حضرت ابوطلحہؓ حضرت انسؓ کے سوتیلے والد ہیں) کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی آواز بہت کمزور پائی ہے، میرا خیال یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو فاقہ ہے، جس کا اثر آپ کی آواز میں محسوس ہوا، اس لیے کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے جسے ہم نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کرسکیں۔ انہوں نے کہا: جی ہاں۔ اس کے بعد انہوں نے جَوْ کی چند روٹیاں گھر کے کونہ میں سے نکالیں اور اپنی اوڑھنی اپنے ہاتھوں میں لی اور اس اوڑھنی کے ایک کنارہ سے وہ روٹیاں لپیٹ کر میری بغل میں دبادیں، اور اوڑھنی کا بچا ہوا باقی حصہ میرے جسم پر ڈال دیا، تاکہ وہ چھپ جائے، اور مجھے نبی کریم ﷺ کے پاس بھیجا کہ جاؤ! حضور کی خدمت میں پیش کرو (حضرت انسؓ فرماتے ہیں) میں حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچا تو دیکھا کہ نبی کریم ﷺ مسجدِ نبوی میں تشریف فرما ہیں، آپ کے ساتھ اور حضرات بھی ہیں۔ میں وہاں جا کر کھڑا ہوگیا (نبی کریم ﷺ سمجھ گئے کہ ان کو حضرت ابوطلحہؓ نے بھیجا ہے، چوں کہ تھوڑی دیر پہلے ہی حضرت ابوطلحہؓ وہاں سے اُٹھ کر گئے تھے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں) نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا: کیا ابوطلحہؓ نے تم کو بھیجا ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ اب حضور ﷺ یہ سمجھے کہ کھانے کے واسطے بلانے کے لیے بھیجا ہے، تو پوچھا: کھانا کھانے کے واسطے بلانے کے لئے؟ تو کہا: جی ہاں۔ یہاں ان کے ہاتھوں ام سلیمؓ نے روٹیاں بھیجی ہی تھیں۔ دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوطلحہؓ نے اپنے گھر آکر دیکھا کہ روٹیاں تھوڑی ہیں اور نبی کریم ﷺ

کو رفقاء کے ساتھ دعوت نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے انہوں نے مناسب سمجھا کہ آپ کی خدمت میں بھیج دیں تا کہ آپ اپنے طور پر اس کو تناول فرمائیں اور اپنی ضرورت پوری کر لیں، لیکن روٹیاں لے کر جب حضرت انس رضی اللہ عنہ پہنچے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد ہی میں تشریف فرما تھے، گھر پر تشریف نہیں لے گئے تھے۔ دوسری روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو اختیار دیا تھا کہ اگر مناسب معلوم ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گھر پر بُلوا لیں۔ لیکن جب یہاں آ کر دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو مجمع میں موجود ہیں، تو اب یہ کشمکش میں پڑ گئے کہ لوگوں کے درمیان یہ روٹیاں جو میرے ساتھ بھیجی گئی ہیں، میں آپ کی خدمت میں پیش کروں یا نہ کروں، اس لیے کہ یہ بہت کم مقدار تھی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ لوگوں کے موجودگی میں اگر اس قسم کی کوئی چیز آپ کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر آتی تھی، تو آپ تنہا تناول نہیں فرماتے تھے، بلکہ لوگوں کو بھی شریک کر لیتے تھے۔ اس لیے جب انہوں نے یہ منظر دیکھا تو وہ چکرا گئے اور کشمکش میں پڑ گئے، اور وہیں کھڑے ہو گئے۔ ان کو کھڑا ہوا دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ سمجھے کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے بلانے کے لیے ان کو بھیجا ہے، اس لیے پوچھا کہ تمہیں ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے بھیجا ہے؟ تو انہوں نے کہا: جی ہاں۔ کھانا کھانے کے واسطے بلانے کے لئے؟ تو کہا: جی ہاں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پاس بیٹھے ہوئے حضرات سے کہا: چلو۔ جو خطرہ تھا وہی بات پیش آئی کہ سب کے لیے کافی ہو جائے اتنا تو وہاں تھا نہیں۔ چناں چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تمام صحابہ بھی اُٹھے جو وہاں موجود تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جلدی جلدی گھر پہنچ گیا اور جا کر حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو اطلاع دی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اپنے تمام رفقاء کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں۔ دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بھی یہ سن کر ذرا گھبرائے کہ گھر میں تو کوئی چیز ہے نہیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لا رہے ہیں۔ اپنی اہلیہ حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہا سے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں اور ہمارے پاس ان کو کھلانے کے لئے کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ سن کر حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔

انہوں نے معلوم کرلیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتلادیا گیا ہے، اس لیے بڑے اطمینان سے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ یہ بھی ان کی سمجھ داری کی بات ہے۔ چناں چہ یہ سب بات تو گھر میں ہوئی۔ اس کے بعد ابوطلحہؓ گھر سے باہر تشریف لائے۔ کیوں کہ معلوم ہو چکا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لا رہے ہیں، تو گھر میں بیٹھے نہیں رہے، بلکہ باہر آ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استقبال کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے ساتھ تشریف لائے یہاں تک کہ یہ دونوں حضرات مکان میں داخل ہوئے۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ام سلیمؓ سے کہا: تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ لاؤ، مجھے دو۔ حضرت انسؓ پہلے ہی روٹیاں لے کر پہنچ چکے تھے انہوں نے وہ روٹیاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کیں، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان روٹیوں کو توڑو۔ پھر کہا: گھر میں اور کوئی چیز ہے؟ بتایا گیا: گھی کا صرف ایک پیالہ ہے اور وہ بھی ختم ہو رہا ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ بھی لاؤ۔

دوسری روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوطلحہؓ دونوں نے مل کر بڑی قوت سے اس کو دبا کر نچوڑا، تو اندر سے گھی کے کچھ قطرے ٹپکے۔ گویا یہی سالن ہو گیا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ پڑھا اور اس کے اندر دم فرمایا اور حضرت انسؓ سے کہا: اُٹھو، اور دس آدمیوں کو بلاؤ۔ چناں چہ دس آدمی اندر گھر میں داخل ہوئے۔ انھوں نے اسی روٹی کو جس کا چورا کیا گیا تھا اور گھی کے چند قطرے اوپر سے ٹپکائے گئے تھے اس کو کھایا، یہاں تک کہ شکم سیر ہو گئے۔ وہ لوگ باہر گئے تو پھر کہا اور دس کو بلواؤ۔ چناں چہ اور دس کو بلایا گیا۔ انھوں نے بھی کھایا، وہ بھی شکم سیر ہوئے، اور باہر نکلے۔ پھر کہا اور دس کو بلالو۔ ان کو اجازت ملی تو وہ آئے، اس طرح سب نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ وہ تمام سترّ (۷۰) یا اَسّی (۸۰) آدمی تھے۔

اس روایت کے دوسرے الفاظ کو بھی ذکر کیا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیٹ پر پٹی بندھی ہے۔ اب یہ تو بچے تھے ان کو کبھی خیال نہیں گذرا کہ ایسا کیوں کیا جاتا ہے۔ انہوں نے

لوگوں سے پوچھا: کیا بات ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے شکم مبارک کے اوپر پٹی باندھی ہے؟ لوگوں نے کہا: بھوک کی وجہ سے۔ تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے جاکر اپنے سوتیلے والد حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع دی کہ حضور ﷺ کے پیٹ مبارک پر تو بھوک کی وجہ سے پٹی بندھی ہے، میں نے لوگوں سے پوچھا کہ ایسی پٹی کیوں بندھی ہے تو لوگوں نے یہ بتلایا۔ چناں چہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور پھر یہی قصہ پیش آیا جو اوپر تفصیل سے گزرا۔

افادات: - خلاصہ یہ ہے کہ اصل زندگی تو یہی ہے لیکن ہم اللہ تعالیٰ سے اس طرح کی آزمائش نہ مانگیں، بلکہ دعا یہی مانگیں کہ ہمیں اچھی حالت میں رکھے، ہماری کمزوری کی وجہ سے ایسی نوبت نہ آئے، اور بغیر آزمائش ہی کے اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم کا معاملہ فرمائے۔ باقی ایسی زندگی کا پسندیدہ اور مطلوب ہونا اور اس کی فضیلت اور اس کی وجہ سے مراتب کا بلند ہونا؛ اپنی جگہ پر ایک اٹل حقیقت ہے۔ یہی اچھی چیز تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے لیے اور حضرات انبیاء کے بعد افضل ترین جماعت -صحابہ کرام رضی اللہ عنہم- کے لیے پسند کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق وسعادت عطا فرمائے

دعا

اے اللہ! ہمارے گناہوں کو معاف فرما، خطاؤں سے درگزر فرما۔ اے اللہ! تیرے حبیبِ پاک ﷺ اور حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی زندگیوں اور ان کے طریقۂ زندگی سے سبق لینے کی اور اسی کو محبوب اور پسندیدہ بنانے کی توہمیں توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! اپنا فضل فرما۔ اے اللہ! ہماری کمزوریوں سے درگزر فرما۔ نبی کریم ﷺ کے طریقوں اور سنتوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں اپنانے اور اختیار کرنے کی توہمیں توفیق عطا فرما۔